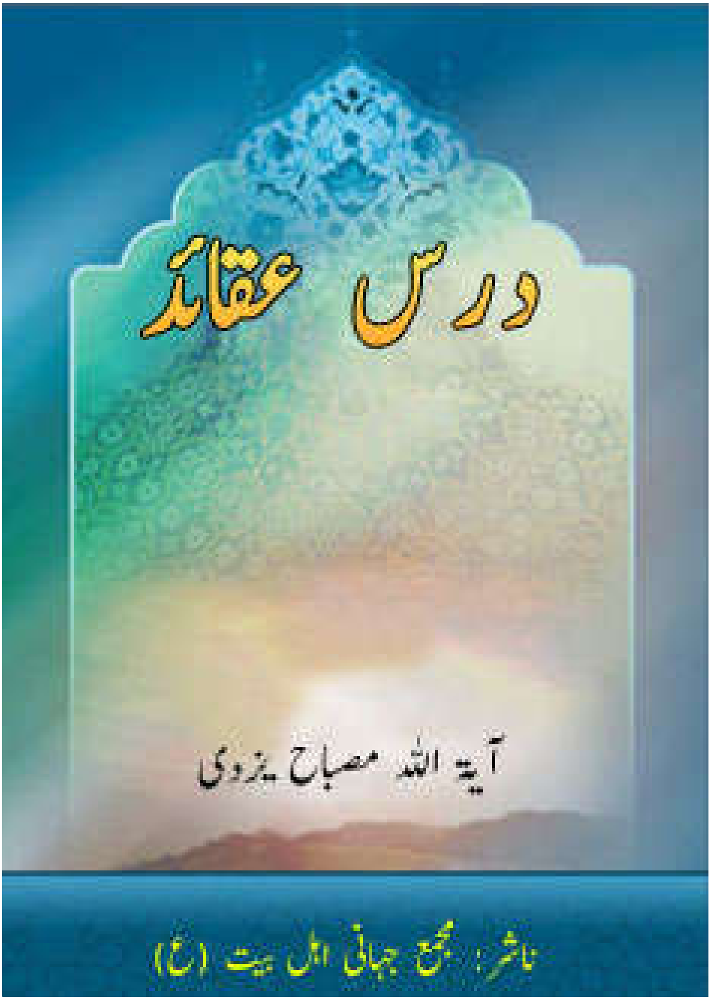

درس عقائد
آیۃ اللہ مصباح یزدی
ناشر: مجمع جہانی اہل بیت (ع)

نام کتاب: درس عقائد
مؤلف: آیۃ اللہ مصباح یزدی
مترجم: ضمیر حسین بہاولپوری
تصحیح مرغوب عالم عسکری سمند پوری
نظر ثانی: فیروز حیدر فیضی
پیشکش: معاونت فرہنگی، ادارۂ ترجمہ
ناشر: مجمع جہانی اہل بیت (ع)

قال رسول اللهﷺ : "انی تارك فيكم الثقلين، كتاب الله، وعترتی اهل بيتی ما ان تمسكتم بهما لن تضلّوا ابدا وانهما لن يفترقا حتّیٰ يردا علیّ الحوض"۔

حضرت رسول اکرم نے فرمایا: میں تمہارے درمیان دوگرانقدر چیزیں چھوڑے جا تا ہوں: (ایک) کتاب خدااور (دوسری) میری عترت اہل بیت (علیہم السلام)، اگرتم انھیں اختیار کئے رہوتوکبھی گمراہ نہ ہوگے، یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں ۔

(صحیح مسلم: ۱۲۲۷، سنن دارمی: ۴۳۲۲، مسند احمد: ج۳، ۱۴، ۱۷، ۲۶، ۵۹. ۳۶۶۴ و ۱۸۲۵. ۳۷۱، اور ۱۸۹، مستدرک حاکم: ۱۰۹۳، ۱۴۸، ۵۳۳. وغیرہ.)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت وظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچہ وکلیاں رنگ ونکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ وراہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت وقابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ وموسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفی غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم وآگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمۂ حق وحقیقت سے سیراب کردیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمراں ایران و روم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑگئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت وعمل سے عاری ہوں

اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہبِ عقل و آگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھو دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کرلیا۔

اگر چہ رسول اسلام کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیروؤں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور نا قدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہو کر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کردئی گئی تھی، پھر بھی حکومت وسیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء و دانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکار و نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگین تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشتپناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکری و معنوی قوت واقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامراں زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین و بے تاب ہیں، یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل و شعور

کو جذب کرنے والے افکار ونظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیت کونسل) مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیت عصمت وطہارت کے پیرووں کے درمیان ہم فکری ویکجہتی کوفروغ دیناوقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجودہ دنیائے بشریت جوقرآن وعترت کے صاف وشفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق ومعنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان وولایت سے سیراب ہوسکے، ہمیں یقین ہے عقل وخرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیت عصمت وطہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت وبیداری کے علمبردار خاندان نبوت ﷺ ورسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدوخال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق وانسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خوں خواروں کی نام نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کوامن ونجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی وتحقیقی کوششوں کے لئے محققین ومصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین ومترجمین کا ادنیٰ خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج واشاعت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، آیت اللہ مصباح یزدی کی گرانقدر کتاب درس عقائد کو مولانا ضمیر حسین نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس

کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں ،اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے،خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنیٰ جہاد رضائے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت،مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

تمام حمد وثنا اس خدا کے لئے ہے جس نے اس عالم ہستی کو وجود بخشا، اور انسانوں کی ہدایت کے لئے پے در پے انبیاء کو مبعوث فرمایا، تاکہ انسانوں کے مختار ہوتے ہوئے اُنہیں انتہائی کمال تک پہنچا دیں تاکہ اُن کا شمار اشرف المخلوقات میں ہو جائے، انسان کے انتہائی کمال تک پہنچنے میں صحیح عقائد کا بہت بڑا عمل ودخل ہے جب تک انسان کے عقائد صحیح نہ ہوں، اُس وقت تک انتہائی کمال تک پہنچنا ناممکن ہے اور اسلام کے دشمن ہمیشہ اس بات پر اپنی پوری توانائیاں صرف کرتے چلے آرہے ہیں تاکہ مسلمانوں میں فاسد عقائد رائج کر کے اُن کے درمیان پھوٹ ڈال دیں اور انہیں صراط المستقیم سے منحرف کر کے رہ گمراہی پر لگا دیں۔

افسوس کا مقام ہے بڑے بڑے دانشمند بھی فاسد عقائد کے سیلاب میں بہتے ہوئے نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ بعض تو خدا اور اس کے مبعوث کئے ہوئے رسولوں کے متعلق شک وتردید میں پڑ کر افرط وتفریط کا شکار ہو گئے، بعض کو خدا کا بیٹا اور بعض کو بالکل اپنے جیسا بلکہ اس سے

بھی بدتر، بعض پیغمبروں کی طرف گناہان کبیرہ کی نسبت دے کر اُن کے قتل پر آمادہ ہو گئے تا کہ اپنے باطل عقائد اور خود ساختہ خداؤں کا دفاع کرسکیں اور اپنے باطل عقائد کا علم ہوتے ہوئے بھی اس پر ڈٹے رہے چونکہ اگر وہ پیغمبر برحق کو تسلیم کر لیتے تو اُن کی شہرت، سلطنت و ریاست خطرے میں پڑ جاتی۔

لہذا انہوں نے دنیا کی لالچ میں آ کر اپنی آخرت کو تباہ و برباد کر کے ہمیشہ اپنے لئے جہنم کے دردناک عذاب کو خرید لیا اور دنیا کی چند روزہ فانی زندگی کو آخرت کی ابدی زندگی پر ترجیح دے دی

زیر نظر کتاب اُن صحیح عقائد پر مشتمل ہے جو ہادیان برحق کی زبانوں سے بیان ہوئے ہیں جن پر عمل کر کے انسان دنیا و آخرت کی سعادتیں حاصل کرسکتا ہے۔

اس کتاب کے مؤلف حضرت آیت اللہ مصباح یزدی دامت برکاتہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، آپ کا شمار عصر حاضر کے بزرگترین دانشمندوں میں ہوتا ہے، علم منطق، فلسفہ وکلام، میں آپ کا چرچا ہر عام وخاص پر عیاں ہے۔

میں نے اُن کی اس کتاب کو اردو داں حضرات کے لئے مناسب سمجھ کر اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، تا کہ صحیح عقائد کے متلاشی حضرات اِن پر عمل کرتے ہوئے دنیا و آخرت کی سعادتیں حاصل کرسکیں۔

اگر چہ اس کتاب میں علمی اصطلاحات زیادہ استعمال ہوئیں ہیں تاہم میں نے اُن کو آسان لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ تمام قارئین حضرات بصورت احسن مستفیض ہوسکیں۔

آخر میں قارئین گرامی سے گزارش ہے کہ جہاں کہیں غلطی کا شائبہ ملاحظہ فرمائیں تو بطور اصلاح ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اڈیشن میں اصلاح ہو سکے۔

آپ کی دعاؤں کا طالب
ضمیر حسین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ مولف

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خیر خلقہ محمد و آلہ الطاھرین لاسیما بقیۃ اللہ فی الارضین عجل اللہ تعالیٰ فرجہ و جعلنا من اعوانہ و انصارہ.

بنیادی عقائد وافکار ہر باارزش اوراجتماعی وسیاسی نظام کی بنیاد پر ہوتے ہیں، یہ عقائد انسانی کردار و اخلاق کوسنوارنے میں، سو فیصد یا اس سے کمتر اثر انداز ہوتے ہیں، اسی وجہ سے اسلام کے باارزش نظام کی بنیادوں کومستحکم کرنے کے لئے اس درخت کے ریشوں یعنی نظام عقیدتی کو دلوں میں استوار کرنا ہوگا، تا کہ ہمیشہ مثبت نتائج حاصل ہوسکیں، اور دو جہاں کی کامیابی نصیب ہو سکے۔

اسی وجہ سے اسلامی مفکرین نے آغاز اسلام سے اسلامی عقائد کومختلف اسلوب اورشکل و صورت میں بیان کیا اورمنجملہ علماء کلام نے اس سلسلہ میں مختلف کتابیں لکھیں، اس دور میں بھی نئے شکوک وشبہات کے پیدا ہونے کی وجہ سے مختلف کتابیں معرض وجود میں آئیں، لیکن غالباً یہ کتابیں دومختلف اورمتفاوت سطح پر لکھیں گئیں ہیں، ان کتابوں کی ایک قسم نہایت سادہ اور زیادہ سے زیادہ توضیحات پر مشتمل ہے اور دوسری قسم پیچیدہ اصطلاحات، سخت

بیانات اور سنگین عبارتوں پر مشتمل ہے، لیکن اس کے درمیان ایسی کتابیں جو متوسط درجہ کی اور قابل تدریس ہوں، نہیں ہیں اسی وجہ سے دینی مدارس میں برسوں سے ایسی کتابوں کی کمی کا احساس کیا جاتا رہا ہے۔

اسی وجہ سے سازمان تبلیغات اسلامی کے ذمہ دار افراد اور ادارۂ در راہ حق کے فضلا اور علما کی مدد سے اس کتاب کو مرتب کیا گیا ہے، جسکی چند خصوصیات درج ذیل ہیں۔

۱۔اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مطالب منطقی ترتیب پر منظم ہوں اور تا حد امکان مسائل کو بیان کرنے کے دوران آئندہ کے حوالہ جات سے پرہیز کیا جائے۔

۲۔عبارتوں کو آسان اور سادہ کرنے کے لئے نہایت کوشش کی گئی ہے، پیچیدہ اصطلاحات اور دشوار عبارتوں سے پوری طرح پرہیز کیا گیا ہے لہٰذا مطلب کو واضح کرنے کے لئے ادبی عبارتوں کو ترک کر دیا گیا ہے۔

۳۔مطالب کو ثابت کرنے کے لئے روشن دلائل اور محکم تعابیر کا استعمال کیا گیا ہے متعدد اور سست دلائل سے پرہیز کیا گیا ہے۔

٤۔مطالب کی توضیح میں زائد وضاحت کو پڑھنے والوں کی طبیعت کے خستہ حال نہ ہونے کا خاص خیال رکھا گیا ہے

٥۔چونکہ یہ کتاب متوسط سطح کے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے لہٰذا ایسے عمیق استدلالات کہ جسے سمجھنے کے لئے فلسفہ، تفسیر یا فقہ الحدیث جیسے علوم سے آشنائی کی ضرورت ہے پرہیز کیا گیا ہے لیکن جہاں کہیں ایسے استدلالات کی ضرورت پڑی وہاں صرف اختصار کے ساتھ

سادے لفظوں میں وضاحت کر دی گئی ہے اور کامل استدلال کے لئے فقط دوسری کتابوں کے حوالے پر اکتفا کیا گیا ہے تا کہ پڑھنے والوں میں جستجو و تحقیق کی امنگ جاگتی رہے۔

٦۔اس کتاب کے مطالب کو دروس کی شکل میں تقسیم اور متوسط تنہا ایک جلسہ (درس) کے برابر ذکر کیا گیا ہے۔

٧۔بعض دروس کے مہم مطالب کی دوسرے دروس میں کیداً تکرار کی گئی ہے تا کہ پڑھنے والے اچھی طرح سمجھ سکیں۔

٨۔ ہر درس کے آخر میں اسی درس سے مربوط سوالات درج کئے گئے ہیں جو درس کی تفہیم اور اسے پوری طرح سمجھنے میں نہایت مفید و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

٩۔لیکن جو بات مسلم ہے وہ یہ کہ مذکورہ کتاب بھی ضعف سے خالی نہیں ہوگی لہٰذا امید ہے کہ اساتذہ محترم اپنی تنقیدات کے ذریعہ ہماری مدد کریں تا کہ آئندہ طبع میں اس کا خیال رکھا جا سکے،اس کے ساتھ ساتھ حضرت ولی عصر ارواحنالہ الفداء کی بارگاہ میں یہ درخواست ہے کہ حقیر کی اس ناچیز خدمت کو شرف قبولیت عطاء ہو اور اس طرح سے حوزۂ علمیہ اور شہداء والا مقام کے حقوق میں سے ایک حق ادا ہو جائے۔

قم محمد تقی مصباح یزدی۔

درس عقائد

پہلا درس

دین کیا ہے؟

۱۔ دین کا مفہوم

۲۔ اصول دین اور فروع دین۔

۳۔ جہاں بینی اور آئیڈیالوجی۔

٤۔ الٰہی و مادی جہاں بینی۔

٥۔ آسمانی ادیان اور ان کے اصول۔

۱۔دین کا مفہوم

اس کتاب کا ہدف عقائد اسلامی کا بیان کرنا ہے جسے اصول دین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، لٰہذا کسی بھی وضاحت سے پہلے مناسب یہ ہے کہ کلمہ دین اور اس سے مشابہ الفاظ کی ایک وضاحت کر دی جائے، اس لئے کہ علم منطق میں مبادی تصوری (تعریفات) کا مقام تمام مطالب پر مقدم ہے۔

دین ایک عربی کلمہ ہے جس کے معنی لغت میں اطاعت اور جزا کے ہیں اور اصطلاح میں اس

جہان، انسان کے پیدا کرنے والے پر عقیدہ رکھنا اور ان عقائد سے متناسب دستورات عملی پر اعتقاد رکھنے کے معنی میں ہے، اسی وجہ سے وہ لوگ جو اس جہان کے خالق پر مطلق اعتقاد نہیں رکھتے اور اس جہان کی خلقت کو اتفاقی حادثہ یا مادی وطبیعی فعل وانفعالات کا نتیجہ سمجھتے ہیں انہیں بے دین کہا جاتا ہے، لیکن وہ لوگ جو اس جہان کے خالق پر اعتقاد رکھتے ہیں، مگر اپنے اعمال وکردار میں انحراف وکج روی کے شکار ہیں انھیں بادین کہا جاتا ہے، اس طرح روئے زمین پر موجودہ ادیان حق وباطل میں تقسیم کئے جاتے ہیں، لہٰذا دین حق یعنی ایسے قوانین کا مجموعہ جو صحیح عقائد پر مشتمل اور واقعیت کے مطابق ہوں نیز ایسے اعمال کا حکم دے کہ جن کی صحت میں کافی ضمانت پائی جاتی ہو۔

۲۔اصول دین اور فروع دین

گذشتہ مفہوم دین کی توضیحات کے پیش نظر یہ بات روشن ہوگئی کہ کوئی بھی دین ہو دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔

۱۔عقائد: جو پایہ واساس کے حکم میں ہیں۔

۲۔قوانین عملی: جو انھیں اساس کے مطابق اور انھیں کے ذریعہ وجود میں آئے ہوں۔

لہٰذا یہ بات پوری طرح روشن ہے کہ کسی بھی دین میں اس کے عقائد کو اصول اور احکام عملی کو (فروع) کا نام دیا جاتا ہے جیسا کہ اسلامی دانشمندوں نے ان دو اصطلاحوں کو عقائد اور احکام اسلامی کے لئے استعمال کیا ہے۔

۳۔جہاں بینی (تصور خلقت) اور آئیڈیالوجی۔

جہاں بینی اور آ ئیڈ یالو جی کی اصطلاح کم وبیش ایک ہی معنی میں استعمال ہوتی ہے، جہاں بینی کے معنی یہ ہیں (جہان وانسان کے مطابق چند اعتقادات اور بطور کلی ہستی) اور آ ئیڈ یالو جی کے معنی یہ ہیں (انسانی کردار سے مطابق چند کلی نظریات اور آرا)۔

ان دونوں معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے، کسی بھی عقیدتی اور اصولی نظام کو اس دین کی جہان بینی اور اس کے احکام عملی کے نظام کو آ ئیڈ یالوژی کا نام اور انھیں دین کے اصول وفروع پر تطبیق دی جاتی ہے، لین یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ آئیڈ یالو جی کی اصطلاح احکام جزئی کو شامل نہیں ہوتی جس طرح کہ جہان بینی کی اصطلاح بھی جزئی اعتقادات کے لئے استعمال نہیں ہوتی۔

ایک دوسرا نکتہ کہ جس کی طرف توجہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کلمہ آ ئیڈ یالو جی عام معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کہ جو جہان بینی کو بھی شامل ہوتا ہے۔(۱)

....

(۱) جہان بینی اور آئیڈ یا لوجی کے سلسلہ میں زیادہ معلومات کے لئے رجوع کیا جائے ،کتاب کا نام آ ئیڈ یالو جی تطبیقی، درس اول۔

٤۔الٰہی و مادی جہان بینی۔

انسانوں کے درمیان جہان بینی کی مختلف قسمیں پائی جاتی ہیں لیکن ان سب کو ماوراء طبیعت

کے قبول یا اسے انکار کرنے کی بنیاد پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، الٰہی جہان بینی، اور مادی جہان بینی۔گذشتہ ادوار میں مادی جہان بینی کے پیروکاروں کو کبھی ؔؔؔ طبیعی اور دہریہ،، اور کبھی ؔؔؔ زندیق اور ملحد،، کے نام سے یاد کیا جاتا تھا،لیکن انھیں ہمارے زمانہ میں مادی اور ماٹریالیٹ کہا جاتا ہے، مادی گری کی بھی مختلف شاخیں ہیں،جس میں سے مشہور ترین (مٹریلزم ڈیالٹیک) ہے کہ جو (مارکسیزم) کا ایک حصہ ہے۔

اس ضمن میں یہ بھی روشن ہوگیا کہ جہان بینی کا استعمال دینی عقائد سے بھی زیادہ وسیع ہے اس لئے کہ یہ الحادی عقائد کو بھی شامل ہے جیسا کہ آئیڈیالوجی کی اصطلاح بھی دینی مجموعہ احکام سے مخصوص نہیں ہے۔

۵۔آسمانی ادیان اور ان کے اصول۔

تاریخ ادیان، جامعہ شناسی اور عوام شناسی کے دانشمندوں کے درمیان پیدائشِ ادیان کی کیفیت کے سلسلہ میں اختلاف ہے،لیکن اسلامی اسناد کے ذریعہ جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ دین کا وجود انسان کی پیدائش کے ساتھ ہوا اور پہلے انسان (حضرت آدم ؔ ابوالبشر) خدا کے رسول،توحید و یکتا پرستی کے منادی تھے،اور بقیہ شرک آلود ادیان تحریفات،سلیقوں کے اختلاف،فردی اور گروہی اغراض کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں۔(۱)

....

(۱)بعض آسمانی ادیان میں جباروں اور ستمگروں کی رضایت حاصل کرنے کے لئے بعض

تحریفات کچھ اس طرح ہیں کہ، دین کے دائرے کو خدا کے ساتھ انسان کے رابطہ میں محدود اور احکام دین کو خاص مذہبی مراسم سے مخصوص، سماج کی سیاست اور اس کے امور کو دائرہ دین سے خارج کر دیا گیا ہے جبکہ ہر دین آسمانی معاشرہ کی تمام ضرورتوں کو برطرف کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے

تا کہ دنیوی واخروی سعادت حاصل ہو سکے جنھیں سمجھنے کے لئے عام انسانوں کی عقلیں نا کافی ہیں، اس مطلب کی توضیح انشاء اللہ آئندہ آئے گی، اور خدا کی جانب سے مبعوث ہونے والے آخری پیغمبر پر واجب ہے کہ وہ قیامت تک کے وہ تمام دستورات جو انسانوں کے لئے ضروری ہیں، بیان کریں، اس وجہ سے اسلامی تعلیمات میں اجتماعی و سیاسی اور اقتصادی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ موجود ہے۔

ادیان توحیدی ہی ادیان آسمانی ہیں، جو تین کلی اصول میں مشترک ہیں۔

۱۔خدائے یکتا پر اعتقاد۔

۲۔عالم آخرت میں ہر انسان کے لئے ابدی حیات، اور جو کچھ اس جہان میں انجام دیا گیا ہے اس کی جزا یا سزا کا پانا۔

۳۔بعثت انبیاء پر اعتقاد رکھنا تا کہ بشر کو انتہائی کمال اور سعادت دنیوی و اخروی کی طرف ہدایت مل سکے یہ تینوں اصول دراصل ان سوالوں کے جواب میں جو ہر ایک آگاہ انسان کے

لئے پیش آئے ہیں، ہستی کا مبدا اور آغاز کیا ہے؟ زندگی کا خاتمہ کیا ہے؟ کس روش کے ذریعہ اچھی زندگی گذارنے کا طریقہ حاصل کیا جاسکتا ہے، وحی کے ذریعہ جو دستورالعمل پیش کیا جاتا ہے وہ وہی دینی آئیڈیالوجی ہے جو الٰہی جہان بینی کا نتیجہ ہے۔

اصلی عقائد لازم وملزوم اور توابع وتفاصیل سے متصف ہیں جو دینی عقیدتی نظام کو تشکیل دیتے ہیں انھیں اعتقادات میں اختلاف مختلف مذاہب اور فرقوں کی پیدائش کا سبب واقع ہوئے ہیں جیسا کہ بعض انبیاء کی نبوت اور آسمانی کتاب کے تعین میں اختلاف، ادیان یہودی، مسیحی اور اسلام کے درمیان تفرقہ کا باعث بنا اور اسی اختلاف کی وجہ سے عقائد واعمال میں ایسے اختلافات اٹھے کہ جو کسی طرح بنیادی اعتقاد سے ھماٰنگی نہیں رکھتے جیسے، عقیدۂ تثلیث جو توحید کے بالکل ضد ہے، اگر چہ مسیحیوں نے اس کی توجیہ کرنے کی پوری کوشش کرڈالی ہے، یا پھر تعین جانشینی پیغمبر کا مسئلہ کہ اسے خدا انتخاب کرے یا عوام الناس جو شیعہ اور سنی گروہوں میں شدید اختلاف کا باعث ہوا۔

نتیجہ:

توحید ونبوت اور معاد کو تمام آسمانی ادیان میں اساسی عقائد میں سے شمار کیا گیا ہے، لیکن وہ عقائد جو اساسی عقائد کے تجربہ وتحلیل کے ذریعہ حاصل ہوئے ہیں، یا انھیں کا ایک حصہ ہیں، ایک خاص اصطلاح کے مطابق انھیں اصلی عقائد میں شمار کیا جاسکتا ہے، جیسے وجود خدا کے اعتقاد کو ایک اصل اور اس کی وحدت کے اعتقاد کو ایک دوسری اصل مان لیا جائے، یا رسول

اللہ کی نبوت پر اعتقاد اصول دین کا ایک حصہ ہے، جیسا کہ شیعہ دانشمندوں نے عدل جو ایک فرعی مسئلہ ہے اسے اصول کا جز قرار دیا ہے یا امامت جو نبوت کی تابع ہے ایک دوسری اصل کے عنوان سے ذکر کیا ہے، درحقیقت کلمہ اصل کا استعمال ایسے اعتقادات کے سلسلہ میں اصطلاح کے تابع ہے اور یہ کسی بھی قسم کے مناقشہ اور بحث کا مقام نہیں ہے۔

اسی وجہ سے کلمہ اصول دین کو دو معنی عام و خاص میں استعمال کیا جاسکتا ہے، اس کی عام اصطلاح فروع دین اور بعض احکام کے مقابلہ میں بولی جاتی ہے، اور اس کی خاص اصطلاح بنیادی ترین عقائد سے مخصوص ہے، اسی طرح آسمانی ادیان کے درمیان مشترک عقائد جیسے اصول سہ گانہ (توحید، نبوت اور معاد) بطور مطلق (اصول دین) اور ان کے علاوہ چند اصل کے اضافہ کے ساتھ (اصول دین خاص) یا پھر ایک چند وہ اعتقادات جو کسی مذہب یا فرقہ کی پہچان ہیں، اضافہ کر کے (اصول دین و مذاہب) یا (ایک مذہب کے اصول عقائد) کا حصہ شمار کئے جاسکتے ہیں۔

سوالات:

١۔ دین کے لغوی اور اصطلاحی مفاھیم کو بیان کریں؟

٢۔ جہان بینی اور آئیڈیالوجی کی تعریف کے علاوہ ان دونوں کے فرق کو واضح کریں؟

٣۔ جہان بینی کی دوکلی کی وضاحت کریں؟

٤۔ اصول دین کی دو عام وخاص اصطلاحیں ہیں اس کی وضاحت کریں؟

٥۔ آسمانی ادیان میں مشترک اصول کیا ہیں، اور ان کی اہمیت کی وجہ کیا ہے؟

دوسرا درس

دین میں تحقیق

تحقیق کے عوامل

دین میں تحقیق کی اہمیت

ایک شبہ کا حل

تحقیق کے عوامل

انسان کی نفسانی (روحانی ومعنوی) خصوصیات میں سے ایک خاصیت حقائق اور واقعیات کا پتہ لگانا ہے جو ہر انسان میں آغاز ولادت سے پایا جاتا ہے، اور عمر کی آخری سانسوں تک یہ غریزۂ فطری باقی رہتا ہے، یہی حقیقت جوئی کی فطرت جسے حس کنجکاوی بھی کہا جاتا ہے انسان کو دین کے دائرے میں موجودہ مسائل کے سلسلہ میں تحقیق وجستجو اور دین حق کی شناخت کے لئے آمادہ کرتی ہے، جیسے: کیا غیر مادی اور غیر محسوس شیء (غیب) کا وجود ہے؟ اور اگر ایسا کچھ ہے تو پھر کیا جہان مادی ومحسوس اور جہان غیب میں کوئی ربط ہے؟ اور اگر ان دونوں میں ربط ہے تو پھر کیا کوئی نامحسوس موجود ہے جو اس جہان مادی کا خالق ہو؟

کیا انسان کا وجود اسی مادی بدن میں منحصر ہے؟ اور اس کی حیات صرف اسی دنیا سے مخصوص

ہے یا اس دنیوی دزندگی کے علاوہ کوئی اور زندگی ہے؟ اور اگر انسان کے لئے ایک دوسری زندگی آخرت ہے تو کیا اس دنیاوی زندگی اور اس آخرت میں کوئی ربط ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی ربط ہے تو پھر

امور دنیوی میں کون سے امور آخرت کی زندگی میں مؤثر ہیں؟ اور کون سا راستہ زندگی کو صحیح گذارنے کے طور طریقہ کی پہچان کے لئے ہے؟ ایسا طور طریقہ جو دنیا و آخرت میں انسان کی سعادت کی ضمانت دے؟ اور وہ طور طریقہ کیا ہے؟

پس حقیقت جوئی کی فطرت وہ اولین عامل ہے جو انسان کو مسائل کی جستجو منجملہ دینی مسائل اور دین حق کو پہچاننے کے لئے ابھارتی ہے۔

حقیقت کی شناخت کے لئے انسانی فطرت میں جو عوامل جوش و ولولہ کا سبب بنتے ہیں ان میں سے ایک ان تمام آرزؤں کو حاصل کرنا ہے جو ایک یا چند فطرتوں (حقائق کی شناخت کے علاوہ) سے متعلق اور کسی خاص معلومات پر منحصر ہیں، جیسے کہ مختلف دنیوی نعمتوں سے بہرہ مند ہونا، علمی کوششوں کا نتیجہ ہے اور علوم تجربی کی کامیابیاں انسانوں کے لئے اپنی آرزؤں کے حصول میں نہایت مددگار رہیں، اسی طرح اگر دین، انسان کے منافع و مصالح اور اس کی آرزؤں کو پورا کردے، اور برے کاموں سے اسے روک دے تو یہ امر اس کے لئے نہایت مطلوب ہوگا، لہذا منفعت طلبی کی حس اور نقصان سے بچنے کی فطرت، دین میں اور زیادہ تحقیق و جستجو کی امنگ کو افزائش دینے کا سبب ہے۔

لیکن معلومات میں وسعت پیدا کرنے کے لئے اور تمام حقائق کو درک کرنے کے لئے کافی و

سائل کا ہونا ضروری ہے، یہ ممکن ہے کہ انسان تحقیق کے لئے ایسے مسائل کا انتخاب کرے کہ جنھیں حل کرنا آسان سہل الوصول اور محسوس ہو لیکن دینی مسائل کی جستجو سے صرف اس بنا پر پرہیز کرتا رہے کہ ان کا حل کرنا مشکل اور کسی اہم علمی نتائج تک پہچنا ممکن نہیں ہے، اس وجہ سے یہ امر ضروری ہے کہ لوگوں کے لئے یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ دینی مسائل کافی اہمیت کے حامل ہیں اور ان مسائل میں تحقیق و جستجو بقیہ مسائل کی جستجو سے کاملاً متفاوت ہے۔

بعض ماہرین نفسیات کا عقیدہ ہے کہ اساساً خدا پرستی ایک مستقل آرزو ہے، جس کے سرچشمہ کو حس دینی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اسے حس جستجو، حسن نیکی اور حسن زیبائی (خوبصورتی) میں انسانی روح کے لئے چوتھا پہلو شمار کیا جاتا ہے۔

ان لوگوں نے تاریخی شواہد کی رو سے یہ امر ثابت کیا ہے کہ خدا پرستی کی حس ہر زمانہ میں مختلف شکلوں میں رہی ہے لہذا اس حس کا ہمیشگی اور اس طرح وسیع ہونا اس کے فطری ہونے کی دلیل ہے۔

البتہ اس فطرت کے عمومی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ تمام انسانوں میں زندہ و بیدار بھی ہو اور اسے مطلوب کی جانب برانگخیتہ کرنے میں مدد بھی کرے، بلکہ صحیح تربیت کے نہ ہونے اور فاسد معاشرہ کے پائے جانے کی وجہ سے اس کی دوستی بہت ضعیف پڑ گئی ہو یا اسے اپنی صحیح مسیر پر حرکت کرنے سے منحرف کر دے، جیسا کہ بقیہ تمام فطرتوں میں ضعف اور انحراف کا امکان ہے۔

اس نظریہ کے تحت دین میں تحقیق و جستجو ایک مشتعل فطرت ہے، دلائل اور برہان کے ذریعہ

اسے ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس مطلب کو آیات وروایات کے ذریعہ مورد تائید قرار دیا جاسکتا ہے کہ جو دین کے فطری ہونے پر دلالت کرتی ہیں، لیکن چونکہ اس میل فطری کی تاثیر آشکار نہیں ہے لہٰذا کوئی بحث ومباحثہ کے دوران اپنے موقف کی تائید میں اس کے وجود کا منکر ہوسکتا ہے اسی وجہ سے ہم تنہا اسی بیان پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ عقلی دلائل کے ذریعہ اس حقیقت کو ثابت کریں گے۔

دین میں تحقیق۔

یہ حقیقت روشن ہوچکی ہے کہ ایک طرف حقائق کی شناخت کا فطری رجحان اور دوسری طرف حصول منفعت ومصلحت اور خطرات سے بچنے کی فطری خواہش ایک ایسا طاقتور عامل ہے جو تفکر وتحقیق اور علوم کی تحصیل میں نہایت مددگار ہے، یہی وجہ ہے جب کسی شخص کو اس بات کا احساس ہوجاتا ہے کہ طول تاریخ میں بعض انسانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ ہم پروردگار کی طرف سے انسانوں کو دوجہان کی سعادت تک پہنچانے کے لئے مبعوث ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے پیغامات کے ابلاغ اور انسانوں کی ہدایت کے لئے کسی بھی قسم کی زحمت اٹھانے سے دریغ نہیں کیا، اور تمام سختیوں کو اپنے لئے خریدا حتی کہ اپنی جانوں کو بھی اس ہدف کے تحت قربان کردیا، تو اس کے اندر دین میں تحقیق وجستجو کی ایک عجیب سی امنگ پیدا ہوتی ہے، اور وہ یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ کیا ان لوگوں نے جو
دعویٰ کیا تھا کیا ان کا یہ دعوی درست اور منطقی دلائل کی رو سے صحیح تھا یا نہیں، خصوصاً یہ جزبہ

بیداری اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے حیات جاودانی اور نعمت وسعادت کی بشارت دی ہے، عذاب دائمی اور ابدی شقاوت سے ڈرایا ہے، یعنی ان کی دعوت کو قبول کر لینا فراوان نعمتوں کے حصول کا موجب اور اس سے انکار کرنا دائمی خسران کا سبب ہے، ان سب حقائق کے جاننے کے بعد کون شخص دین سے غفلت کے لئے عذر پیش کرسکتا ہے اور دین کے سلسلہ میں تحقیق وجستجو سے منہ پھیر سکتا ہے؟

ہاں! ممکن ہے کہ بعض اشخاص، آرام طلب اور کاہل ہونے کی وجہ سے یہ تحقیق انجام نہ دیں یا پھر دین کے قبول کر لینے کے بعد اس کی پابندیوں اور بعض نفسانی خواہشوں پر روک لگ جانے کی وجہ سے دین میں جستجو کرنے سے پرہیز کریں۔(۱)

لیکن ایسے اشخاص کو اپنی آرام طلب طبیعت کی سزا بھگتنا ہوگی، اور عذاب ابدی میں گرفتار ہونا ہوگا ایسے لوگوں کی حالت ان بچوں سے بھی بدتر ہے جو دواؤں کی تلخی کی وجہ سے ڈاکٹروں کے پاس جانے سے کتراتے ہیں اور اپنے لئے حتمی موت کو دعوت دے دیتے ہے، اس لئے کہ یہ بچے اپنے فائدہ ونقصان کو سمجھنے کے سلسلہ میں کافی عقل وشعور نہیں رکھتے ڈاکٹر کی ہدایتوں سے مخالفت دنیا کی چندروزہ نعمتوں سے محرومی سے زیادہ نہیں ہے لیکن ایک بالغ انسان، سود وزیاں کو درک کرنے اور جلد ختم ہوجانے والی نعمتوں کے سلسلہ میں غور وفکر کی صلاحیت کا حامل ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے قرآن نے اپنے غافل انسانوں کو حیوانات سے بھی زیادہ گمراہ جانا ہے۔

(اُولٰئِکَ کالاَنعَامِ بَل ہُم اَضَلُّ ، اُولٰئِکَ ہُمُ الغٰفِلُونَ)(۲) یہ لوگ گویا جانور ہیں بلکہ ان سے

بھی کہیں گئے گزرے، یہی لوگ (امورحق سے) بالکل بے خبر ہیں۔

ایک اور مقام پر حیوانات سے بدتر کہا ہے۔

....

(۱) بل یرید الانسان لیفجر امامہ. سورۂ قیامت۔آیت ۵ / .ترجمہ: مگر انسان تو یہ چاہتا ہے کہ اپنے آگے بھی (ہمیشہ) برائی کرتا جائے

(۲) سورۂ اعراف۔آیت/ ۱۷۹.وہ لوگ چو پائے بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں.

(اِنَّ شَرَّ الدَّ وآبِّ عِندَ اللّہِ الصُمُّ البُکمُ الَّذِینَ لاَیَعقِلُونَ)(۱)

اس میں شک نہیں کہ زمین پر چلنے والے تمام حیوانات سے بدتر خدا کے نزدیک وہ بہرہ گونگے (کفّار) ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے

ایک شبہ کا حل۔

اس مقام پر شاید کوئی شخص اپنے لئے یہ بہانا نہ پیش کرے کہ ایک مسئلہ کے تحت تنہا اسی صورت میں تحقیق و جستجو مفید ہے کہ جب اس کے حل کی امید ہو لیکن ہم دین اور اس کے مسائل کے سلسلہ میں ایسی فکر کے مالک نہیں ہیں، اسی وجہ سے اپنی طاقت کو ایسے امور میں صرف کرنے کی بجائے کیوں نہ ایسے موارد میں صرف کریں جس میں زیادہ سے زیادہ نتیجہ بر آمد ہونے کی توقع ہو، ایسے شخص کا جواب اس طرح دیں گے۔

سب سے پہلے یہ کہ: دین کے اساسی مسائل کو حل کرنا کسی بھی صورت میں علمی مسائل کے حل

کرنے سے کم نہیں ہے اور اس بات کو ہم بخوبی جانتے ہیں کہ بعض مشکل مسائل کا حل دانشمندوں کے سالہا سال کی زحمتوں کا نتیجہ ہے۔

دوسرا یہ کہ: احتمال کی قدر و قیمت تنہا ایک عامل کے تابع (مقدار احتمال) نہیں ہے، بلکہ اس درمیان متحمل کی مقدار کو بھی جاننا ہوگا، مثلاً اگر ایک اقتصادی تجارت میں منفعت ٥ ٪ اور دوسری تجارتوں میں ١٠ ٪ ہو لیکن اگر پہلی والی تجارت میں متحمل کی منفعت ایک ہزار روپیہ اور دوسری تجارت میں ایک لاکھ روپیہ ہو تو پھر پہلی تجارت پانچ گونہ دوسری تجارت پر فوقیت رکھتی ہے اگر چہ

....

(١) سورۂ انفال۔ آیت/ ٢٢. وہ لوگ تمام حیوانات سے بدتر خدا کے نزدیک وہ بہرے گونگے کفار ہیں جو حقائق کو درک نہیں کرتے.

پہلی تجارت میں مقدار احتمال ٥ ٪ فیصد جو دوسری تجارت کی مقدار احتمال ١٠ ٪ کا نصف ہے (١)

چونکہ دین میں تحقیق کی منفعت کا احتمال بے شمار ہے ہر چند قطعی نتیجہ ہے کہ دستیابی کا احتمال ضعیف ہو، لیکن اس راہ میں تحقیق اور کوشش ہر اس راہ سے زیادہ ہے جسمیں نتیجہ محدود ہو، اور تنہا اسی صورت میں دینی مسائل میں ترک تحقیق قابل قبول ہے کہ جب انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ دین غیر درست اور اس کے مسائل قابل حل نہیں ہیں، لیکن ایسا یقین واطمینان کہاں سے حاصل ہوسکتا ہے؟!

....

(۱)۔۵۰:۱۰۰۰۰۵۰۰ضرب۱۰۰۰۔۱۰:۱۰۰۱۰۰۰۱:۱۰۰۱۰۱ضرب۱۰۰۔۵:۱۰۱ تقسیم ۵۰.

سوالات

۱۔حقائق کی شناخت کے لئے انسان کا غریزہ کیا ہے؟

۲۔کیوں انسان تمام حقائق کی تحقیق نہیں کرتا؟

۳۔حس دینی کا مطلب کیا ہے؟ اوراس کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے کون سی دلیل ذکر کی گئی ہے؟

٤۔اصول دین میں تحقیق کی ضرورت کو بیان کریں؟

٥۔کیا دین کے قطعی مسائل کو حل کرنے کی امید نہ ہونے کو، ترک تحقیق کے لئے عذر بنایا جاسکتا ہے؟

تیسرا درس

انسان بن کے جینے کی شرط

مقدمہ

انسان کمال طلب ہے

انسان کا کمال، عقل کی پیروی میں ہے

عقل کے احکام عملی کو مبانی نظری کی ضرورت ہے

نتیجہ

مقدمہ

گذشتہ درس میں آسان عبارتوں کے ذریعہ دین میں تحقیق اور دین حق کی شناخت کے سلسلہ میں بحث کی گئی کہ یہ امر منفعت جوئی اور ضرر سے بچنے کے لئے ایک فطری عامل ہے جسے ہر انسان اپنے وجود میں پاسکتا ہے(۱) یا علم حضوری اس کی تشخیص میں اشتباہ نہیں کرسکتا۔

اس درس میں اسی مطلب کو ایک دوسرے انداز میں ثابت کریں گے، جو دقیق مقدمات پر مشتمل ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی دین کے سلسلہ میں غور وفکر نہ کرے، جہان بینی اور صحیح

....

(۱)اس دلیل کی شکل کچھ اسطرح ہے اگر منفعت کا حصول اور ضرر سے پرہیز انسان کا فطری مطلوب ہے۔ایسے
دین کے سلسلہ میں تحقیق کرنا جو بے نہایت منفعت کی طرف راہنمائی اور عظیم ضرر سے نجات دینے کا مدعی ہے ضروری ہے (تحقق معلول کے لئے علت ناقصہ ضرورت بالقیاس ہے)
لیکن منفعت کا حصول اور ضرر سے پرہیز انسان کا فطری مطلوب ہے، لہذا ایسے دین کے سلسلہ میں تحقیق کرنا ضروری ہے۔
یہ استدلال جسے قیاس استثنائی کی شکل میں بیان کیا گیا ہے عقل کے احکامِ عملی اور ضرورت بالقیاس کی طرف ان کی بازگشت کے سلسلہ میں ایک خاص منطقی تحلیل ہے جو معلول (نتیجہ مطلوب) تک پہنچنے کے لئے ایک علت (فعل اختیاری) ہے، جیسا کہ اسے بیان کیا جا چکا ہے۔
اس درس میں یعنی مورد بحث دلیل کو اس شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے، اگر کمال انسانی تک پہنچنا مطلوب فکری ہو تو اصول جہان بینی کی پہچان جو تکامل روح کے لئے شرط ہے ضروری ہوگا،لیکن کمال تک پہنچنا مطلوب فطری ہے،لہٰذا ان اصول کا جاننا ضروری ہے۔
آئیڈیالوجی کا معتقد نہ ہو وہ کمال انسانی کو حاصل نہیں سکتا، بلکہ اسے سرے سے ایک حقیقی انسان نہیں مانا جا سکتا یا دوسری تعبیر کے مطابق انسان بن کے جینے کے لئے جہان بینی اور صحیح آئیڈیالوجی کی ضرورت ہے۔
یہ دلیل تین مقدمات پر مشتمل ہے۔

۱۔انسان ایک کمال جو(کمال طلب) موجود ہے۔
۲۔کمال انسانی حکم عقل کی بنیاد پر حاصل ہونے والے اختیاری کردار کے سایہ میں حاصل ہوتا ہے۔
۳۔عقل کے احکام عملی ایک خاص نظری شناخت کے پرتو میں آشکار ہوتے ہیں کہ جن میں سے بہترین جہان بینی کے تین اصول ہیں،یعنی مبدا وجود کی شناخت (توحید) حیات کا انجام(معاد) حاصل کرنے کے لئے ضمانت شدہ راستہ (نبوت) یا ہستی کی پہچان انسان کے پہچان اورراہ کی پہچان ہے اب اس کے بعدان تینوں مقدمات کی وضاحت کے ساتھ بحث کے سلسلہ کوآگے بڑھاتے ہیں۔

انسان کمال طلب ہے۔

اگرانسان اپنے باطنی اورروحی (معنوی) میلانات میں غوروفکرکرے تو اسے بخوبی معلوم ہوگا کہ یہ سارے تمایلات ایک مخصوص ہدف کی جانب گامزن ہیں،اصولاً کوئی بھی انسان اس بات کو پسندنہیں کرتا،کہ اس کے وجود میں کوئی نقص ہواوراپنی پوری تاب وتوانائی کے ساتھ اپنے ذاتی عیوب ونقائص کودورکرنے میں لگارہتا ہے تا کہ اپنے مطلوب ہدف تک پہنچ سکے، اورجب تک وہ عیوب دورنہیں ہوتے انھیں لوگوں کی نگاہوں سے مخفی رکھتا ہے۔
یہ میلانات جب اپنی فطرت کے مطابق ہوتے ہیں تو یہی مادی ومعنوی تکامل (کمال کی طرف جانے) کا ذریعہ بن جاتے ہیں،لیکن اگراسباب وشرائط کی بنیاد پر یہی میلانات

انحرافی مسیر پر گامزن ہوجائیں تو غرور و گھمنڈ، ریا کاری اور خودخواہی جیسی بری صفت انسان کے اندر پیدا جاتی ہے

بہرحال کمال طلبی کی صفت ایک قوی فطرت ہے جو روح انسان میں پائی جاتی ہے، جس کے واضح نمونہ اور آثار بخوبی مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں لیکن ایک معمولی توجہ کے ذریعہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ان سب کا ریشہ وہی کمال جوئی ہے۔

انسان کا کمال، عقل کی پیروی میں ہے۔

نباتات کا رشد کرنا خارجی اسباب وشرائط کا نتیجہ اور ایک جبری امر ہے، کوئی بھی درخت اپنے اختیار سے رشد نہیں کرتا، اور اپنی مرضی کے مطابق پھل نہیں دیتا، اس لئے کہ وہ ارادہ اور شعور کا حامل نہیں ہے۔

لیکن جانوروں کے رشد ونمو میں انتخاب کے آثار مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں، لیکن یہ ارادہ و انتخاب اپنی طبیعی تقاضوں کے مطابق ایک محدود دائرے میں غرائزہ حیوانی کے تحت ہر حیوان کی اپنی حسی قوت کے مطابق ایک محدود شعور کے پرتو میں ہے۔

لیکن انسان کی ذات نباتاتی وحیوانی خواصیات کے حامل ہونے کے علاوہ دو روحانی امتیازی پہلوؤں کا بھی مالک ہے، ایک طرف تو اس کے فطری میلانات اور خواہشات کے لئے کوئی حد مقرر نہیں ہے اور دوسری طرف اس کی قوت عقل کی کامل ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی معلومات کو بے نہایت بنا سکتا ہے، ان دونوں خصوصیات کو مدّنظر رکھتے ہوئے اس کے

ارادوں کی وسعت طبیعت کے حدود سے بھی کہیں زیادہ نظر آتی ہے۔

جس طرح نباتات کے کمالات ایک خاص نباتی طاقت کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں اور حیوانی کمالات انھیں حسی ادراکات کے نتیجہ پائے جانے والے ارادوں کی وجہ سے ہے اسی طرح انسانی کمالات کا سرچشمہ درواقع اس کا روحانی پہلو ہے جو عقل اور ارادوں کے ذریعہ حاصل ہوتے

ہیں، وہ عقل کہ جو مطلوب کے مراتب کو پہچان لے اور تزاحم (اھم اور مھمکو سمجھنے کے وقت ان میں سے بہترین کو ترجیح دے۔

لہٰذا رفتار و کردار کے انسانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عقل کی راہنمائی میں انسانی میلانات کے ذریعہ وجود میں آنے والے ارادوں کے ذریعہ حاصل ہو اور وہ عمل جو صرف اور صرف حیوانی غرائز کے ذریعہ عمل میں آئے، وہ حیوانی ہے جس طرح کہ وہ حرکت جو مکینکی طاقت کے ذریعہ انسانی بدن میں پیدا ہوتی ہے وہ ایک فیزیکی (طبیعی حرکت ہے۔

عقل کے احکام عملی کو مبانی نظری کی ضرورت ہے

اختیاری عمل ایک ایسا وسیلہ ہے کہ جس کے ذریعہ مطلوب نتیجہ کو حاصل کیا جاسکتا ہے، اور اس کی قدر و قیمت اس کے ہدف کے مطابق ہے جو روح کے تکامل (کمال کی طرف جانے) میں اثر انداز ہوتی ہے، لہٰذا جو عمل بھی کسی روحی کمال کے خاتمہ کا سبب ہے اس کی قدر و قیمت منفی ہوگی۔

لہذا اسی صورت میں عقل، انسان کے اختیاری اعمال پر قضاوت کرسکتی ہے کہ جب انسانی کمالات اوران کے مراتب سے پوری طرح آگاہ ہو،اوراچھی طرح سے جانتی وپہچانتی ہو کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ اوراس کی زندگی کی شعاعوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے؟ اور وہ کمالات کے کتنے مدارج طے کرسکتا ہے؟ یا دوسری تعبیر کے مطابق اس کے وجود کے کتنے پہلو ہیں ؟اوراس کی خلقت کا مقصد وہدف کیا ہے؟

اسی وجہ سے صحیح آئیڈیالوجی کا حاصل کرنا،یعنی اختیاری اعمال پرایک پرُ ارزش نظام کا حاکم صحیح جہان بینی اوراس کے مسائل کوحل کرنے کی راہ میں ایک قدم ہے،لہٰذا جب تک وہ ان مسائل کوحل نہیں کرتا اس وقت تک کرداروا عمال کے سلسلہ میں کوئی قطعی قضاوت نہیں کرسکتا، جس طرح سے کہ جب تک ہدف معلوم نہیں ہوتا اس وقت تک اس ہدف تک جانے والے راستہ کی تعیین غیرممکن

ہے، لہذا یہ معارفِ نظری جو جہان بینی کے اساسی مسائل کوتشکیل دیتے ہیں حقیقت میں اسے عقل احکام عملی اور باارزش نظام کے مبنیٰ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

نتیجہ۔

ان مقدمات کی تشریح کے بعداب ہم دین میں تحقیق کی ضرورت،صحیح آئیڈیالوجی اور جہان بینی کواس طرح ثابت کریں گے۔

انسان اپنی فطرت کی وجہ سے اپنے انسانی کمال کی جستجو میں ہےاوراس کوشش میں ہے کہ کسی

نہ کسی طرح اپنے مطلوبہ کمال کو حاصل کرلے، لیکن قبل اس کے کہ وہ ان امور کو پہچانے جو اسے کمال تک پہنچا سکتے ہیں ضروری ہے کہ وہ اپنے انتہائی کمال کو پہچانے، اور اس انتہائی کمال کا جاننا اپنے وجود کی حقیقت اور اس کے آغاز وانجام کے بارے میں اطلاع حاصل کرنے میں ہے اس کے بعد اپنے کمال کے مختلف مراتب میں مختلف اعمال کے درمیان موجود، رابطہ کے مثبت یا منفی ہونے کو تشخیص دے، تا کہ وہ اس طرح اپنے انسانی کمال کے صحیح راستہ کو پہچان سکے، لہٰذا جب تک وہ نظری شناخت (اصول جہان بینی) کو حاصل نہیں کرتا اس وقت تک صحیح عملی نظام (آئیڈیالوجی) کو قبول نہیں کرسکتا۔

لہذا دین حق کی معرفت حاصل کرنا جو صحیح جہان بینی اور آئیڈیالوژی کو شامل ہے ضروری ہے اور اس کے بغیر کمال انسانی تک پہنچنا غیر ممکن ہے جیسا کہ وہ رفتار جو ایسے افکار واقدار کا نتیجہ نہ ہو وہ انسانی نہیں ہوسکتی یا وہ لوگ جو انھیں جاننے کے باوجود انکار کرتے ہیں، تنہا اپنی حیوانی خواہشات اور جلد ختم ہونے والی مادی نعمتوں پر اعتماد کرتے ہیں، ان کی اھمیت اصل میں ایک حیوان سے زیادہ نہیں ہیں، جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے

يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الأَنعَامُ.(۱)

وہ دنیا میں سکون حاصل کرتے ہیں اور اس طرح (بے فکری سے) کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان کھاتے پیتے ہیں۔

---

(۱) سورۂ محمد۔ آیت/ ۱۲۔ وہ حیوانوں کی طرح زندگی گذارتے ہیں اور کھاتے ہیں۔

چونکہ وہ لوگ اپنی انسانی صلاحیتوں کوتباہ کرتے ہیں لہٰذا دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے

ذَرهُم يَأكُلُوا وَيَتَمَتَعُوا وَيُلهِهِمُ الاَمَلُ فَسَوفَ يَعلَمُونَ.(۲)

اے رسول انہیں انھیں کی حالت پر چھوڑ دیجئے تا کہ (خوب) عیش ونوش کرلیں اور (زندگی کے) مزے اڑالیں اوران کی تمنائیں انہیں لہوولعب میں مشغول رکھے عنقریب وہ جان لیں گے۔

....

(۲) سورۂ حجر۔آیت/ ۳.انھیں،انھیں کے حال پر چھوڑ دیں کہ کھائیں اورزندگی گذاریں اوران کی دنیوی آرزوئیں انھیں مگن رکھیں کہ عنقریب انھیں معلوم ہوجائے گا.

سوالات

۱۔دین میں تحقیق کی دوسری دلیل کن مقدمات پر مشتمل ہے؟

۲۔انسانی کمال طلبی کی وضاحت کریں؟

۳۔انسان کی مہم خصوصیات کو بیان کریں؟

٤۔مذکورہ خصوصیات اوران کے حقیقی کمال میں کیارابطہ ہے؟

٥۔کسی طرح آئیڈیالوژی،جہان بینی پر منحصر ہے؟

٦۔دوسری دلیل کی منطقی صورت بیان کریں؟

چوتھا درس

جہان بینی کے بنیادی مسائل کا راہ حل

مقدمہ

شناخت کی قسمیں

معرفت کی قسمیں

تنقید

نتیجہ

مقدمہ:

جب ایک انسان معرفت کے بنیادی مسائل کو حل کرنے اور دین حق کے اصول وقواعد کی پہچان کے لئے قدم اٹھاتا ہےتو وہ پہلے ہی مرحلہ میں ان سوالوں کا سامنا کرتا ہے کہ وہ کس طرح ان مسائل کو حل کرے؟ کس طریقہ سے بنیادی اور صحیح معارف کو حاصل کرے؟ اور اصولاًان کی شناخت کے راستے کیا ہیں؟ نیز ان میں سے کسےان معارف تک پہنچنے کے لئے انتخاب کرے؟

ان مطالب پر فنی اور تفصیلی گفتگو کرنے کے لے فلسفہ کی ایک بحث ا(شیاء کی معرفت)

(اپیستمولوژی) کا سہارا لینا ضروری ہے، کہ جسمیں شناخت انسان کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، اوراس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے ہم یہاں پر ان تمام پہلوؤں سے بحث نہیں کر سکتے اس لئے کہ وہ ہمیں اس کتاب میں اصل ہدف سے دور کر دیں گے، اس وجہ سے ان میں سے فقط بعض کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے، اور مزید تحقیق کے لے (انشاءاللہ) ہم ضرورت پڑنے پر اشارہ کریں گے(۱)

....

(۱) اس سلسلہ میں مزید اطلاع حاصل کرنے کے لئے اس کتاب کے ددوسرے حصہ آموزش فلسفہ اور مقالہ شناخت جو کتاب پاسداری ازسنگرھای ایدئے ولوژیک میں ہے، اور ایدئے ولوژی تطبیقی کے درورس میں سے پانچویں درس سے سولہویں درس تک کا مطالعہ کیا جائے

شناخت کی قسمیں۔

انسان کی اس شناخت کے اعتبار سے چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔شناخت علمی (تجربی) (خاص اصطلاح میں) یہ شناخت، حسی امور کی مدد سے حاصل ہوتی ہے اگر چہ عقل ادراکات حسی کی عمومیت اور اس کے مجرد عن المادہ ہونے میں اپنا پورا کردار ادا کرتی ہے شناخت علمی سے، تجربی علوم مثلاً سائنس، لبیرٹری، اور زیست شناسی (علم حیات

) جیسے علوم میں استفادہ کیا جاتا ہے۔

۲۔ شناخت عقلی: ایسی شناخت مفاہیم انتزاعی (معقولات ثانیہ) کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اس میں اساسی اور بنیادی رول عقل کا ہوتا ہے، ہر چند اس بات کا امکان ہے کہ بعض قضایا بہ عنوان مفاھیم انتزاعی یا مقدمہ از قیاس ہونے کی وجہ سے حسی و تجربی ہوں، اس شناخت کی وسعت منطق، علوم فلسفیہ، اور ریاضیات سب کو شامل ہے۔

۳۔ شناخت تعبدی: اس شناخت کی حثیت ثانوی ہے، جو (قابل اعتماد ماخذ و مدرک) (اتورتیہ) اور صادق شخص کے خبر دینے کے ذیعہ حاصل ہوتی ہے وہ مطالب جو پیروان دین، اپنے دینی رہنما ہونے کے ناطے ان کے اقوال کو قبول کرتے ہیں، اور کبھی کبھی ان کا یہ اعتقاد حس و تجربہ کے ذریعہ حاصل ہونے والے اعتقاد سے کہیں زیادہ قومی ہوتا ہے جو اسی شناخت کا ایک حصہ ہے۔

٤۔ شناخت شہودی: یہ شناخت دوسری اقسام کے برخلاف مفہوم ذہنی کے واسطہ کے بغیر معلوم ذات عینی سے متعلق ہوتی ہے، جس میں کسی قسم کے اشتباہ کا امکان نہیں رہ جاتا لیکن جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ جو کچھ بھی شہودی اور عرفانی کے نام سے بیان کیا جاتا ہے در حقیقت شھودات کی ایک ذہنی تفسیر ہوتی ہے جو قابل خطا ہے۔(۱)

....

(۱) رجوع فرمائیں، آموزش فلسفہ۔ تیرہواں درس.

معرفت کی قسمیں

شناخت کی قسمیں جن اصولوں کی بنیاد پر بیان کی گئیں ہیں انھیں اصولوں کے ذریعہ جہاں بینی کی بھی تقسیمات کی جاسکتی ہیں۔

۱۔معرفت علمی: یعنی انسان ،علوم تجربی کے ذریعہ حاصل ہونے والے نتائج کے ذریعہ ہستی کے سلسلہ میں ایک کلی معلومات حاصل کرے۔

۲۔معرفت فلسفی: وہ معرفت جو از راہ استدلال اور عقلی کاوشوں کے ذریعہ حاصل ہو۔

۳۔معرفت دینی: وہ معرفت جو رہبران دین پر ایمان رکھنے اوران کی گفتار کوقبول کرنے کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔

٤۔معرفت عرفانی: وہ معرفت جو کشف وشہود اور اشراق کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ واقعاجہان بینی کے بنیادی مسائل کوانھیں چار تقسیموں کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے،تا کہ ان میں کسی ایک کے برتر ہونے کا سوال پیدا نہ ہو۔

تنقید۔

حس وتجربی شناخت کی وسعت اور مادی وطبیعی قضایا میں محدودیت کی وجہ سے یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ علوم تجربی کی بنیاد پر معرفت کے اصول کونہیں سمجھا جاسکتا اوراس سے مربوط مسائل کوحل نہیں کیا جاسکتا،اس لئے کہ اس کے مسائل علوم تجربی کی حدود سے خارج ہیں،اور

علوم تجربی میں ان مسائل کے تحت نفی واثبات کا امکان نہیں ہے، جس طرح سے کہ وجود خدا کو آزمائشوں کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جاسکتا، یا (العیاذ باللہ) اسکی نفی کا امکان نہیں ہے، اس لئے کہ علوم تجربی کے آلات ماوراء طبیعت تک پہنچنے سے قاصر ہیں، بلکہ ان کے ذریعہ تنہا مادی قضایا میں اثبات ونفی کا حکم صادر کیا جاسکتا ہے۔

لہٰذا علمی وتجربی معرفت (اپنے اصطلاحی معنی) کی حقیقت ایک سراب سے زیادہ نہیں ہے اور اسے صحیح معنوں میں کلمہ معرفت سے یاد نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اسے جہان مادی کی شناخت کا نام دیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ ایسی شناخت معرف کے بنیادی مسائل کا جواب نہیں دے سکتی۔

لیکن وہ شناخت جو تعبدی روش کے ذریعہ حاصل ہو، جسیا کہ ہم نے اشارہ بھی کیا ہے اس کی ایک ثانوی حثیت ہے، کہ جسکا مطلب یہ ہے کہ پہلے مصدر یا مصادر کا اعتبار ثابت ہو چکا ہو، یعنی پہلے مرحلہ میں کسی کی بعثت ثابت ہوتا کہ اس کے پیغامات کو معتبر سمجھا جاسکے، اور ہر امر سے پہلے پیغام ارسال کرنے والے یعنی وجود خدا کا اثبات ہونا چاہیے، لہٰذا یہ بات بطور کامل روشن ہے کہ خود پیغام ارسال کرنے والے کا وجود اور کسی پیغمبر کے وجود کو پیغام کے مستند ہونے کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جاسکتا، جیسے کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چونکہ قرآن کہتا ہے خدا ہے پس اس کا وجود ثابت ہے، البتہ وجود خدا کے اثبات، شناخت پیغمبر اور حقانیت قرآن کے بعد مخبر صادق اور منابع معتبر کے ذریعہ، تمام فرعی مسائل اور احکامات کو قبول کیا جاسکتا ہے لیکن بنیادی مسائل کو سب سے پہلے حل کرنا ضروری ہے، پس معلوم یہ ہوا کہ روش تعبدی بھی بنیادی

مسائل کے حل کے لئے ناکافی ہے، لیکن اشراقی عرفانی روش کے سلسلہ میں بہت طولانی بحث ہے۔

پہلے یہ کہ مسائل جہان بینی ایک ایسی شناخت ہے جو ذہنی مفاہیم پر مشتمل ہے لیکن متن شہود میں اسکا کوئی مقام نہیں ہے لہذا ایسے مفاہیم کے سلسلہ میں شہود پر اعتماد کرنا سھل انگاری اور ان کے ارادوں کے مطابق ہوگا۔

دوسرا یہ کہ: الفاظ ومفاہیم کے قالب میں شہودات کی تفسیر اورانھیں بیان کرنا، ایک قوی ذہن کا کام ہے، جسے عقلی کاوشوں اور فلسفی تحلیلوں میں ایک طولانی مدت تک جانفشانیوں کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا جولوگ ایسے ذہن کے حامل نہیں ہوتے وہ اپنی تعبیرات میں متشابہ مفاہیم کا استعمال کرتے ہیں جو گمراہی کے عظیم عوامل میں شمار ہوتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ: بہت سے مقامات پر جو چیز واقعاً شہود میں آشکار ہوتی ہے خیالی انعکاس اور ذہنی تفسیر کی وجہ سے خود خود مشاہدہ کرنے والے کے لے، شک وتردید کا باعث ہوتی ہے۔

چوتھے یہ کہ: ان حقائق کی جستجو جسے تفسیر ذہنی (معرفت) کا نام دیا جاتا ہے سیر وسلوک میں سالہا سال زحمت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، سیر وسلوک کی روش کوقبول کرنا علمی شناخت کا ایک حصہ ہے، جس میں معرفت کے بنیادی مسائل اور مبانی نظری سے واقف ہونے کی ضرورت ہے، لہٰذا سیر وسلوک میں سفر سے پہلے ان مسائل کا حل کرنا ضروری ہے تا کہ نتیجہ میں کشف وشہود حاصل ہو سکے درں حالیکہ شہودی شناخت کا مرحلہ انجام کار ہے اصولاً عرفان

حقیقی اس کو حاصل ہوتا ہے جو راہ خدا میں خالصۃً لوجہ اللہ (صرف خدا کی مرضی کے لئے) زحمت اٹھائے اور ایسی سعی وکوشش راہ بندگی واطاعت میں شناخت خدا پر منحصر ہے، جسے سب سے پہلے حاصل کرنا ضروری ہے۔

نتیجہ:

اس تحقیق کے بعد جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ تنہا وہ راستہ جس نے معرفت شناسی کے بنیادی مسائل کا حل تلاش کرنے والوں کے سامنے راہیں ہموار کی ہیں وہ راہ عقل اور روش تدبر وتفکر ہے، اور اس لحاظ سے جہان بینی واقعی کو جہان بینی فلسفی تسلیم کرنا چاہیے۔

البتہ عقل کے ذریعہ ان مسائل کو حل کرنا اور معرفت کو فلسفی مباحث میں منحصر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صحیح معرفت حاصل کرنے کے لئے تمام فلسفی مسائل کا حل کیا جانا ضروری ہے بلکہ اس راہ میں صرف بدیہی اور چند مسائل کا حل کر لینا ہی کافی ہے کہ جو معرفت کے بنیادی مسائل میں شمار ہوتے ہیں، اگر چہ اس کے باوجود ایسے مسائل اور اسی قسم کے بہت سے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے فلسفی مہارتوں کا زیادہ ہونا ضروری ہے، اسی طرح شناخت عقلی کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کے لئے مفید طریقہ شناخت کو بہ روی کار لانے کا مطلب یہ نہیں ہے بقیہ معلومات کو ترک کر دیا جائے بلکہ بہت سے عقلی استدلالات میں ان مقدمات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، جو علم حضوری یا حس وتجربہ کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، جس طرح سے کہ ثانوی مسائل اور فرعی اعتقادات کو حل کرنے کے لئے تعبدی شناخت کا

سہارا لیا جا سکتا ہے اور انھیں کتاب وسنت (دین کے معتبر منابع) کی اساس پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔
صحیح معرفت اور آئیڈیالوجی کو حاصل کرنے کے بعد سیر وسلوک کے مراحل کو طے کرنے کے لے مکاشفات ومشاھدات کی منزل تک پہنچا جا سکتا ہے اور بہت سے وہ مسائل جو عقلی استدلالات کے ذریعہ حل ہوتے ہیں انھیں ذہنی مفاہیم کے واسطہ کے بغیر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سوالات

١۔شناخت انسان کی اقسام اور ہر ایک کی وسعت کو بیان فرمائیں؟
٢۔معرفت کی کتنی قسمیں تصور کی جاسکتی ہیں؟
٣۔معرفت کے بنیادی مسائل کس طرح ثابت کئے جاسکتے ہیں؟
٤۔جہان بینی علمی (معرفت علمی) پر تنقید وتبصرہ کریں؟
٥۔معرفت کے مسائل کو بیان کرنے کے لئے تجربی شناختوں سے کس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے؟
٦۔عقیدتی مسائل کے اثبات میں کس طرح اور کن موارد میں تعبدی شناختوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟
٧۔معرفت عرفانی کی تعریف کریں؟ اور کیا شہود عرفانی کے ذریعہ معرفت کے بنیادی مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے؟

پانچواں درس

خدا کی معرفت

مقدمہ

حضوری اور حصولی معرفت

فطری معرفت

مقدمہ

اب تک ہمیں یہ معلوم ہوا کہ دین کی اساس و بنیاد کائنات کے خلق کرنے والے پر اعتقاد (یقین) رکھنا ہے اور معرفت الٰہی اور معرفت مادی کے درمیان اصلی فرق اسی کا پایا جانا اور نہ پایا جانا ہے

لہٰذا سب سے پہلا وہ مسئلہ جو حقیقت کے چاہنے والوں کے لئے پیدا ہوتا ہے اور جس کا جواب ہر شی سے پہلے ضروری ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا کسی خدا کا وجود ہے یا نہیں؟ اور اس سوال کے جواب کو حاصل کرنے کے لئے جیسا کہ گذشتہ درس میں بیان کیا جا چکا ہے اسے حل کرنے کے لئے عقل کی جولانیوں کی ضرورت ہے تا کہ کسی قطعی نتیجہ تک پہنچا جا سکے نتیجہ چاہے اثبات ،، میں ہو یا نفی ،، میں اثبات کی صورت میں اس کے فرعی مسائل (توحید عدل اور تمام صفات

الٰہی) کی باری آتی ہے، نتیجہ کے نفی ہونے کی صورت میں مادی نظریہ کی تائید وتصدیق ہوتی ہے کہ جس کے بعد دین کے بقیہ مسائل کو حل کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حضوری اور حصولی معرفت۔

خدا کے سلسلہ میں دو اعتبار سے اس کی معرفت کا تصور کیا جاتا ہے۔۱۔معرفت حضوری۔ ۲،معرفت حصولی۔ خدا کی نسبت معرفت حضوری کا مطلب یہ ہے کہ انسان مفاہیم ذہنی کو واسطہ بنائے بغیر شہود قلبی کے ذریعہ خدا کی ذات سے آشنا ہو جائے۔

لٰہذا یہ بات روشن ہے کہ اگر کوئی شخص خدا کے سلسلہ میں ایک واضح شہود سے روبرو ہو جائے تو (جیسا کہ بلند مرتبہ عارفوں نے دعویٰ کیا ہے)، پھر کسی بھی عقلی استدلال و برہان کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ایسا شہود اور علم حضوری عام افراد(۱) کے لئے عرفانی سیر وسلوک کے مراحل طے کرنے کے بعد ہی میسر ہے، اگرچہ ایسے انکشافات کا امکان عام افراد کے لئے کسی حد تک بجا ہے لیکن چونکہ معرفت کو حاصل کرنے کے لئے کافی معلومات نہیں رکھتے لٰہذا یہ چیز ان کیلئے ممکن نہیں ہوگی۔

معرفت حصولی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کلی مفاہیم (جیسے بے نیاز خالق، عالم وقادر) یعنی ادراکات ذھنی اور ایک لحاظ سے غائبانہ طور پر خدا کی طرف نسبت دے، اور اس حد تک اعتقاد رکھے، کہ ایسی ذات کا وجود ہے کہ جس نے اس جہان کو پیدا کیا ہے اور پھر معرفت حصولی کے دوسرے ذرائع کو اس سے متعلق ایک منظم اصول تک رسائی ہو سکے، جو کچھ بھی

فلسفی براہین اور عقلی کاوشوں کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ دراصل یہی معرفت حصولی ہے، لیکن جب ایسی معرفت انسان کو حاصل ہو جائے تو اسے معرفت حضوری کے سلسلہ میں بنی کوشش کرنا چاہیے۔

فطری شناخت۔

عرفاء، حکماء اور دینی رہبروں کے اکثر اقوال میں اس عبارت کو اکثر و بیشتر دیکھا گیا ہے کہ خدا کی شناخت فطری ہے یا انسان فطرۃً خداشناس ہے اس مطلب کو سمجھنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے فطرت کے معنی سمجھنا ہوں گے۔

....

(۱) البتہ ایسے مشاھدات وانکشافات کے اھل افراد سے انکار نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ ہمارا اعتقاد ہے کہ ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام اپنے زمانہ طفولیت میں بھی ایسے شہودات کے مالک ہوا کرتے تھے یہاں تک کہ بعض ائمہ نے شکم مادر میں بھی ایسی شناخت کا ثبوت دیا ہے۔

فطرت ایک عربی کلمہ اور نوع خلقت کے معنی میں ہے، اور انھیں امور کو فطری کہا جاتا ہے کہ جس کا، خلقت وآفرینش تقاضا کرے، اسی وجہ سے اس کے لئے تین خصوصیات کا لحاظ کیا گیا ہے۔

۱۔ فطرت وہ موجود ہے جو نوع از موجودات کے تمام افراد میں، پائی جائے اگر چہ وہ کیفیت شدت وضعف کے اعتبار سے متفادت ہوں۔

۲۔ فطری امور طول تاریخ میں ہمیشہ ثابت ومستحکم و نا قابل تبدیل رہے ہیں اور ایسا کبھی بھی

نہیں ہوسکتا کہ کسی نوع کی فطرت ایک زمانہ گذر جانے کے بعد اپنی اقتضا بدل دے اور اسی طرح زمانے کے بدلنے کی طرح اس کی اقتضا بدلتی رہے۔

(فِطرَتَ اللّٰہ الَّتِ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیہَالاَ تَبدِیلَ لِخَلقِ اللّٰہِ ،)

یہی خدا کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خدا کی خلق کی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ سورہ روم۔ آیت/ ۳۰.

۳۔ فطری امور فطری ہونے کے لحاظ سے اور اقتضاء خلقت کے سبب اس کو سکھنے اور سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہاں اتنا ضرور ہے کہ اسے صحیح راستہ دکھانے اور قوت بخشنے کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے۔

انسان کی فطریات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

الف: فطری معرفت کہ جو ہر انسان کے پاس تعلیم کے بغیر موجود ہے۔

ب: فطری میلانات اور رجحانات ہر فرد کی خلقت کا تقاضا و لازمہ ہیں، لہٰذا اگر ہر فطرت بشر کے لئے خدا کے سلسلہ میں ایک قسم کی شناخت ثابت ہوجائے کہ جس کے حصول کے لئے تعلیم و تعلم کی ضرورت نہ ہو تو اسے فطری خدا شناسی کا نام دیا جاسکتا ہے اور اگر تمام انسانوں میں خدا کی طرف توجہ اور اس کی پرستش کے میلانات ظاہر ہوجائیں تو اسے (فطری خدا پرستی) کہا جاسکتا ہے۔

ہم نے دوسرے درس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ بہت سے صاحبان نظر کی رو سے دین اور خدا کی طرف توجہ پیدا کرنا انسان کی روحی خصوصیات کا تقاضا ہے کہ جسے حس

مذہبی یا عاطفہ دینی کا نام دیا جاتا ہے، اب اس کے بعد ہم اس مطلب کا بھی اضافہ کرتے ہیں کہ خدا شناسی بھی انسانی فطرت کا تقاضہ ہے، لیکن جیسا کہ خدا پرستی کی فطرت ایک دیدہ و دانستہ میلان نہیں اسی طرح خدا شناسی کی فطرت بھی لاشعوری اور غیر دانستہ ہے اس لحاظ سے یہ فطرت عام افراد کو خدا شناسی کی عقلی جستجو و تلاش سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔

لیکن اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ہر انسان معرفت حضوری کے ایک ادنی درجہ پر فائز ہے لہٰذا معمولی فکر و استدلال کے ذریعہ، وجود خدا کو ثابت کر سکتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنیلا شعوری شناخت (مشاھدہ قلبی) کو قوی بنا سکتا ہے، اور آگاھانہ طور پر معرفت کے مدارج طے کر سکتا ہے۔

نتیجہ:

خدا شناسی کے فطری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا دل و وجود خدا سے آشنا ہے اور اس کی روح میں خدا شناسی کی فطرت موجود ہے جسے رشد و کمال دیا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ فطرت عام افراد میں اس حالت میں نہیں ہے کہ انھیں کلی حثیت سے تفکر اور عقلی استدلالات سے بے نیاز کر دے۔

سوالات

١۔معرفت کا سب سے بنیادی مسئلہ کیا ہے؟اوراس کے اساسی ہونے کی وجہ کیا ہے؟

٢۔خدا کے سلسلہ میں شناخت حضوری اور حصولی کی وضاحت کریں؟

٣۔کیا شناخت حضوری کو عقلی استدلالات کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے؟اور کیوں؟

٤۔شناخت حضوری کے لئے شناخت حصولی کیا مدد کر سکتی ہے؟

٥۔فطرت کے معنی بیان کریں؟

٦۔امور فطری کی خصوصیات بیان فرمائیں؟

٧۔امور فطری کی اقسام ذکر کریں؟

٨۔کون سا فطری امر خدا سے مربوط ہے؟

٩۔خدا شناسی کے فطری ہونے کے بارے میں وضاحت پیش کریں؟

١٠۔کیا خدا شناسی کی فطرت عام لوگوں کو عقلی استدلالات سے بے نیاز کر سکتی ہے؟اور کیوں؟

چھٹا درس

خداشناسی کا آسان راستہ

خداشناسی کے راستے

آسان راستہ کی خصوصیات

آشناعلامات وآثار

خداشناسی کے راستے

خدا کی معرفت حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع اورمختلف طریقے ہیں، کہ جن کی طرف مختلف فلسفی وکلامی کتابوں، دینی رہنماؤں کے بیانات، اورآسمانی کتابوں میں اشارہ کیا گیا ہے، یہ دلائل مختلف جہتوں سے ایک دوسرے سے متفاوت ہیں جیسے کہ بعض دلیلوں میں حسی و تجربی مقدمات سے استفادہ کیا گیا ہے اوربعض دلائل محض مقدمات عقلی پر مشتمل ہیں، بعض دلیلیں خدائے حکیم کے وجود کا اثبات کرتی ہیں توبعض ایک ایسے وجودکوثابت کرتے ہیں جو اپنی پیدائش میں کسی دوسرے وجودکا محتاج نہیں ہے،(واجب الوجود)لہٰذااس کی صفات کی پہچان کے لئے کچھ دوسرے دلائل کی ضرورت ہے۔

خداشناسی کے دلائل کواُن پلوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جوکسی ندی یادریا سے عبورکرنے کے

لئے بنائے گئے ہوں، ان میں بعض پل لکڑی کے ہوتے ہیں کہ جن سے صرف ایک ہلکا (کم وزن) آدمی آسانی سے گذر سکتا ہے اور بعض محکم اور طولانی ہوتے ہیں کہ جن سے ہر کوئی گذر سکتا ہے اور بعض پل آہنی و پر پیچ راستوں پر مشتمل ہوتے ہیں نشیب وفراز اور سُرنگوں سے گذرتے ہیں کہ جنھیں بڑی بڑی ٹرینوں کے گذرنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔

وہ لوگ کہ جو سادہ ذہن ہیں وہ آسان راستوں سے خدا کو پہچان سکتے ہیں اور اس کی عبادت انجام دے سکتے ہیں، لیکن وہ لوگ کہ جن کے ذہنوں میں شک وشبہات پائے جاتے ہیں انھیں محکم پل سے گذرنا ہوگا، اور جن کے ذہنوں میں شکوک وشبہات کا انبار ہے اور طرح طرح کے وسوسہ پیدا ہوتے ہیں انھیں ایسے پل سے گذرنا ہوگا کہ جو زیادہ سے زیادہ استحکام کا حامل ہو، اگر چہ اس میں نشیب وفراز اور پیچ وخم کی مشکلات موجود ہوں۔

ہم اس مقام پر خدا شناسی کے آسان دلائل کے سلسلہ میں بحث کریں گے، اس کے بعد متوسط دلائل پیش کریں گے، لیکن پیچ وخم سے بھرپور راستے کہ جنھیں طے کرنے کے لئے فلسفہ کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کی ضرورت ہے اسے ایسے افراد طے کریں کہ جن کے ذہنوں میں شبہات کا انبار ہے، جو اپنے شبہات کو زائل کرنے نیز بھولے بھٹکے لوگوں کو نجات دلانا چاہتے ہیں۔

آسان راستہ کی خصوصیات۔

خدا شناسی کا آسان راستہ بہت سی خصوصیات کا حامل ہے کہ جس میں سے مہم خصوصیات یہ ہیں

۱۔ اس راستہ کو طے کرنے کے لئے پیچیدہ دلائل کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ ایک آسان دلیل

ہے کہ جسے یہاں ذکر کیا جا سکتا ہے، اسی وجہ سے وہ تمام لوگوں کے لئے خواہ وہ کسی طبقہ سے ہوں قابل فہم ہے۔

۲۔ یہ راستہ براہ راست (خداء علیم وقدیر) کی طرف ہدایت کرتا ہے، جبکہ فلسفہ وکلام کے اکثر براہین پہلے مرحلہ میں ایک ایسے موجود کو ثابت کرنا چاہتے ہیں جو (واجب الوجود) ہے اور اس کی صفات، علم و قدرت، حکمت و خالقیت اور ربوبیت کو ثابت کرنے کے لئے دوسرے دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔

۳۔ یہ راستہ ہر شئی سے زیادہ فطرت کو بیدار کرنے اور فطری معرفت دلانے میں اثر انداز ہے اسی راستہ کو طے کرنے کے بعد انسان میں ایک ایسی عرفانی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ گویا وہ دست خدا کو جہان کی خلقت اور اسکی تدبیر میں مشاھدہ کرتے ہوئے محسوس کر رہا ہے وہی دست خدا کہ جس سے اس کی فطرت آشنا ہے۔

انھیں خصوصیات کی وجہ سے اس راستہ کو انبیاء اور دینی رہبروں نے عام لوگوں کے لئے انتخاب کیا اور لوگوں کو اس راستہ کی طرف آنے کی دعوت دی، اور خواص کے لئے ایک دوسرے طریقہ کار کا انتخاب کیا یا ملحدوں اور مادی فلاسفہ کے مقابلہ میں مخصوص دلائل پیش کئے۔

آشنا نشانیاں۔

خدا شناسی کا آسان راستہ جہان میں خدا کی آیات پر غور وفکر اور قرآن کی تعبیر کے مطابق آیات الٰہی میں تفکر کرنا ہے زمین و آسمان اور انسان کا وجود بلکہ کل جہان کی ہر شئ ایک مطلوب ومقصود نشانی کے وجود سے آشنا ہے اور ساعت قلب کی سوئیوں کو اس مرکز ہستی کی طرف ہدایت کر رہی ہیں کہ جو ہمہ وقت ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔

یہی کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے اسی کی نشانیوں میں سے ہے، کیا ایسا نہیں ہے کہ اس کے مطالعہ سے اس کے مؤلف اور اس کے ہدف سے آپ آشنا ہوں گے؟ کیا آپ یہ احتمال دے سکتے ہیں کہ یہ کتاب خود بہ خود وجود میں آگئی ہے اور اس کا کوئی مؤلف ومصنف نہیں ہے؟ کیا یہ احمقانہ تصور نہیں ہے کہ کوئی یہ تصور کر بیٹھے کہ سیکڑوں جلد پر مشتمل دائرۃ المعارف کی کتاب ایک دھماکے سے وجود میں آگئی، اس کے ذرّات نے حروف کی شکل اختیار کر لی اور دوسرے چھوٹے چھوٹے دھماکوں سے کاغذات بن گئے اور پھر چند دھماکوں سے پوری کتاب مرتب ہوگئی۔

کیا اس عظیم ہستی کی خلقت کو بے شمار اسرار وحکمت کے باوجود آنکھ بند کر کے ایک حادثہ مان لینا اس تصور سے ہزار گُنا احمقانہ نہیں ہے کہ جسے ہم نے بیان کیا؟!

ہاں، ہر باہدف نظام اپنے ناظم کے عظیم ہدف پر دلالت کرتا ہے اور ایسے باھدف نظام تو اس جہان میں بے شمار ہیں کہ جن میں سب کی بازگشت ایک ہی چیز کی طرف ہے یعنی خالق حکیم

نے اس جہان کوخلق کیا ہے اوراس کی باگ ڈور سنبھال رکھی ہے۔

گلستان کے دامن میں کھلنے والا پھول اور پھولوں کا درخت ،خاک ورا کھ کی آغوش سے اپنی مختلف شکل وصورت میں سر اٹھاتا ہے سیب کا ایک تناور درخت تنہا ایک معمولی بیج کا نتیجہ ہے جو ہر سال سیکڑوں خوش ذائقہ اورلذیذ پھل عطا کرتا ہے، یہی حال بقیہ درختوں کا بھی ہے۔

اسی طرح وہ بلبل جو درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھی نغمہ سرائی کرتی ہے، انڈے کی چھال توڑ کر باہر آنے والا چوزہ زمین پر دانے چگنے کے لئے نوک مارتا ہے یا گائے کا پیدا ہونے والا بچھڑا سیر ہونے کے لئے اپنی ماں کے پستان ڈھونڈ ھتا ہے یا نوزاد (نومولود) کی بھوک مٹانے کے لئے ماؤوں کے پستان میں اترنے والا دودھ یہ سب کچھ اسی کی آشکار نشانیاں ہیں۔

واقعاً آپ تصور کریں کہ نومولود کے متولد ہوتے ہی ماں کے پستان میں دودھ کا آجانا کیسا مرتب اور دقیق نظام ہے۔

وہ مچھلیاں جو انڈے دینے کے لئے پہلی مرتبہ سیکڑوں کیلومیٹر کا راستہ طے کرتی ہیں یا وہ پرندے جو دریائی گھاس پھوس میں اپنے گھونسلوں کو بخوبی پہچان لیتے ہیں یہاں تک کہ ایک بار بھی بھولے سے کسی دوسرے کے گھونسلے میں قدم نہیں رکھتے یا پھر شہد کی مکھیاں جو خوشبودار پھولوں کے رسوں کو حاصل کرنے کے لئے صبح اپنے آشیانے (چھتہ) سے باہر آتی ہیں، طولانی مسافتوں کو طے کرتی ہیں اور شام ہوتے ہی مستقیم طور پر اپنے (چھتہ) لوٹ آتی ہیں... یہ سب کی سب اس کی نشانیاں ہیں، اورسب سے زیادہ عجیب مسئلہ تو یہ ہے کہ شہد کی مکھیاں اور گائے ،بھینس ،بھیڑ، بکریاں اپنی احتیاج سے کہیں زیادہ دودھ اورشہد دیتی ہیں تا

کہ خدا کا برگزیدہ انسان اس سے استفادہ کرسکے۔

خود انسان کے بدن میں نہایت پیچیدہ اور حکیمانہ نظام قابل مشاہدہ ہیں منظم مجموعوں سے بدن کی ترکیب اور ہر مجموعہ کا متناسب اعضا سے مرکب ہونا اور ہر عضو کا لاکھوں زندہ خلیوں سے ترکیب پانا جبکہ یہ سب کے سب تنہا ایک خلیہ سے پیدا ہوئے ہیں اور ان تمام خلیوں کا ایک خاص ترکیبات سے وجود میں آنا اور پھر ہر عضو بدن کا ایک خاص مقام پر واقع ہونا، اور تمام اعضاء بدن کا کسی خاص ھدف کے تحت حرکت کرنا، جیسے پھیپھڑوں کے ذریعہ اکسیجن کا حاصل کرنا اور پھر خون کے گلبل (globule) کے ذریعہ انھیں بدن کے مختلف اعضاء تک پہنچ جانا نیز ایک معین مقدار میں جگر کے ذریعہ قند کی کمی کو پورا کرنا، نئے خلیوں کی پیدائش کے ذریعہ آسیب دیدہ عضلات کو بدلنا اور مختلف غدوں سے حاصل ہونے والے ہارمون اور سفید گلبل کے ذریعہ ضرررساں جراثیم سے مقابلہ جو بدن کو منظم رکھنے اور اس کی حیات کو باقی رکھنے کے لئے نمایاں کام انجام دیتے ہیں... یہ سب کی سب خداوند متعال کی نشانیاں ہیں، اور یہ عجیب نظام ہے کہ سیکڑوں سال گذرنے کے بعد ہزاروں دانشمند اس نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے کہ یہ تمام امور کس کے وسیلہ سے برقرار ہیں۔

ہر خلیہ اپنے چھوٹے سسٹم کے ساتھ کسی نہ کسی ھدف کے تحت اور خلیوں کا ہر دستہ ایک ایسے عضو کو تشکیل دیتا ہے جو خود با ھدف نظام ہے اور ایسے سیکڑوں سسٹم اپنی پیچیدگیوں کے ساتھ پورے ایک بدن پر حاکم ہیں، سلسلہ یہیں پر تمام نہیں ہوتا، بلکہ موجودات کے اندر ایسے ہزاراں اور لاکھوں سسٹم ایسی بے کراں ہستی کو تشکیل دیتے ہیں جسے جہان طبیعت کا نام دیا

جا تا ہے جو نظم و کمال کے ساتھ حکیم واحد کے ہاتھوں جاری و ساری ہیں۔اور یہ بات واضح و روشن ہے کہ علم و دانش جتنا بھی پیشرفت اور ترقی کرے گا اتنے ہی حکمت الٰہی کے اسرار و رموز آشکار ہوتے جائیں گے اور یہی نشانیاں پاک نفس اور صاف طبیعت والوں کے لئے کافی ہیں۔

سوالات

١۔خداشناسی کی مختلف راہیں اور خصوصیات بیان فرمائیں؟
٢۔خداشناسی کا آسان راستہ کیا ہے؟اور اس کی خصوصیات کیا ہیں؟
٣۔موجودات عالم کی باھدف نشانیاں، بسط و تفصیل سے بیان کریں؟
٤۔دلیل نظم کی منطقی شکل بیان کریں؟

ساتواں درس

واجب الوجود کا اثبات

مقدمہ

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے

متن برہان

امکان اور وجوب

علت و معلول

علتوں کے تسلسل کا محال ہونا

تقریر برہان

مقدمہ

ہم نے گذشتہ دروس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اسلامی فلاسفہ اور متکلمین نے خدا کے وجود کے ثابت کرنے کے لئے بہت سے دلائل اور براہین ذکر کئے ہیں جو فلسفہ و کلام کی بسیط کتابوں میں موجود ہیں، ہم ان تمام براہین میں سے ایک ایسے برہان کو بیان کریں گے کہ جسے سمجھنے کے لئے معمولی مقدمات کی ضرورت ہے، اور جس کا سمجھنا آسان ہے۔ لیکن یہ

مطلب واضح رہے کہ یہ دلیل صرف خدا کے وجود کو (واجب الوجود) ہونے کے اعتبار سے ثابت کرتی ہے یعنی وہ ایسا موجود ہے کہ جس کا وجود ضروری اور کسی پیدا کرنے والے سے بے نیاز ہے، اور ہم بقیہ صفات (ثبوتیہ وسلبیہ) جیسے علم وقدرت جسم کا نہ ہونا، زمان ومکان سے بے نیاز ہونا وغیرہ کو دوسرے دلائل کے ذریعہ ثابت کریں گے۔

متن برہان۔

کوئی بھی موجود عقلی، فرض کی بنیاد پر یا واجب الوجود ہے یا ممکن الوجود، ان دو صورتوں سے خارج نہیں ہے لہٰذا تمام موجودات کو ممکن الوجود نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ ممکن الوجود کے لئے علت کا ہونا ضروری ہے اور اگر تمام علتیں ممکن الوجود ہوں اور یہ سب کی سب کسی دوسری علت کی محتاج ہوں تو پھر کبھی کوئی موجود متحقق نہیں ہوسکتا، یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق علتوں کا تسلسل محال ہے لہٰذا مجبوراً علتوں کا تسلسل ایک ایسے موجود پر تمام ہونا چاہیے کہ جو کسی دوسرے موجود کا معلول نہ ہو یعنی وہ واجب الوجود ہو۔

یہ دلیل اثبات خدا کے لئے تمام دلیلوں میں ہر ایک سے آسان ہے جو چند عقلی مقدمات پر مشتمل ہے، جسے سمجھنے کے لئے کسی بھی حسی اور تجربی مقدمہ کی ضرورت نہیں ہے، لیکن چونکہ اس دلیل میں فلسفی مفاہیم اور اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے، لہٰذا بہتر ہے کہ ان اصطلاحات اور مقدمات کہ جن سے یہ دلیل مرتب ہوئی ہے وضاحت کردی جائے۔

امکان اور وجوب۔

ایک معمولی قضیہ آسان ہونے کے باوجود، دو اساسی مفہوم (موضوع ومحمول) سے تشکیل پاتا ہے، جیسے یہ قضیہ ٭ خورشید منور ہے،، خورشید کے منور ہونے پر دلالت کرتا ہے اس میں٭٭ خورشید،، موضوع اور ٭ منور،، محمول ہے۔

موضوع کے لئے محمول کا ثابت ہونا تین حالتوں سے خارج نہیں ہے یا محال ہے جیسے یہ کہا جائے تین کا عدد چار کے عدد سے بڑا ہے،، یا ضروری ہے جیسے یہ جملہ دو چار کا نصف ہے،، یا پھر نہ ہی محال ہے اور نہ ہی ضروری جیسے کہ خورشید ہمارے سروں پر پہنچ چکا ہے،، منطقی اصطلاح کے مطابق صورت اول میں نسبت قضیہ وصف امتناع،، اور دوسری صورت میں وصف ضرورت،، یا وجوب،، اور تیسری صورت میں وصف امکان،، اپنے خاص مضامین،، سے متصف ہے۔

لیکن چونکہ فلسفہ میں (وجود) کے سلسلہ میں بحث کی جاتی ہے اور جو شئ ممتنع ومحال ہو کبھی بھی وجود خارجی سے متصف نہیں ہوسکتی، لہٰذا فلاسفہ نے موجود کو فرض عقلی کی بنیاد پر واجب الوجود اور ممکن الوجود میں تقسیم کر دیا ہے، واجب الوجود یعنی ایک ایسا موجود جو خود بخود وجود میں آجائے اور کسی دوسرے وجود کا محتاج نہ ہو، لہٰذا ایسا موجود ہمیشہ ازلی وابدی ہوگا اس لئے کہ کسی چیز کا معدوم ہونا اور کسی زمانہ میں نہ ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا وجود خود سے نہیں ہے بلکہ موجود ہونے کے لئے

اُسے کسی دوسرے موجود کی ضرورت ہے جو اس کے متحقق اور موجود ہونے کی شرط ہے یا اس

کے فاقد ہوتے ہی اس کا مفقود ہونا ضروری ہے اور ممکن الوجود یعنی ایک ایسا موجود کہ جس کا وجود خود سے نہ ہو بلکہ اسے موجود ہونے کے لئے کسی دوسرے موجود کی ضرورت ہو۔

یہ تقسیم جو فرض عقلی کی بنیاد پر کی گئی ہے ایک ایسے وجود کی نفی کرتی ہے کہ جو ممتنع الوجود بالضرورۃ ہو، لیکن یہ اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ خارجی موجودات ممکن الوجود ہیں یا واجب الوجود یا دوسرے الفاظ کے مطابق اس قضیہ کا صادق ہونا تین صورتوں میں تصور کیا جاسکتا ہے، ایک یہ کہ ہر موجود واجب الوجود ہو، دوسرے یہ کہ ہر موجود ممکن الوجود ہو، تیسرے یہ کہ بعض موجودات ممکن الوجود اور بعض واجب الوجود ہوں، پہلے اور تیسرے فرض کی بنیاد پر واجب الوجود کا پایا جانا ثابت ہے لہذا اس فرضیہ کے سلسلہ میں تحقیق کرنا ہوگی کہ کیا ممکن ہے کہ تمام موجودات ممکن الوجود ہوں یا ایسا ہونا غیر ممکن ہے؟ اس فرضیہ کو باطل کرنے کے ذریعہ واجب الوجود کا وجود بطور قطعی ثابت ہوسکتا ہے، اگر چہ وحدت اور بقیہ صفات کو ثابت کرنے کے لئے دوسرے دلائل کی ضروت ہے۔

لہٰذا دوسرے فرضیہ کو باطل کرنے کے لئے ایک دوسرے مقدمہ کو اس برہان میں شامل کرنا ہوگا، اور وہ یہ ہے کہ تمام موجود کا ممکن الوجود ہونا محال ہے، لیکن چونکہ یہ مقدمہ بدیہی اور آشکار نہیں ہے لہٰذا اس طرح اسے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ممکن الوجود کو علت کی ضرورت ہے اور علتوں میں تسلسل محال ہے لہذا اس صورت میں علتوں کے تسلسل کو ایک ایسے موجود پر ختم ہونا ہوگا کہ جو کسی دوسری علت کا محتاج نہ ہو یعنی واجب الوجود ہو، یہیں سے فلسفی مفاہیم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ جس کی وضاحت کرنا نہایت ضروری ہے۔

علت اور معلول۔

اگر کوئی موجود کسی دوسری موجود کا محتاج ہو، اور اس کا وجود دوسرے کے وجود پر منحصر ہوتو اسے فلسفہ کی اصطلاح میں محتاج موجود کو معلول،، اور دوسرے کو علت،، کہا جا تا ہے، لیکن علت کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ مطلقاً محتاج نہ ہو، بلکہ وہ خود بھی کسی دوسری علت کی طرف نسبت دیتے ہوئے معلول اور اس کی محتاج ہو، اگر علت کسی بھی نیاز مندی سے مبرّ ا ہوتو اسے علت مطلق کہا جا تا ہے۔

یہاں تک ہم فلسفی اصطلاح علت ومعلول اور ان کی تعریفوں سے آشنا ہوئے ہیں، اب اس کے بعد اس مقدمہ کی وضاحت ضروری ہے (کہ ہر ممکن الوجود کو علت کی ضرورت ہے) چونکہ ممکن الوجود کا وجود خود سے نہیں ہوتا لہٰذا وہ اپنے متحقق ہونے کے لئے کسی دوسرے موجود کا محتاج ہے، اس لئے کہ یہ قضیہ بدیہی اور آشکار ہے کہ ہر وہ محمول جسے موضوع کے لئے انتخاب کیا جا تا ہے یا تو، وہ خود بخود (بالذات) ثابت ہے، یا کسی دوسرے کی وجہ سے (بالغیر) اس کا ثبوت ہے جیسے کہ ایک شی یا تو خود بخود روشن ہے یا پھر کسی دوسری شی کی وجہ سے روشن ہوتی ہے، اور اس طرح ایک جسم یا تو خود بخود روغنی ہے یا پھر کسی دوسری شی کے ذریعہ اسے روغنی بنایا گیا ہے، لہٰذا یہ امر محال ہے کہ کوئی شئینہ تو خود بہ خود روشن ہو، نہ ہی کسی شی کی وجہ سے روشن ہوئی ہو، درآں حالیکہ وہ روشن ہے، اسی طرح ایک جسم نہ خود بہ خود بالذات روغنی ہو اور نہ ہی کسی دوسری شی کی وجہ سے روغنی ہوا ہو، اور اس کے باوجود بھی روغنی ہوتو یہ

محال ہے۔

پس ایک موضوع کے لئے وجود کا ثابت ہونا یا تو بالذات ہے یا بالغیر ،اگر بالذات نہیں ہے تو ضرور بالغیر ہے، لہٰذا ہر ممکن الوجود جو خود بخو د وجود سے متصف نہیں ہوا ہے وہ حتماً دوسری شی کے ذریعہ فیض وجود سے مستفیض ہوگا ، پس یہ وہی مسلمہ حقیقت کہ جسکو ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ ہر ممکن الوجود علت کا محتاج ہے لیکن بعض لوگوں نے یہ گمان کرلیا ہے کہ اصل علیت کا معنی یہ ہے کہ (ہر موجود علت کا محتاج ہے) لہٰذا ان لوگوں نے یہ اشکال کیا ہے کہ پھر خدا کے لئے بھی علت ہونی چاہیے،

لیکن وہ لوگ اس نکتہ سے غافل ہیں کہ اصل علیت (موجود) بطور مطلق نہیں ہے بلکہ اس کا موضوع (ممکن الوجود) اور (معلول) ہے یا دوسری تعبیر کے مطابق ہر موجود محتاج علت کا محتاج ہے نہ ہر موجود۔

علتوں کے تسلسل کا محال ہونا۔

اس مقدمہ میں وہ آخری برہان جس کا استعمال ہوا ہے وہ یہ ہے کہ علتوں کا سلسلہ ایک ایسے موجود پر تمام ہو جو خود کسی کا معلول نہ ہو اس لئے کہ علتوں کا یہ نہایت تسلسل محال ہے اور اس طرح واجب الوجود کا وجود ثابت ہو جا تا ہے علت خود بخو د موجود ہے اور کسی دوسرے وجود کی محتاج نہیں۔

فلاسفہ نے تسلسل کو باطل کرنے کے لئے متعدد دلیلیں پیش کی ہیں لیکن حقیقیت تو یہ ہے کہ

علتوں کے سلسلہ میں تسلسل کا باطل ہونا آشکار ہے جو ایک معمولی تفکر سے سمجھ میں آجاتا ہے، یعنی چونکہ وجود معلول علت سے وابستہ اور اسی کے ذریعہ قائم ہے، اگر یہ فرض کرلیں کہ اس کی معلولیّت عمومی ہے تو اس صورت میں کوئی موجود وجود میں نہیں آسکتا، اس لئے کہ چند وابستہ موجودات کا ان کے مقابل موجود کے وجود ہونے کے بغیر فرض کرنا معقول نہیں ہے۔

آپ یہ فرض کریں کہ دوڑ کے میدان میں ایک ٹیم طے کی جانے والی مسافت کے آغاز میں کھڑی ہے، اور سب کے سب دوڑنے کے لئے بالکل آمادہ ہیں، لیکن ہر ایک کا یہی ارادہ ہے کہ جب تک دوسرا نہیں دوڑتا وہ بھی نہیں دوڑے گا، یہ ارادہ اگر واقعاً عمومیت سے متصف ہو تو پھر ان میں سے کوئی بھی دوڑنے کے لئے قدم نہیں اٹھا سکتا، اسی طرح اگر ہر موجود کا وجود میں آنا دوسرے موجود کے وجود میں آنے پر منحصر ہو تو پھر کبھی بھی کوئی موجود وجود میں نہیں آسکتا، لہٰذا خارجی موجودات کا وجود میں آنا، اس بات کی علامت ہے کہ کوئی بے نیاز او غنی موجود ہے۔

تقریر برہان۔

گذشتہ بیان کئے گئے مقدمات کی روشنی میں ایک بار پھر اسی برہان کا تکرار کرتے ہیں ہر وہ چیز جسے موجود کہا جا سکتا ہو وہ دو حال سے خارج نہیں، یا تو اس کے لئے وجود ضروری ہے یعنی وہ خود بخود موجود ہے کہ جسے اصطلاح میں (واجب الوجود) کہا جاتا ہے یا پھر اس کے لئے وجود کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ کسی دوسرے وجود کی برکت سے عالم وجود میں آیا ہے تو اسے

اصطلاح میں (ممکن الوجود) کہا جاتا ہے اور یہ بات روشن ہے کہ جس چیز کا وجود محال ہو اس کا موجود ہونا غیر ممکن اور کسی بھی صورت میں اسے موجود کا نام نہیں دیا جا سکتا لہٰذا ہر موجود یا واجب الوجود ہے یا ممکن الوجود۔

مفہوم (ممکن الوجود) میں غور و فکر کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شی بھی اس مفہوم کی مصداق بنے وہ علت کی محتاج ہوگی، اس لئے کہ جب کوئی موجود خود بخود موجود میں نہ آیا ہو تو مجبوراً کسی دوسرے موجود کے ذریعہ وجود میں آیا ہے جیسا کہ ہر وہ وصف جو بالذات نہ ہو تو اس کا بالغیر ہونا ضروری ہے اور قانون علیّت کا مفاد بھی یہی ہے کہ ہر وابستہ اور ممکن الوجود، کسی نہ کسی علت کا محتاج ہے کیا یہ کہنا درست ہے کہ بے علت خدا پر اعتقاد رکھنا قانون علیت کو توڑنا ہے!

اور اگر ہر ممکن الوجود علت کا محتاج ہو تو کسی بھی حال میں کوئی موجود محقق نہیں ہو سکتا، یہ فرض بالکل اسی طرح ہے جسمیں ہر فرد اگر اپنے اقدام کو دوسرے کے آغاز پر مشروط کر دے تو پھر کسی قسم کا کوئی اقدام وقوع پذیر نہیں ہو سکتا، لہذا خارجی موجودات کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی واجب الوجود موجود ہے۔

سوالات

۱۔امکان اور وجوب کی اصطلاح کو منطقی اور فلسفی اعتبار سے بیان کریں؟

۲۔واجب الوجود اور ممکن الوجود کی تعریف کریں؟

۳۔تقسیم عقلی کی بنیاد پر واجب الوجود اور ممکن الوجود کی کتنی صورتیں فرض کی جاسکتی ہیں؟

٤۔علت اور معلول کی تعریف کریں؟

٥۔اصل علیّت کا مفاد کیا ہے؟

٦۔کیوں ہر ممکن الوجود کے لئے علت کی ضرورت ہے؟

۷۔کیا اصل علیّت کا تقاضہ یہ ہے کہ خدا کے لئے بھی کسی علت کا ہونا ضروری ہے؟ کیوں؟

۸۔کیا بدون خالق خدا پر اعتقاد اصل علیت کا نقض کرنا ہے؟

۹۔علتوں کے درمیان تسلسل کے محال ہے، بیان فرمائیں؟

۱۰۔اس برہان کی شکل منطقی کو بیان کریں اور واضح کریں کہ اس سے کون سا مطلب ثابت ہوتا ہے۔؟

آٹھواں درس

خدا کی صفات

مقدمہ

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پہ مشتمل ہے

خدا کا ازلی وابدی ہونا

صفات سلبیہ

موجودات کو وجود بخشنے والی علت

موجودات کو وجود بخشنے والی علت کی خصوصیات

مقدمہ

گذشتہ دروس میں ہم نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ فلسفی دلائل کا نتیجہ ایک ایسے موجود کا ثابت کرنا ہے جو بعنوان (واجب الوجود) ہے اور دوسرے دلائل کے ذریعہ اس کے سلبی اور ثبوتی صفات کو ثابت کیا جاتا ہے تا کہ خداوند عالم اپنے مخصوص صفات کے ذریعہ مخلوقات کے دائرے سے الگ ہو کر پہچانا جائے، اس لئے کہ معرفت کے لئے صرف واجب الوجود کی حثیت سے جاننا کافی نہیں ہے، کیوں؟ اس لئے کہ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ خیال کرے کہ مادہ

یاانرجی (قوت وطاقت) بھی واجب الوجود کا مصداق بن سکتے ہیں، لہٰذااس کی سلبی صفات ثابت ہونا چاہیے تاکہ اس طرح یہ معلوم ہوجائے کہ واجب الوجود کی ذات، اُن صفات سے منزہ ہے جو مخلوقات میں پائی جاتی ہیں اوراس کی صفات مخلوقات پر صادق نہ آسکتی اسی طرح اس کی صفات ثبوتیہ کا بھی ثابت ہونا ضروری ہے تاکہ یہ ثابت ہوجائے کہ وہ لائق پرستش و عبادت ہے، اوردوسرے عقائد، نبوت، معاداورفروع کے اثبات کا راستہ آسان ہوجائے۔

گذشتہ برہان ودلیل سے یہ ثابت ہوگیا کہ واجب الوجود کوعلت کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ ممکنات کے لئے خود علت ہے، یا دوسری تعبیر کے مطابق واجب الوجود کے لئے دوصفت ثابت ہیں ایک یہ کہ وہ ہرشی سے بے نیاز ہے، اس لئے کہ اگراس میں معمولی سے احتیاج بھی پائی گئی تو وہ جس شی کا محتاج ہوگا وہ شی ءاس کی علت بن جائے گی، کیونکہ بخوبی ہمیں معلوم ہے کہ (فلسفی اصطلاح)

میں علت کے معنی یہی ہیں کہ تمام موجودات اس کے محتاج ہوں اور دوسرے یہ کہ ممکن الوجودشی اس کی طرف نسبت دیتے ہوئے معلول ہیں، اوراس کی ذات تمام اشیاءکی پیدائش کی سب سے پہلی علت ہے۔

ان دونتیجوں کے بعدان کے لوازمات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ، صفات سلبیہ اورصفات ثبوتیہ کو پیش کریں گے، البتہ انھیں ثابت کرنے کے لئے فلسفی اور کلامی کتابوں میں متعدد دلیلیں ذکر کی گئیں ہیں، اسی لئے ہم یہاں صرف یہاں بات کوآسانی سے سمجھنے کے لئے اور سلسلہ کلام کوربط دیتے ہوئے انھیں دلائل کوذکرکریں گے جوگذشتہ براہین سے مربوط ہوں۔

خدا کا ازلی و ابدی ہونا۔

اگر کوئی موجود کسی دوسرے موجود کا معلول اور اس کا محتاج ہو تو پھر اس کا وجود اسی کا تابع کہلائے گا اور علت کے جاتے ہی اس کا وجود مٹ جائے گا، یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ کسی بھی موجود کا معدوم ہو جانا، اس کے ممکن الوجود ہونے کی علامت ہے، اور چونکہ واجب الوجود کا وجود خود بخود ہوتا ہے اور وہ اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں ہوتا ہے لہٰذا وہ ہمیشہ ہمیشہ باقی بھی رہے گا۔

اس طرح واجب الوجود کے لئے دو صفتیں اور ثابت ہوتی ہیں، ایک اس کا ازلی ہونا، یعنی گذشتہ ادوار میں بھی تھا، اور دوسرا ابدی ہونا یعنی وہ مستقبل میں بھی باقی رہے گا، اور کبھی کبھی ان دونوں اصطلاحوں کو ایک کلمہ (سرمدی) کے تحت بیان کیا جاتا ہے۔

لہذا ہر وہ موجود جس میں سابقۂ عدم یا امکان زوال ہو وہ کبھی بھی واجب الوجود نہیں ہو سکتا لہذا اس طرح سے تمام مادی قضایا کے واجب الوجود ہونے کا مفروضہ باطل ہو جاتا اور اس کا باطل ہونا بہت زیادہ واضح و روشن ہے۔

صفات سلبیہ۔

واجب الوجود کے لوازمات میں سے ایک صفت بساطت اور اس کا مرکب نہ ہونا ہے، اس لئے کہ ہر مرکب شی کا اس کے اجزا کی جانب محتاج ہونا واضح ہے، جبکہ واجب الوجود ہر قسم کی

احتیاج سے مبرا ہے۔

اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ واجب الوجود کے اجزا بالفعل نہیں ہیں، بلکہ ایک لکیر کے ضمن میں دو لکیروں کا فرض کرنا ہے، تو یہ فرض بھی باطل ہے، اس لئے کہ وہ چیز جو بالقوہ اجزا کی مالک ہو وہ عقلاً تجزیہ کے قابل ہوگی، اگر چہ وہ خارج میں متحقق نہ ہو اور تجزیہ کے ممکن ہونے کا مطلب تمام امکان کا زائل ہونا ہے، چنانچہ اگر ایک میٹر لمبی لکیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کے بعد وہ ایک میٹر لمبی لکیر نہیں رہ سکتی، اور یہ مطلب ہمیں پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ واجب الوجود کے لئے زوال نہیں ہے۔

اور چونکہ بالفعل اجزا سے مرکب ہونا اجسام کا خاصہ ہے، لہٰذا اس سے یہ مطلب بھی واضح جاتا ہے کہ کوئی بھی جسمانی موجود واجب الوجود نہیں ہوسکتا یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق اس کے ذریعہ خدا کا مجرد ہونا اور جسمانی نہ ہونا ثابت ہو جاتا ہے، نیز یہ مطلب بھی روشن ہو جاتا ہے کہ ذات خداوند متعال کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا اور ظاہری وسائل سے محسوس نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ محسوس ہونا اجسام وجسمانیات کے خواص میں سے ہے جسمانیت کی نفی کے ذریعہ اجسام کے اپنے تمام خواص جیسے مکان و زمان سے متعلق ہونا بھی واجب الوجود سے سلب ہو جاتا ہے، اِس لئے کہ مکان اُس کے لئے متصور ہے جس میں حجم و امتداد ہو، اسی طرح ہر وہ شی جس میں زمانہ پایا جاتا ہو وہ لحظہ اور امتداد زمانہ کے لحاظ سے قابل تجزیہ ہے اور یہ بھی ایک قسم کا امتداد اور اجزا بالقوہ کی ترکیب ہے، لہٰذا خدا کے لئے مکان و زمان کا تصور باطل ہے اور کوئی بھی مکان و زمان سے متصف موجود واجب الوجود نہیں ہوسکتا۔

سرانجام، واجب الوجود سے زمان کی نفی کے ذریعہ حرکت وتغیر اور تکامل (کمال کی طرف جانے) کا تصور بھی باطل ہوجاتا ہے، اس لئے کہ زمان کے بغیر کوئی بھی حرکت اور تغیر غیر ممکن ہے۔

لہٰذا وہ لوگ جو خدا کے لئے مکان ، جیسے عرش کے قائل ہوئے ہیں، یا اس سے حرکت اور آسمان سے نزول کی نسبت دی ہے یا اُسے آنکھوں سے قابل دید سمجھا ہے، یا اسے قابل تغیر اورحرکت جانا ہے، دراصل ان لوگوں نے خدا کو بخوبی درک نہیں کیا ہے۔(۱)

کلی طور پر ہر وہ مفہوم جو کسی بھی انداز میں نقص ،محدودیت یا احتیاج پر دلالت کرے خدا کے لئے منتفی ہے،اور صفات سلبیہ کا مطلب بھی یہی ہے۔

موجودات کو وجود بخشنے والی علت۔

گذشتہ دلیل کے ذریعہ جو مطلب واضح ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ واجب الوجود ممکنات کی پیدائش کا سبب ہے، اب اس کے بعد اس مطلب کے دوسرے پہلو کے سلسلہ میں بحث کریں گے، پہلے مرحلہ میں علت کی اقسام کی ایک مختصر وضاحت کرنے کے بعد علیّت الٰہی کی خصوصیات بیان کریں گے۔

علت اپنے عام معنی میں ہر اس موجود کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی دوسرے موجود سے وابستہ اور اس کے مدمقابل ہو، یہاں تک کہ یہ شروط اور مقدمات (۲) کو بھی شامل ہے اور خدا کے علت نہ رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی بھی موجود سے وابستہ نہیں ہے، یہاں تک کہ اس کے

لئے کسی قسم کی شرط یا معدی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

....

(۱) مکان رکھنا، آسمان سے نازل ہونا اور آنکھوں سے دیکھائی دینے کا عقیدہ بعض اہل سنت کا ہے، تغیر و تکامل کا نظریہ فلاسفہ غرب کی ایک جماعت کا ہے جن میں سے ھگل، برگسون اور ویلیام جیمز ہیں، لیکن یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تغیر اور حرکت کی نفی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ساکن ہے بلکہ اس کی ذات کے ثبات کے معنی میں ہے اور ثبات، تغیر کی نقیض ہے، لیکن سکون حرکت کے مقابلہ میں عدم ملکہ ہے، اور اس چیز کے علاوہ کہ جس میں حرکت کی قابلیت ہو کسی دوسری شی کے لئے نہیں بولا جاتا

(۲) علل اعدادی کو کہا جاتا ہے۔

لیکن مخلوقات کے مقابلہ میں خدا کے علت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خلقت کو وجود بخشنے والا ہے، جو علیت فاعلی کی ایک خاص قسم ہے، اس مطلب کی وضاحت کے لئے ہم مجبور ہیں کہ علت کی اقسام کو اجمالاً بیان کریں، اور اس کی تفصیلی وضاحت کو فلسفی کتابوں کے حوالہ کرتے ہیں۔

ہمیں یہ بخوبی معلوم ہے کہ ایک سبرے کے اُگنے اور بڑھنے کے لئے مناسب بیج، زمین، خاک، آب و ہوا وغیرہ کی ضرورت ہے، اور یہ بھی طبیعی ہے کہ اسے کوئی زمین میں بوئے، اور اس کی آبیاری کرے، مذکورہ علت کی تعریف کے مطابق جو کچھ ذکر کیا گیا وہ سبزے کے رشد و نمو کی علتیں ہیں۔

ان مختلف علتوں کومختلف نظریات اور عقائد کے تحت چند اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جیسے علتوں کا وہ مجموعہ کہ جس کا وجود معلول کے لئے ہمیشہ ہونا ضروری ہے (علت حقیقی) اور علتوں کا وہ مجموعہ کہ جس کی بقا، معلول کی بقا کے لئے لازم نہیں ہے (جیسے سبزہ کے لئے کسان) (علت اعدادی) یا (معدات) کہا جاتا ہے، اسی طرح جانشین پذیز علتوں کو (علت جانشینی) اور بقیہ علتوں کو (کلت انحصاری) کا نام دیا جاتا ہے۔

لیکن ایک علّت اور بھی ہے جو ان تمام علتوں سے متفاوت ہے جسے سبزہ کی رشد کے لئے ذکر کیا گیا ہے، جسے بعض نفسانی قضایا میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، جب انسان اپنے ذہن میں کسی کی صورت کوخلق کرتا ہے یا کسی امر کے انجام دینے کا ارادہ بناتا ہے تو اس کے ساتھ فوراً ہی ایک نفسانی اثر بنام (صورت ذہنی) اور (ارادہ) متحقق ہوتا ہے کہ جس کا وجود، نفس کے وجود سے وابستہ ہے اسی وجہ سے اُسے اس کا معلول مانا جاتا ہے، لیکن معلول کی یہ قسم ایسی ہے کہ جو اپنی علت سے کسی بھی اعتبار سے مستقل و بے نیاز نہیں ہے اور وہ کبھی بھی اس سے جدا ہوکر مستقل نہیں رہ سکتی، اس کے علاوہ نفس کی فاعلیّت، صورت ذہنی یا ارادہ کی طرف نسبت دیتے ہوئے ان شرائط سے مشروط ہے کہ جس کی وجہ سے نقص، محدودیّت اور ممکن الوجود ہونا لازم آتا ہے، لہٰذا جہان کے لئے واجب الوجود کی فاعلیت قضایائے ذھنی کے لئے نفس کی فاعلیت سے بالاتر ہے کہ جس کی نظیر تمام فاعلوں میں نہیں ملتی اس لئے کہ وہ کسی بھی احتیاج کے بغیر اپنے اس معلول کو وجود میں لاتا ہے کہ جس کی تمام ہستی اس سے وابستہ ہے۔

وجود بخشنے والی علت کی خصوصیات۔

اب تک جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کے مطابق وجود آ) فرین علت (وجود بخشنے والی علت) کی چند خصوصیات بیان کی جاسکتی ہیں۔

۱۔علت وجود آفرین کو اپنے معلولات کے تمام کمالات سے بنحو احسن و اکمل متصف ہونا ضروری ہے تا کہ وہ ہر موجود میں اس کی ظرفیت کے مطابق اضافہ کر سکے برخلاف علت مادی،،وعلتمعدی،، کہ وہ فقط اپنے معلولات میں تغیر وتحول ایجاد کرتی ہے،اس کے لئے لازم نہیں ہے وہ ان تمام کمالات کے مالک ہوں جیسے کہ خاک کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ اس میں سبزہ کی تمام خصوصیات ہوں، یاماں باپ اپنی اولاد کی خصوصیات سے متصف ہوں،لیکن وجود آفرین خدا کا اپنی بساطت کے باوجود تمام کمالات وجودی سے متصف ہونا ضروری ہے۔(۱)

۲۔علّت وجود آفرین اپنے معلول کو عدم سے وجود میں لاتا ہے اور اس کی خلقت کے ساتھ اس میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی،لیکن فاعل طبیعی کا حال بالکل اس سے متفاوت ہے کہ جن کا کام صرف معلول کے میں تغیر ایجاد کرنا اور قوت و طاقت صرف کرنا ہے اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ مخلوقات کی خلقت سے واجب الوجود سے کوئی چیز کم ہوجاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ذات الٰہی میں تجزیہ پذیری ممکن ہے جبکہ اس کا باطل ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

۳۔علت وجود آفرین ایک حقیقی علت ہے جسکا معلول کی بقا کے لئے باقی رہنا ضروری ہے لیکن علت اعدادی میں معلول کی بقا،علت کی بقا سے وابستہ نہیں ہے۔

....

(۱) یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مخلوقات کے کمالات کے حاصل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے مفاہیم (جیسے مفہوم جسم وانسان) بھی خدا پر قابل صدق ہوں، اس لئے کہ ایسے مفاہیم محدوداور ناقص موجودات پر دلالت کرتے ہیں، اسی وجہ سے خدا پر قابل صدق نہیں ہیں کہ جو بے نہایت کمالات کا مالک ہے۔

لہٰذا جو کچھ بھی بعض اہل سنت کے متکلمین سے نقل ہوا ہے کہ عالم اپنی بقا میں خدا کا محتاج نہیں ہے، یا بعض اقوال جو غربی فلاسفہ سے نقل ہوئے ہیں کہ جہان طبیعت کی مثال ایک گھڑی کی طرح ہے ہمیشہ کے لئے اس میں چابی بھر دی گئی ہے جسے اپنی حیات کو جاری رکھنے کے لئے خدا کی ضرورت نہیں ہے یہ سب کچھ حقیقت کے برخلاف ہے بلکہ جہان ہستی ہمیشہ ہر دور اور تمام حالات میں خدا کی محتاج ہے، اور اگر وہ (حق تعالی) ایک لحظہ کے لئے بھی افاضہ ہستی سے نظر پھیر لے، تو اس کا وجود مٹ جائیگا۔

سوالات

۱۔صفات خدا کی پہچان کیوں ضروری ہے؟

۲۔گذشتہ برہان سے کیا نتیجہ حاصل ہوتا ہے؟

۳۔خدا کے ازلی وابدی ہونے کو ثابت کریں؟

٤۔کس طرح ذات خدا کے بسیط ہونے اور اجزا بالفعل و بالقوہ سے مبرا ہونے کو ثابت کیا جاسکتا ہے؟

٥۔خدا کے جسمانی نہ ہونے کی دلیل کیا ہے؟

٦۔کیوں خدا کو دیکھا نہیں جاسکتا؟

۷۔کس دلیل کی بنیاد پر خدا مکان و زمان نہیں رکھتا؟

۸۔کیا حرکت وسکون کو خدا سے نسبت دی جاسکتی ہے؟ کیوں؟

۹۔علت کی قسمیں بیان کریں؟

۱۰۔علّت وجود آفرین کی خصوصیات کی شرح بیان کریں؟

نواں درس

صفات ذاتیہ

مقدمہ

صفات ذاتیہ اور فعلیہ

صفات ذاتیہ کا اثبات

حیات

علم

قدرت

مقدمہ

ہمیں یہ معلوم ہے کہ خداوند عالم علت وجود آفرین کائنات ہے، جس میں تمام کمالات جمع ہیں اور موجودات میں پائی جانے والی تمام صفتیں اور کمالات اسی کی ذات سے وابستہ ہیں، لیکن بندوں میں کمالات کے افاضہ سے اس کے اندر کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، تقریب ذہن کے لئے اس مثال کا سہارا لیا جاسکتا ہے، کہ استاد اپنے شاگرد کو جو کچھ اپنے علم سے فائدہ پہنچا تا ہے اس کی وجہ سے استاد کے علم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، البتہ خدا کی جانب سے وجود اور وجودی کمالات کا افاضہ اس مثال سے کہیں زیادہ بالاتر ہے، شاید اس ضمن میں سب سے

واضح تعبیر یہ ہو کہ عالم ہستی ذات مقدس الٰہی کا جلوہ ہے، جسے اس آیت کریمہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے،

(اللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالارضِ).(۱)

خداتو سارے آسمان اورزمین کا نور ہے

....

(۱) سورۂ نور، آیت/ ۳۵.

الٰہی کمالات کے لامتناہی ہونے کے پیشِ نظر ہروہ مفہوم جونقص ومحدودیت سے پاک ہواور کمال ہونے پر دلالت کرتا ہو اسے خدائے وحدہ لاشریک کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ قرآنی آیات اور ائمہ معصومین کی طرف سے صادر ہونے والی احادیث، ادعیہ، اور مناجاتوں میں نور، کمال، جمال، محبت اور بہجت جیسے مفاہیم استعمال ہوئے ہیں، لیکن جو کچھ فلسفہ وکلام کتابوں میں صفات الٰہی کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، ان کی دوقسمیں ہیں، (صفات ذاتیہ اورفعلیہ) لٰہذا پہلے مرحلہ اول میں اس تقسیم کی وضاحت کے بعد، ان میں سے اہم ترین صفات کے سلسلہ میں بحث کریں گے۔

صفات ذاتیہ اور فعلیہ۔

وہ صفات جسے خدا کی ذات سے نسبت دی جاتی ہے وہ یاتو وہ مفاہیم ہیں جوذات احدیت میں موجودہ کمالات سے حاصل ہوتے ہیں جیسے حیات، علم اورقدرت، یا پھر وہ مفاہیم ہیں جو

عبداور معبود کے درمیان رابطہ سے حاصل ہوتے ہیں جیسے خالقیت ، رازقیت، لہٰذا پہلی قسم کو صفات ذاتیہ اور دوسری قسم کو صفات فعلیہ کہا جاتا ہے۔

صفات کی ان دوقسموں میں فرق یہ ہے کہ پہلی قسم میں، خداان صفات کے لئے عینی مصداق ہےلیکن دوسری قسم میں خالق ومخلوق کے درمیان موجودہ نسبت کی حکایت ہے، ذات الٰہی اورمخلوقات دوطرفہ حثیت سے پہچانے جاتے ہیں، جیسے کہ صفت خالقیت مخلوقات کی ذات ،وجودخدا سے وابستگی کی بنا پراخذ ہوتی ہےاوراس نسبت کی تشکیل اس کی دوطرفہ، خدا، ومخلوق سے ہوتی ہے خارج میں ذات مقدس الٰہی اورمخلوقات کے علاوہ کسی تیسری شی ءکا کوئی وجود نہیں ہے، البتہ خداوند متعال خلقت کی قدرت سے متصف ہےلیکن (قدرت)اس کی ذاتی صفات میں سے ہےاورخلق کرنا، ،ایک ایسا مفہوم ہے جواضافی ہونے کے ساتھ مقام فعل سےظہور میں آتا ہے، اسی وجہ سے (خالقیت) کا شمارصفات فعلیہ میں کیا جاتا ہے،مگر یہ کہ (خلق پرقادر) ہونے کے معنی لئے جائیں تو اس صورت میں اس کی بازگشت بھی صفت قدرت کی طرف ہوگی۔

حیات، وعلم اورقدرت خدا کی مہم ترین صفات ذاتیہ میں سے ہیں،لیکن اگرسمیع وبصیر بہ معنی ،سنی اوردیکھی جانے والی چیزوں کا علم رکھنے والا ہو، یا سمع وابصار کے معنی میں ہوں تو ان صفات کی بازگشت علیم وقدیر ہےاوراگران صفات کا مطلب بالفعل دیکھنا اورسننا ہوجوسنی اور دیکھی جانے والی اشیا اورسننے اوردیکھنے والوں کے درمیان موجودہ رابطہ سے حاصل ہوتے ہیں توانھیں صفات فعلیہ میں سے شمار کیا جائے گا،جیسا کہ کبھی (علم) بھی اسی عنایت کے لئے

استعمال ہوتا ہے اور اسے (علم فعلی) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
بعض متکلمین نے کلام اور ارادہ کو بھی صفات ذاتیہ میں سے شمار کیا ہے کہ جن کے سلسلہ میں آئندہ بحث کی جائے گی۔

صفات ذاتیہ کا اثبات۔

قدرت وحیات اور علم الٰہی کو ثابت کرنے کے لئے سب سے آسان راستہ یہ ہے کہ جب ان مفاہیم کو مخلوقات کے سلسلہ میں استعمال کیا جاتا ہے تو یہ اوصاف اس کے کمالات پر دلالت کرتے ہیں، لہذا ان صفات کی علت یعنی ذات الٰہی میں، بطور کامل ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ مخلوقات میں پائی جانے والی تمام صفات وکمالات خدا کی طرف سے ہیں لہذا عطا کرنے والے کے پاس ایسے اوصاف ہونا ضروری ہیں تا کہ وہ دوسروں کو عطا کر سکے، اس لئے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ حیات عطا کرنے والا خود حیات سے سرفراز نہ ہو، یا مخلوقات کو علم و قدرت عطا کرنے والا خود جاہل و ناتواں ہو لہذا مخلوقات میں مشاہدہ ہونے والے کمالات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ خدا بھی ان کمالات کا بغیر کسی کمی و کسر کے حامل ہے، یا دوسری تعبیر کے مطابق خدا لا متناہی علم وقدرت اور حیات کا مالک ہے
اب اس کے بعد ان صفات کی وضاحت کرتے ہیں۔

حیات۔

حیات کا مفہوم دو طرح کی مخلوقات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ایک سبزہ اور گھاس پھوس جن میں رشد و نمو کی صلاحیت ہوتی ہے، دوسرے حیوان اور انسان کہ جو ارادہ اور شعور سے متصف ہیں لیکن پہلا معنی، نقص و احتیاج کا مستلزم ہے اس لئے کہ رشد و نمو کا لازمہ یہ ہے کہ موجود اپنے آغاز میں اس کمال سے عاری ہو، بلکہ خارجی عوامل کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے تغیرات سے آہستہ آہستہ کمالات کا مالک بن جائے، اور ایسا امر خدا سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ صفات سلبیہ میں گذر چکا ہے۔

لیکن حیات کا دوسرا معنی، ایک کمالی مفہوم ہے، ہر چند اس کے امکانی مصادیق نقص کے ہمراہ ہیں لیکن پھر بھی اس کے لئے لامتناہی مقام فرض کیا جا سکتا ہے، کہ جس میں کسی قسم کی کوئی محدودیت اور نقص کا شائبہ نہ ہو، جیسا کہ مفہوم وجود اور مفہوم کمال میں بھی ایسا ہی ہے۔

حیات اپنے اس معنی میں کہ جو علم اور فاعلیت ارادی کا ملازم ہے یقیناً وجود غیر مادی ہوگا اگر چہ حیات کو مادی امور یعنی جاندار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اصل میں وہ اروح کی صفت ہے اور بدن کا روح سے رابطہ ہونے کی وجہ سے حیات کو بدن سے متصف کیا جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ جس طرح امتداد، شئی جسمانیت کا لازمہ ہے، حیات بھی وجود مجرد (غیر جسمانی) کا لازمہ ہے لہذا اس طرح حیات خدا پر ایک اور دلیل ایک دلیل متحقق ہوگئی اور وہ یہ ہے کہ ذات مقدس الٰہی مجرد اور غیر جسمانی ہے جیسا کہ گذشتہ دروس میں اسے ثابت کیا جا چکا ہے اور ہر موجود مجرد، حیات سے سرفراز ہے، لہذا اس طرح خدا متعال بھی ذاتاً حیات کا مالک ہے۔

علم۔

علم کا مفہوم تمام مفاہیم میں ہر ایک سے زیادہ واضح وروشن ہے، لیکن مخلوقات کے درمیان اس کے مصادیق محدود اور ناقص ہیں، لہٰذا ان خصوصیات کے ساتھ یہ خدا پر قابل اطلاق نہیں ہے لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ عقل میں اتنی توانائی ہے کہ وہ اس مفہومِ کمالی کے لئے ایک ایسے مفہوم کا انتخاب کرے کہ جس میں کسی قسم کی کوئی محدودیت اور نقص نہ ہو بلکہ عالم ہونا اس کی عین ذات ہو، علم خدا کے ذاتی ہونے کے یہی معنی ہیں۔

خدا کے علم کو متعدد راستوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے، ایک وہی راستہ ہے کہ جس کی طرف تمام صفات ذاتیہ کے اثبات کے لئے اشارہ کیا جا چکا ہے، یعنی چونکہ مخلوقات کے درمیان علم پایا جاتا ہے لہٰذا خالق کی ذات میں اس کی کامل صورت کا ہونا ضروری ہے۔

دوسرا راستہ دلیل نظم کی مدد سے حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ ایک مجموعہ جس قدر نظم وضبط کا حامل ہوگا اتنا ہی اس کے ناظم کے علم پر دلالت کرے گا، جس طرح سے کہ ایک علمی کتاب یا خوبصورت شعر یا کوئی نقاشی (آرٹ) وجود بخشنے والے کے ذوق اور اس کے علم ودانش پر دلالت کرتے ہیں اور کبھی بھی کوئی عاقل یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ایک فلسفی یا کوئی علمی کتاب کسی جاہل یا نادان شخص کے ہاتھوں لکھی گئی ہوگی لہٰذا کیسے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایسا نظم یافتہ جہان کسی جاہل موجود کا خلق کردہ ہے؟!

تیسرا راستہ نظریجو ہے مقدمات فلسفی (غیر بدیہی) کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے جیسے یہ قاعدہ کہ

ہر موجود جو مستقل ہو اور مجرد عن المادہ ہو وہ علم سے متصف ہوگا جیسا کہ یہ امر اس سے مربوط کتابوں میں ثابت کیا جا چکا ہے۔

علم الٰہی کی طرف توجہ دینا خودسازی کے باب،، میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور اسی وجہ سے قرآن کریم میں اس کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔

(یَعلَمُ خَائِنَۃَ الاَعیُنِ وَمَا تُخفِ الصُّدُورُ).(۱)

خدا خائن آنکھوں اور دل کے رازوں سے آگاہ ہے۔

....

(۱) سورۂ غافر، آیت/ ۱۹.

قدرت۔

وہ فاعل کہ جو امور کو اپنے ارادہ سے انجام دیتا ہے اس کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے امور میں صاحب قدرت ہے،لہذا قدرت یعنی فاعل مختار کا ہر اس امر کو انجام دینے کا ارادہ کہ جس کا اس سے صادر ہونے کا امکان ہے، جو فاعل جس قدر مرتبہ وجودی کی رو سے کامل ہوگا اس کی قدرت بھی اتنی ہی وسیع ہوگی، پس جو فاعل اپنے کمال میں لامتناہی ہو اس کی قدرت بھی بے نہایت ہوگی۔

(اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیءٍ قَدِیر)۔(۱)

خداوند عالم ہر چیز پر قادر ہے۔

اس مقام پر چند نکات کی طرف اشارہ کرنا لازم ہے۔

١۔ جو امر قدرت سے متعلق ہوگا اس میں امکان تحقق کا ہونا ضروری ہے،لہذا جوشی اپنی ذات کے اعتبار سے محال ہو وہ قدرت کا متعلق نہیں بن سکتی، اور خدا کا صاحب قدرت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا اپنی مثل بھی خلق کرسکتا ہے (اس لئے کہ خدا خلق نہیں کیا جاسکتا) یا دو کا عدد دو ہوتے ہوئے تین سے بڑا ہوجائے، یا ایک فرزند کو فرزند ہوتے ہوئے باپ سے پہلے خلق کردے۔

٢۔ ہر کام کے انجام دینے کی قدرت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ان سب کو انجام دے، بلکہ وہ جسے چاہے گا انجام دے گا، اور جسے چاہے گا انجام نہیں دے گا حکیم خدا، حکیمانہ فعل کے علاوہ کوئی اور فعل انجام نہیں دے سکتا اگر چہ وہ غیر حکیمانہ امور کے انجام دینے پر بھی قادر ہے، انشاء اللہ آئندہ دروس میں حکمت خدا کے سلسلے میں مزید وضاحت کی جائے گی۔

٣۔ قدرت کے جو معنی بیان ہوئے ہیں اس میں اختیار کے معنی بھی ہیں، خدا جس طرح بے نہایت قدرت کا مالک ہے اسی طرح لامحدود اختیارات سے سرفراز ہے، اور کوئی خارجی عامل اسے کسی عمل کے لئے زبردستی یا اس سے قدرت کو چھین لینے کی طاقت نہیں رکھتا اس لئے کہ ہر موجود کی قدرت اور اس کا وجود خود اسی کا مرہون منت ہے، لہٰذا وہ کبھی بھی اس طاقت کے مقابلہ میں مغلوب نہیں ہوسکتا کہ جسے اس نے دوسروں کو عطا کیا ہے۔

....

(١) سورۂ بقرہ۔ آیت/ ٢٠، اور دوسری آیات.

سوالات

۱۔خدا کے لئے کن مفاہیم کواستعمال کیا جا سکتا ہے؟

۲ ۔صفات ذاتیہ وفعلیہ کی تعریف کریں اوران دونوں کے درمیان کا فرق بیان کریں؟

۳ ۔صفات ذاتیہ کوثابت کرنے کے لئے ایک کلی ضابطہ کیا ہے؟

٤ ۔حیات کتنے ،معانی میں استعمال ہوتا ہےاورکون سے معنی کا استعمال خدا کے لئے درست ہے

٥ ۔حیات الٰہی پرخاص دلیل کیا ہے؟

٦ ۔علم الٰہی کوت تینوں راستوں (طریقوں) سے ثابت کریں؟

۷ ۔مفہوم قدرت کو بیان کریں اورخدا کی نامحدودقدرت کوثابت کریں؟

۸ ۔کون سی چیزیں قدرت سے متعلق نہیں ہوتیں؟

۹ ۔کیوں خدا ناپسندامورکوانجام نہیں دیتا؟

۱۰ ۔خدا کےمختار ہونے کا مطلب کیا ہے؟

دسواں درس

صفات فعلیہ

مقدمہ

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے۔

خالقیت

ربوبیت

الوہیت

مقدمہ

جیسا کہ گذشتہ دروس میں بیان کیا جاچکا ہے کہ صفات فعلیہ یعنی وہ مفاہیم جو ذات الٰہی اور اس کی مخلوقات کے درمیان پائے جانے والے رابطہ سے حاصل ہوتے ہیں کہ جن میں طرفین خالق ومخلوق ہیں، جیسے کہ خلق کرنے کا مفہوم مخلوقات کا، خدائے متعال سے وابستہ ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، لہذا اس اگر اس رابطہ کا لحاظ نہ کیا جائے تو یہ مفہوم حاصل نہیں ہوسکتا۔ خالق ومخلوق کے درمیان لحاظ کیا جانے والا رابطہ غیر محصور ہے، لیکن پھر بھی اس کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں، پہلی قسم وہ روابط ہیں جو مستقیماً خالق ومخلوق کے درمیان ملاحظہ کئے جاتے ہیں

جیسے ایجاد، خلق اور ابداع وغیرہ، اور دوسری قسم ان روابط کی ہے جو چند دوسرے روابط کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں جیسے کہ رزق، اس لئے کہ پہلے مرحلہ میں روزی سے فائدہ اٹھانے والا جن چیزوں کو بہ عنوان رزق استعمال کرتا ہے اسے ملاحظہ کیا جائے، اور پھر اسے مہیا اور عطا کرنے والے کو مدنظر رکھا جائے، یا پھر ایک ایسے رابطہ کو ملاحظہ کیا جائے جو خالق ومخلوق کے درمیان پائے جانے والے چند روابط پر مترتب ہوتے ہوں جیسے مغفرت کہ جو، ربوبیت تشریعی الٰہی اور خدا کی جانب سے احکامات کے صادر ہونے اور پھر بندہ کے عصیان (گناہ) کرنے پر منحصر ہے۔

نتیجہ: صفات فعلیہ کو حاصل کرنے کے لئے خالق ومخلوق کے درمیان مقایسہ اور خالق ومخلوق کے درمیان موجودہ رابطہ کا لحاظ کرنا ہوگا تا کہ ان روابط کے ذریعہ ایک مستقل مفہوم وجود میں آئے اِس وجہ سے ذات مقدس الٰہی خود بخود اور اُن روابط کے لحاظ کئے بغیر صفات فعلیہ سے متصف نہیں ہوسکتی لہذا صفات ذاتیہ اور صفات فعلیہ کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے۔

البتہ جسیا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ یہ امکان ہے کہ اگر صفات فعلیہ کو ان کے مبادی اور منشا کے تحت ملاحظہ کیا جائے تو اس صورت میں ان سب کو صفات ذاتیہ کی طرف لوٹانا ہوگا، جیسا کہ اگر خالق یا خلاق کو اس معنی میں لیا جائے کہ جس میں خلق کی قدرت ہو تو اس کی بازگشت صفت قدیر،، کی طرف ہوگی یا اگر صفت سمیع ،، اور بصیر کو مبصرات ومسموعات کے جاننے والے کے معنی میں لیا جائے تو اس کی بازگشت علیم کی طرف ہوگی۔

اسی طرح وہ بعض مفاہیم جنھیں صفات ذاتیہ میں شمار کیا جاتا ہے انھیں ایک اضافی اور فعلی معنی

میں ملاحظہ کیا جائے تو اس صورت میں ان کا شمار صفات فعلیہ میں ہوگا جیسے کہ مفہوم علم قرآن میں متعدد مقامات پر بطور صفات فعلی استعمال ہوا ہے(۱)

وہ مہم نکتہ جسے یہاں بیان کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جب خدائے متعال اور مادی موجودات کے درمیان رابطہ تصور کیا جاتا ہے اور اس طرح خدا کے لئے صفات فعلی حاصل ہوتے ہیں تو یہ صفات اس رابطہ کے طرف موجودات مادی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے قید زمانی و مکانی سے منسوب ہوتے ہیں اگر چہ اس رابطہ کی پہلی طرف یعنی خدا ایسے قیود اور حدود سے منزہ ہے۔

جیسے کہ رزق خدا سے لطف اندوز ہونے والے کا عمل ایک خاص زمان و مکان میں واقع ہوتا ہے لہٰذا یہ قید روزی سے مستفیض ہونے والے سے متعلق ہوگی نہ روزی عطا کرنے والے سے اس لئے کہ ذات الٰہی ہر قسم کے زمان و مکان سے مستغنی ہے۔

یہ نکتہ ایک ایسا وسیلہ ہے کہ جس کے ذریعہ ان صفات اور افعال الٰہی کو حل کیا جا سکتا ہے کہ جن کی وجہ سے متکلمین کے درمیان شدید اختلاف ہے۔

....

(۱) سورہ بقرہ۔آیت/ ۱۸۷،۲۳۵ سورہ انفال ۔آیت/ ٦٦ سورۂ فتح ۔آیت/ ۱۸،۲۷ سورہ آل عمران۔آیت/ ۱٤۰،۱٤۲

خالقیت۔

واجب الوجود کے اثبات کے بعد ممکن الوجود کی خلقت کی پہلی علت کے عنوان سے اور اس مطلب کے پیش نظر کہ تمام ممکن الوجود اپنی ہستی میں اس کے محتاج ہیں واجب الوجود کے لئے صفت خالقیت اور ممکن الوجود کے لئے مخلوقیت کا مفہوم حاصل ہوتا ہے مفہوم خالق جو اس رابطہ کے ذریعہ وجود میں آتا ہے علت وجود آفرین اور موجد (ایجاد کرنے والا) سے مساوی ہے اور تمام ممکن الوجود اور ضرورت مند موجودات اس رابطہ کے ایک طرف ہونے کی وجہ سے صفت مخلوقیت سے متصف ہوتے ہیں۔

لیکن کبھی کلمہ خلق محدود معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور تنہا وہی موجودات اس رابطہ کے طرف قرار پاتے ہیں کہ جو مادہ اولیہ سے خلق ہوئے ہیں اور ان کے مقابل میں مفہوم ابداع (ایجاد کرنا) ان موجودات کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ جو مادہ اول سے مسبوق نہ ہو (جیسے مادہ اولیہ اور مجردات) اس طرح ایجاد کو خلق وابداع میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

بہر حال خدا کے خلق کرنے کا مطلب اشیا میں انسانوں کے تصرف اور انھیں بنانے کی طرح نہیں ہے کہ جس میں حرکت اور اعضاء بدن کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے، اور حرکت کو بعنوان فعل اور اس کے قضایا کو بعنوان نتیجہ فعل یاد کیا جاتا ہے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ خلق کرنا یعنی فعل،، ایک شی ء اور خلق کیا ہوا یعنی مخلوق،، ایک دوسری شی ء ہو اس لئے کہ خدا، موجودات جسمانی کے خواص سے منزہ ہے اگر خدا کے خلق کرنے کو مصداق عینی زائد فرض کر

لیا جائے اس کی خلق کی ہوئی ذات پر، تو پھر اسے ایک ممکن الوجود اور خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق شمار کیا جائیگا، اور اس کے خلق کرنے گفتگو تکرار ہو گی بلکہ جیسا کہ صفات فعلیہ کی تعریف میں بیان ہوا کہ یہ صفات وہ مفاہیم ہیں کہ جو صفات خدا و خلق کے درمیان موجود نسبتوں کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں اور نسبتوں کا قیام عقل کی بنیاد پر ہے

ربوبیت۔

خالق و مخلوقات کے درمیان جن روابط کا لحاظ کیا جاتا ہے وہ یہ کہ مخلوقات اپنی آفرینش میں خدا کے محتاج ہونے کے علاوہ اپنی زندگی کے تمام مراحل میں اس سے وابستہ ہیں اور کسی بھی قسم کے استقلال سے عاری ہیں وہ جس طرح چاہے ان کے امور میں تصرف اور ان کے امور کی تدبیر کرے۔

جب اس رابطہ کو بصورت کلی تسلیم کر لیا گیا تو اس سے مفہوم ربوبیت اخذ ہونا لازم ہے کہ جس کا لازمہ امور کی تدبیر کرنا ہے، اور اس کے بے شمار مصادیق ہیں جیسے حفاظت کرنا، زندہ کرنا، مار ڈالنا، روزی عطا کرنا، کمال عطا کرنا، راہنمائی کرنا، امر و نہی کرنا وغیرہ۔

ربوبیت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ربوبیت تکوینی یعنی تمام موجودات کی احتیاجات کو برطرف کرنا اور ان کی دیکھ بھال کرنا، یعنی کہنا بہتر ہے کہ وہ پورے جہان کا چلانے والا ہے، لیکن ربوبیت تشریعی صرف باشعور اور مختار موجودات سے مخصوص ہے، جیسے انبیاء کو مبعوث کرنا، آسمانی کتابوں کو نازل کرنا، وظائف کی تعین اور احکام و قوانین کے بیان کرنے جیسے

امور کو شامل ہے۔

نتیجہ۔ ربوبیت مطلق الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ مخلوقات اپنے تمام مراحل وجود میں خدا سے وابستہ ہیں، اور مخلوقات کی آپسی وابستگی کا سرا بھی واجب الوجود تک پہنچتا ہے، وہ وہی ہے جو اپنی بعض مخلوقات کے ذریعہ بعض کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، اور دوسری پیدا کی ہوئی اشیا کو اپنی مخلوقات کے لئے غذا بناتا ہے، اور اپنی باشعور مخلوقات کو باطنی عوامل (عقل اور حواس خمسہ) اور ظاہری عوامل (انبیائ، آسمانی کتب) کے ذریعہ ہدایت کرتا ہے اور مکلفین کے لئے احکام وقوانین وضع کرتا ہے۔

ربوبیت بھی خالقیت کی طرح ایک اضافی اور نسبتی مفہوم ہے، بس فرق اتنا ہے کہ مختلف موارد اور مقامات پر مخلوقات کے درمیان خاص اضافات و روابط ملاحظہ کئے جاتے ہیں، جیسا کہ مفہوم رزاقیت کے سلسلہ میں گذر چکا ہے۔

مفہوم خالقیت اور ربوبیت میں جب خوب غور وفکر کیا جائے تو ان کے درمیان نسبت اور اضافت سے یہ معلوم ہوجاتا ہے، کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے متلازم ہیں، اس اعتبار سے محال ہے کہ جہان کا رب،، اس جہان کے خالق کے علاوہ کوئی اور ہو، بلکہ وہی خدا، جو مخلوقات کو مختلف خصوصیات اور ایک دوسرے سے مرتبط و وابستہ خلق کیا ہے وہی ان کی حفاظت کرنے والا ہے، حقیقت میں، ربوبیت وتدبیر کا معنی ومفہوم مخلوقات کی تخلیقی کیفیت، اوران کے آپسی ارتباطات وتعلقات سے اخذ ہوتا ہے۔

الوہیت۔

مفہوم الہ اور الوہیت کے سلسلہ میں صاحبان نظر کے درمیان شدید اختلاف ہے کہ جسے تفاسیر کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہےلیکن جو بات ہمارے نزدیک قابل اہمیت ہے وہ یہ کہ الہ،، بہ معنی لائق عبادت ہونا (عبادت واطاعت کے لحاظ سے شائستہ وسزاوار ہونا) جیسے کہ کتاب وہ چیز جو لکھے جانے کے قابل ہو۔

اس معنی کو مدنظر رکھتے ہوئے الوہیت ایک ایسی صفت ہے کہ جس کے لئے اطاعت وعبادت کوبھی ملحوظ رکھنا ہوگا اگر چہ گمراہوں نے ،اپنے لئے باطل خداؤں کا انتخاب کرلیا ہے،لیکن جو ذات،،عبادت واطاعت کیلئے شائیستہ وسزاوار ہووہی ذات،،خالق ورب قرار پائے گی، اور یہ ایک اعتقادی حصار ہے کہ جسے ہر شخص کے لئے ماننا ضروری ہے یعنی خدا کو واجب الوجود خالق اور صاحب اختیار ماننے کے علاوہ اسے اطاعت وعبادت کے لائق سمجھےاسی وجہ سے اس مفہوم کواسلام کا شعار مانا گیا ہے(لا الہ الا اللہ)۔

سوالات

۱۔صفات ذاتیہ اور فعلیہ کے ارتباط اور ان دونوں کا ایک ہی مفہوم میں جمع ہونے کی کیفیت بیان کریں؟

۲۔کس اعتبار سے صفات فعلیہ، زمانی و مکانی قیود میں مقید ہو جاتے ہیں؟

۳۔مفہوم خالقیّت کی شرح پیش کریں اور ایجاد و ابداع کے ساتھ اس کے فرق کو بیان کریں؟

٤۔کیوں خلق کرنے کے مفہوم کو مصداق عینی کے اعتبار سے زائد بر ذات مخلوق، تصور نہیں کیا جا سکتا؟

٥۔مفہوم ربوبیّت کو بیان کریں؟

٦۔اقسام ربوبیّت کی تشریح کریں؟

۷۔خالقیّت اور ربوبیّت کے تلازم کو بیان کریں؟

۸۔مفہوم الوہیّت کا خالقیّت اور ربوبیّت کے ساتھ جو تلازم ہے اسے بیان کریں؟

گیارہواں درس

بقیہ صفات فعلیہ

مقدمہ

ارادہ

کلام کا صادق ہون

مقدمہ

علم کلام میں متکلمین کے درمیان ارادۂ الٰہی اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے جسے مختلف پہلوؤں سے زیر بحث قرار دیا گیا ہے، کیا ارادہ کا تعلق صفات ذاتی سے ہے یا صفات فعلی سے؟ کیا قدیم ہے یا حادث؟ کیا واحد ہے یا متعدد؟ وغیرہ... یہ تمام بحثیں فلسفہ میں ارادہ اور ارادہ الٰہی کے خصوصیات سے ہونے والی بحثوں سے جدا ہے لہٰذا یہ بات روشن ہے کہ ایسی بحث کو اس کتاب میں ذکر کرنا مناسب نہیں ہے اسی وجہ سے پہلے ہم مفہوم ارادہ کی ایک مختصر وضاحت پیش کریں گے اور پھر ارداۂ الٰہی کے تحت بحث کا آغاز کریں گے۔

ارادہ۔

کلمہ ارادہ عرف میں کم از کم دو معنی میں استعمال ہوتا ہے، ایک محبت کرنا اور دوسرے کسی کام کو انجام دینے کا ارادہ کرنا۔

پہلا معنی دوسرے معنی کی بہ نسبت وسیع ہے اس لئے کہ یہ اشیاء خارجی (۱) اور دوسروں کے

....

(۱) جیسے کہ یہ آیہ شریفہ (تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الآخرۃ) سورۂ انفال۔ آیت/ ٦٧

افعال کے ساتھ اپنے افعال کو پسند کرنے کو شامل بھی ہوتا ہے لیکن دوسرا معنی صرف شخص کے ذاتی افعال کو شامل ہوتا ہے۔

لیکن ارداہ اپنے پہلے معنی کے مطابق (محبت) اگر چہ انسان کے لئے ایک نفسانی کیفیت ہے، لیکن عقل عیب و نقص کو برطرف کر کے ایک عام مفہوم حاصل کرسکتی ہے کہ جسے جوہری موجودات کے ساتھ خدا پر بھی اطلاق کیا جا سکے، جیسا کہ علم کے ساتھ یہی ہوا ہے اسی جہ سے حب (محبت) کو صفات ذاتیہ میں شمار کیا جا سکتا ہے جو کہ (خود اپنی ذات سے محبت الٰہی پر قابل) اطلاق ہے، لہذا اگر ارادہ الٰہی کا مطلب حب کمال ہو تو یہ پہلے مرحلہ میں لا متناہی کمال الٰہی سے متعلق ہوتا ہے اور یہ بقیہ مراحل میں تمام موجودات کے کمالات پر صادق آتا ہے اس لئے کہ یہ اسی کے کمال کے آثار ہیں اس بنا پر اسے صفات ذاتیہ کا حصہ، قدیم، واحد اور عین ذات مقدس الٰہی مانا جا سکتا ہے۔

لیکن ارادہ بہ معنی کسی بھی امر کو انجام دینے کا قصد کرنا بغیر کسی شک کے صفات فعلیہ میں داخل ہے (جو امر حادث سے متعلق ہونے کی وجہ سے قیود زمان میں مقید ہے جیسا کہ قرآن میں وارد ہوا ہے کہ

(اِنَّمَا اَمرُہُ اِذَا اَرَادَ شَیئًا اَن یَقُولَ لَہُ کُن فَیَکُونُ)(۱)

ترجمہ۔اس کی شان تو یہ ہے کہ جب کسی چیز کو (پیدا کرنا) چاہتا ہے تو وہ کہہ دیتا ہے، کہ ہو جا ،تو فوراً ہو جاتی ہے

لیکن خدائے متعال کا صفات فعلیہ سے متصف ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ذات الٰہی میں کوئی تبدیلی واقع ہو یا کوئی صورت عرضی اس کے وجود میں ظاہر ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذات الٰہی اور اس کی مخلوقات کے درمیان شرائط اور ایک خاص نظریہ کے تحت ایک نسبت لحاظ کیا گیا ہو اور ایک خاص، مفہوم اضافی کو صفات فعلیہ عنوان سے اخذ کیا گیا ہو مفہوم ارادہ کے تحت اس رابطہ کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ ہر مخلوق چونکہ صاحب کمال ہے اور اس کی خلقت میں مصلحت وحکمت کارفرما ہے

....

(۱) سورہ یس، آیت/ ۸۲.

اس لئے خلق ہوئی ہے، لہذا اس کا ایک خاص زمان و مکان اور کیفیت میں واقع ہونا، علم خدا اور محبت الٰہی سے متعلق ہے کہ جس کو اس نے اپنے ارادے سے پیدا کیا ہے نہ یہ کہ کسی نے اس کو مجبور کیا ہے، جب اس رابطہ کا لحاظ کیا جاتا ہے تو ایک مفہوم اضافی اور نسبتی بنام ارادہ حاصل ہوتا ہے، جو شی محدود سے تعلق کے اعتبار سے کچھ حدود و قیود کا حامل ہے اور یہ وہی مفہوم اضافی ہے جو حدوث و کثرت سے متصف ہے اس لئے کہ اضافت تابع طرفین ہے اور ان دونوں طرفوں میں سے کسی ایک کا حدوث اور کثرت سے متصف ہونا اوصاف کا ، اضافت کی طرف سرایت کرنے کے لئے کافی ہے۔

حکمت۔

جو وضاحت ارادۂ الٰہی کے تحت پیش کی گئی اس کے مطابق یہ بات روشن ہوگئی کہ یہ ارادہ یونہی، کسی بھی شی کے ایجاد سے متعلق نہیں ہوتا، بلکہ جو شی بھی ارادۂ الٰہی کے متعلق بنتی ہے، اس میں خیر اور کمال کی حکمت پائی جاتی ہے۔

اور چونکہ مادیات کا تزاحم بعض کا بعض دوسرے کے ذریعہ نقصان کا موجب ہوتا ہے محبت الٰہی کا کمال کے سلسلہ میں تقاضا یہ ہے کہ ان سب کی پیدائش اس طرح ہو کہ انھیں زیادہ سے زیادہ خیر وکمال مل سکے، ایسے روابط کو میزان پر قرار دینے سے مفہوم مصلحت سمجھ میں آتا ہے، وگرنہ مصلحت مخلوقات کے پائے جانے کے سلسلہ میں کوئی مستقل امر نہیں ہے کہ جو ان کی پیدائش میں براہ راست اثر انداز ہو، چہ جائے کہ وہ ارادہ الٰھی میں اثر گذار ہو۔

نتیجہ:

افعال الٰہی اس کے صفات ذاتیہ، جیسے علم وقدرت خیر وکمال سے محبت، جیسی چیزوں سے مترشح ہوتا ہے اور ہمیشہ، کسی مصلحت کے پائے جانے ہی کی صورت میں متحقق ہوتا ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ کمال وخیر حاصل ہو سکے، لہٰذا ایسے ارادہ کو ارادۂ حکیمانہ کا نام دیا جاتا ہے اور یہیں سے مقام فعل میں خدا کے لئے ایک دوسری صفت بنام حکیم ہونا سمجھ میں آتا ہے، اور بقیہ صفات فعلیہ کی طرح اس کی بھی بازگشت صفات ذاتیہ کی طرف ہوتی ہے۔

البتہ یہ بات روشن ہے کہ مصلحت کی خاطر کسی امر کو انجام دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مصلحت خدا کے لئے علت غائی ہو، بلکہ وہ ایک فرعی ہدف ہے لیکن امور کو انجام دینے میں علت غائی ،وہی اس کا ذاتی ، ولا انتناہی کمال سے محبت کرنا ہے جو ضمناً اس کے آثار یعنی موجودات کے کمالات سے متعلق ہے، لہذا اس مقام پر یہ کہنا درست ہے کہ افعال الٰہی کے لئے علت وہی علت فاعلی ہے، اور خدا زائد بر ذات کسی ہدف کا حامل نہیں ہے، لیکن یہ مطلب اس بات کا منافی نہیں ہے کہ موجودات کا کمال اور خیر ایک فرعی ہدف ہے، اور اسی کو قرآن نے بھی بیان کیا ہے اس لئے کہ قرآن کریم نے افعال الٰہی کے لئے ایسی علتوں کو بیان کیا ہے کہ جن میں سے ہر ایک کی بازگشت مخلوقات کے خیر و کمال کی طرف ہے، جیسے کہ امتحان و آزمائش، بہترین امور کا انتخاب کرنا، خدا کی بندگی کرنا، اور رحمت خاص سے متنعم ہونا (۱) انسان کی خلقت کے اہداف میں سے ہے کہ جن میں سے ہر ایک بالترتیب دوسرے والے کے لئے مقدمہ ہے۔

کلام الٰہی۔

خدا کی ذات سے نسبت دئے جانے والے مفاہیم میں سے ایک مفہوم، تکلم ہے اور ہمیشہ کلام الٰہی کے سلسلہ میں متکلمین کے درمیان بحث ہوتی رہی ہے، یہاں تک کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ علم کلام کا کلام نام سے شہرت پانا اس وجہ سے ہے کہ اس علم کے اصحاب (علماء متکلمین) کلام الٰہی کے

تحت بحث کرتے ہیں، اشاعرہ اسے صفات ذاتیہ میں سے اور معتزلہ صفات فعلیہ میں سے شمار کرتے ہیں، ان دو گروہوں کے درمیان شدید اختلاف کا باعث یہی مسئلہ قرار پایا قرآن مجید، کلام الٰھی ہے، ایسی صورت میں یہ مخلوق (حادث) ہے یا غیر مخلوق (یعنی قدیم) اس سلسلہ میں بڑی بحثیں ہوئی ہیں، بسا اوقات اسی موضوع کی وجہ سے ایک دوسرے کو کافر کہا گیا۔

....

(۱) رجوع کریں، سورۂ ہود آیت ۷ سورہ ملک آیت ۲ سورہ کہف آیت ۷ سورہ ذاریات آیت ۵۷ سورہ ہود آیت ۱۰۸ سورہ جاثیہ آیت ۲۳ سورۂ آل عمران آیت ۱۵ سورہ توبہ آیت ۷۲.

صفات ذاتیہ اور فعلیہ کی بیان کی گئی تعریفوں کے پیش نظر یہ اس مسئلہ کو بہ آسانی درک کیا جا سکتا ہے کہ تکلم فعل کی صفات میں سے ہے کہ جسے وجود بخشنے کے لئے ایک مخاطب کی ضرورت ہے تاکہ کہنے والے کے مقصود کو آواز یا مکتوب یا اپنے ذہن میں کسی مفہوم یا کسی اور راستہ کے ذریعہ درک کیا جا سکے، درحقیقت یہ مفہوم اس رابطہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے جو خدا کسی حقیقت کو اپنے بندہ کے لئے آشکار کرنا چاہتا ہے اور بندہ میں اس حقیقت کے درک کرنے کی طاقت پائی جاتی ہے مگر یہ کہ تکلم کے لئے کوئی دوسرے معنی فرض کر لئے جائیں جیسے تکلم پر قادر ہونا یا تکلم کے معنی و مفہوم جاننا تو پھر اس صورت میں اس صفت کی بازگشت بھی صفات ذاتیہ کی طرف ہوگی، جیسا کہ اس طرح کی باتیں صفات فعلیہ میں گذر چکی ہیں۔

لیکن قرآن خطوط یا الفاظ یا ذہنوں میں موجودہ مفاہیم یا ایک نورانی حقیقت اورمخلوقات سے مجرد کے معنی سے عبارت ہے، مگر یہ کہ کوئی علم الٰہی کو بعنوان حقیقت قرآن سمجھے تو اس صورت میں اس کی بازگشت صفت ذاتی علم کی طرف ہوگی لیکن ایسی تاویلیں عرف کے محاوروں کے خلاف ہیں لہٰذا ان سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔

صدق۔

کلام الٰہی، اگر امر ونہی کی صورت میں بہ طور انشا ہوتو یہ بندوں کے عملی وظائف کو معین کرتا ہے اوراس میں کسی قسم کے صدق وکذب سے متصف کرنے کا کوئی مقام نہیں ہے لیکن اگر کلام الٰہی حقائق یا گذشتہ اور آئندہ حوادث کے سلسلہ میں بصورت اخبار ہوتو صدق سے متصف ہے جیسا کہ

قرآن کریم میں وارد ہوا ہے۔

(وَمَن اَصدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيثًا).(۱)

اورخدا سے بڑھ کر بات میں سچا کون ہوگا؟

....

سورہ نسا، آیت/ ۸۷

اوراس صورت میں کوئی بھی انھیں قبول نہ کرنے پر کسی بھی قسم کا عذر پیش نہیں کرسکتا۔

یہ صفت جہان بینی کے فرعی مسائل آئیڈیا لوجی کے بہت سے مسائل کو ثابت کرنے کے

لئے ایک قسم کے استدلال (نقلی اور تعبدی) سے متصف ہے۔

اس صفت کو ثابت کرنے کے لئے جو عقلی دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ کلام الٰہی ربوبیت الٰہی کی شان، جہان وانسان کی تدبیر، مخلوقات کی ہدایت اور علم وحکمت کی بنیاد پر صحیح شناخت کو مخاطبین کے لئے فراہم کرنے کا ایک وسیلہ ہے اور اگر واقع سے کسی قسم کی مخالفت کا امکان ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اس لئے کہ نقض غرض کی وجہ سے حکمت الٰہی کے خلاف تصور کیا جائے گا۔

سوالات

۱۔ارادہ الٰہی کس معنی میں صفات ذاتیہ اور کس معنی میں صفات فعلیہ میں شمار ہوگا؟

۲۔مفہوم ارادہ کو بعنوان صفت فعلی جلوہ دینے کے لئے خالق ومخلوق کے درمیان کس رابطہ کا لحاظ کرنا ضروری ہے؟

۳۔ارادۂ الٰہی کس طرح حدوث وکثرت سے متصف ہے؟

٤۔حکمت الٰہی کو بیان کریں؟

٥۔مفہوم مصلحت کس طرح حاصل ہوتا ہے؟

٦۔کس معنی میں مخلوقات کی مصلحت، خیر اور اس کے کمال کو خلقت کا ہدف مانا جائے؟

٧۔کلام الٰہی کی شرح پیش کریں؟

٨۔خداوند متعال کے صادق ہونے پر عقلی دلیل بیان کریں؟

بارہواں درس

انحراف کے اسباب کی تحقیق

مقدمہ

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے۔

انحراف کے اسباب

روحی اسباب

اجتماعی اسباب

فکری اسباب

انحرافی اسباب کا سد باب

مقدمہ:

پہلے درس میں اس مطلب کو واضح کر دیا گیا ہے کہ جہان بینی (خدا کی معرفت) کو بہ اعتبار کلی دو حصوں (الٰہی اور مادی) میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اور ان کے درمیان مہم ترین اختلاف قادر و علیم پروردگار کے وجود کا مسئلہ ہے کہ جسے ثابت کرنے کے لئے ایک طرف الٰہی جہان بینی

ایک بنیادی اصل کے عنوان سے تاکید کرتی ہے اور مادی جہان بینی اس کا سرے سے انکار کرتی ہے۔

گذشتہ دروس میں اس کتاب کی گنجائش کے مطابق وجود خدا کے اثبات، صفات ثبوتیہ اور سلبیہ ،صفات ذاتیہ وفعلیہ کے تحت گفتگو کی جا چکی ہے اب اس کے بعد اس اعتقاد کے استحکام نیز مادی جہان بینی کے نقد کے لئے ،ایک مختصر بحث کا آغاز کرتے ہیں تا کہ الٰہی جہان بینی کے مقصود کے اثبات کے علاوہ مادی جہان بینی کا بطلان ثابت ہو جائے۔

لٰہذا پہلے ہم توحید سے، انحراف اور الحاد کی جانب میلان کے اسباب بیان کریں گے اور پھر مادی جہان بینی کے اہم ترین نقطہ ضعف کی جانب اشارہ کریں گے۔

انحراف کے اسباب۔

الحاد کی داستان تاریخ بشر میں بہت قدیمی ہے، اگر چہ ہمیشہ انسانی معاشرے میں، جہاں تک تاریخ نے بیان کیا ہے۔ خدا پر اعتقاد اور ایمان رکھنے والوں کی مثالیں زمانہ قدیم سے بے شمار ہیں، لیکن اس کے باوجود انھیں لوگوں کے درمیان ملحد گروہوں کی ٹولیاں بھی نظر آتی ہیں، لیکن اٹھارہویں صدی سییورپ میں بے دینی اور الحاد کا ایک مستقل رواج شروع ہوا اور آہستہ آہستہ پورے جہان میں یہ مرض پھیل گیا۔

اگر چہ یہ طرز تفکر کلیسا اور مسیحیت کی ضد میں اٹھا تھا لیکن اس کی موجوں نے تمام ادیان و مذاہب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اور مغرب سے صنعت وٹکنالوجی کے ہمراہ بے دینی کا یہ

نظریہ دوسری سرزمینوں کی طرف بڑھتا چلا گیا،اوراس آخری صدی میں اس فکر نے ،افکار اقتصادی،اجتماعی اور مارکسیسم کے سایہ میں تمام ممالک کواپنی لپیٹ میں لے لیااوراس طرح انسانیت کے لئے ایک خطرناک صورت پیدا ہوگئی۔

اس منحرف عقیدہ کی پیدائش اوراس کے رواج پانے میں بےشماراسباب وعوامل کارفرما ہیں، اگر ہم ان سب عوامل کی تحقیق کرنا چاہیں ،تو تنہا انھیں کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے(۱) لیکن بطورکلی ان عوامل میں سے صرف تین کی جانب اشارہ کریں گے۔

....

(۱)استادشہید مطہری نے اپنی کتاب (علل گرائش مادی گری) میں بعض اسباب وعوامل کا تذکرہ کیاہے،اوراس پرروشنی ڈالی ہے۔

۱۔روحی اسباب

بے دینی اور الحاد کی جانب بڑھتے ہوئے رجحانات کے اسباب ممکن ہے،لوگوں کے اندر موجودہوں لیکن انسان اس کی طرف متوجہ نہ ہوجن میں سے اہم ترین راحت طلبی،عیش پرستی بےقیدو بند،غیرذمہ دارانہ زندگی گزارنا ہے۔

یعنی ایک طرف تحقیق کی زحمت (خصوصاً ان امور کے سلسلہ میں کہ جس میں مادی لذت کا وجودنہیں ہے)اس امر سے مانع ہے کہ سست اور کاہل افراد تحقیق کے لئے آمادہ ہوں، اور

دوسری طرف حیوانی آزادی سے لگاؤ، اور بغیر مسولیت و پابندی کے زندگی گذارنے کی تمنا ان کو الٰہی جہان بینی کی طرف مائل ہونے سے روک دیتی ہے، اس لئے کہ الٰہی افکار کے قبول کرنے اور حکیم پروردگار پر ایمان رکھنے کہ جس کے ضمن میں متعدد عقائد جنم لیتے ہیں، ان سب کا لازمہ، تمام اختیاری افعال میں انسان کی مسئولیت پذیری ہے، اور ایسی مسئولیت کا تقاضا یہ ہے کہ بعض مقامات پر اپنی بعض خواہشات سے چشم پوشی کی جائے، اور ذمہ داریوں کو قبول کرلیا جائے، جبکہ عیاشی کے ساتھ ان ذمہ داریوں کا قبول کرنا سازگار نہیں ہے، اسی وجہ سے یہ حیوانی خواہش لاشعوری طور پر اس امر کا سبب بنتی ہے ان تمام مسئولیتوں (ذمہ داریوں) کو قبول نہ کیا جائے اور سرے سے خداوند عالم کے وجود ہی سے انکار کردیا جائے۔ الحاد اور بے دینی کی جانب میلانات کے اور دوسرے نفسیاتی عوامل بھی ہیں، جو بقیہ عوامل کے تعاقب میں ظاہر ہوتے ہیں۔

۲۔اجتماعی اسباب۔

بعض معاشروں میں پیش آنے والے وہ غیر مطلوب حالات کہ جن کی پیدائش میں دینی رہبروں کا خاص کردار ہوتا ہے، ایسے حالات میں بہت سے لوگ جو تفکر عقلی کے اعتبار سے ضعیف ہوتے ہیں اور مسائل کے تجزیہ و تحلیل پر پوری طرح قادر نہیں ہوتے، اور حوادثات کے اسباب سمجھنے میں بھی ضعیف ہیں، حوادثات کو دین اور اس کے رہبروں کی دخالت کا نتیجہ سمجھتے ہیں، اور یہ اعتقاد پیدا کر لیتے ہیں، کہ دینی اعتقادات ہی ایسے نا مطلوب حالات کو

وجود میں لانے کا اصلی سبب ہیں، اسی بنا پر وہ دین و مذہب سے بیزار ہوجاتے ہیں ایسے نمو نے یورپ کے اجتماعی زندگی جو عہد رنسانس میں پیش آئے ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں، کلیسا کے سایہ میں مذہبی، حقوقی اور سیاسی عنوانات کے تحت پادریوں کی ناشائستہ حرکات مسیحیت سے بیزاری بلکہ دین ودینداری سے بطور کلی قطع تعلق ہونے کا سبب بنے۔

دینی رہبروں کے لئے ایسے اسباب کا جاننا نہایت ضروری ہے، تاکہ وہ اپنے مقام کی حساسیت اور اپنی ذمہ داری کی عظمت کو درک کرسکیں، اور انھیں بخوبی معلوم ہوجائے کہ ان کی معمولی ایک غفلت پورے معاشرے کی بدبختی اور گمراہی کا سبب بن سکتی ہے۔

۳۔فکری اسباب۔

یعنی وہ شبہات جو ایک شخص کے ذہن میں آتے ہیں یا دوسروں کی زبانی سنتا ہے، استدلال اور قوت عاقلہ کے ضعیف ہونے کی وجہ سے انھیں دفع کرنے کی قوت نہیں رکھتا اور کم وبیش وہ ان شبہات سے متاثر ہوجاتا ہے، یا کم از کم اس کا ذہن مضطرب و پریشان ہوجاتا ہے جو (جہان بینی الھی) کے سلسلہ میں یقین واطمنان پیدا کرنے سے مانع ہے۔

ان عوامل کو بھی دو فرعی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جیسے وہ شبہات جو حس گرائی پر مبنی ہیں، وہ شبہات جو عقیدہ کے فاسد ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں وہ شبہات جو کمزور طریقہ استدلال، اور غلط تعمہوں کا نتیجہ ہوتے ہیں، وہ شبہات جو ناگوار حوادث کی وجہ سے ذہنوں میں خطور کرتے ہیں کہ جن کے لئے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ حکمت خداوند اور عدل الٰہی کے

خلاف ہیں، اسی طرح وہ علمی تحیوریاں جو عقائد دینی کے خلاف ہیں، اور ان کی وجہ سے شبہہ پیدا ہوتا ہے، نیز وہ شبہات جو مقررات واحکام دینی سے وابستہ ہیں، بالخصوص مسائل حقوقی و سیاسی کے شعبہ میں۔

اور کبھی کبھی دو یا چند عوامل مجموعاً طور پر شک وتردید یا انکار اور الحاد کا سبب ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں شخص نفسانی مرض (فکری وسواس) میں گرفتار ہوجاتا ہے اور پھر کسی بھی دلیل وبرھان کے قبول کرنے سے انکار کرنے لگتا ہے، اس مرض میں مبتلا انسان، اپنے ہی عمل کی صحت میں شک کرنے لگتا ہے، اور اس کے صحیح ہونے کا اطمینان نہیں کر پاتا، دسیوں بار اپنا ہاتھ دھوتا ہے لیکن پھر بھی اس کی طہارت میں شک کرتا ہے جبکہ وہ پہلی ہی مرتبہ میں پاک ہوچکا ہے یا وہ سرے سے نجس ہی نہیں ہے۔

انحرافی اسباب کا سد باب۔

انحراف کے اسباب کے مختلف ہونے کی وجہ سے ان میں سے ہر ایک سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک خاص روش، موقع ومحل اور مخصوص شرائط کی ضرورت ہے، جیسے روحی واخلاقی اسباب کا علاج صحیح تربیت اور اس راستہ میں موجود موانع کو برطرف کرنے کے ذریعہ کیا جائے جیسا کہ ہم نے پہلے، دوسرے اور تیسرے درس میں دین میں تحقیق کی ضرورت اور اس سے سہل انگاری کے نقصانات میں،، بیان کرچکے ہیں۔

اسی طرح اجتماعی اسباب کے برے اثرات کو روکنے کے لئے ایسے اسباب وعوامل کی روک، تھام کے علاوہ دینداروں کے اخلاق و کردار کے ناشائیستہ ہونے اور دین کے صحیح نہ ہونے کے درمیان فرق کرنا ہوگا، بہر حال روحی و اجتماعی عوامل کی طرف توجہ دینے کی وجہ سے کم از کم ایسے منحرف کرنے والے اسباب کی تاثیر سے انسان محفوظ رہتا ہے۔

اسی طرح فکری اسباب کی بری تاثیر سے محفوظ رہنے کے لئے مناسب طریقہ اختیار کرنا ہوگا لہٰذا فاسد عقائد کو صحیح عقائد سے جدا کرنا ہوگا، اور دینی عقائد کو ثابت کرنے کے لئے غیر منطقی اور ضعیف استدلالوں سے پرہیز کرنا ہوگا اور یہ بھی آشکار کرنا ہوگا کہ دلیل کا ضعیف ہونا، مدعی کے نادرست ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

اب یہ بات روشن ہے کہ انحراف کے تمام عوامل کے سلسلہ میں تحقیق و جستجو اور ان میں سے ہر ایک سے مقابلہ کے لئے مناسب راہ کا بیان کرنا ہماری بحث کے دائرے سے خارج ہے، اسی وجہ سے الحاد کی طرف میلانات کے فکری اسباب اور اس ضمن میں موجود شبہات کے جواب پر اکتفا کرتے ہیں

سوالات

۱۔ مادی جہان بینی پر تنقید اور اس کے ضمن میں تحقیق کرنے کا فائدہ کیا ہے؟

۲۔ قرن اخیر میں الحاد کی طرف بڑھتے ہوئے رجحانات کیوں پیدا ہوئے؟

۳۔ دین سے منحرف ہونے کے روحی اسباب کیا ہیں؟

٤۔ دین سے انحراف کے اجتماعی عوامل کیا ہیں؟

٥۔ فکری اسباب اور اس کی فروعات کو بیان کریں؟

٦۔ فکری وسواس کیسے وجود میں آتے ہیں؟

۷۔ انحراف کے اسباب سے مقابلہ کرنے کا راستہ کیا ہے؟

تیرہواں درس

چند شبہات کا حل

موجود نامحسوس پر اعتقاد

خدا پر ایمان رکھنے کے سلسلہ میں جہل اور خوف کا کردار

کیا قاعدہ علیت ایک کلی قاعدہ ہے؟

علوم تجربی کے نتائج

نا محسوس موجود پر اعتقاد

خدا شناسی کے ضمن میں ایک معمولی شبہ یہ ہے کس طرح ایک ایسے موجود پر ایمان لا یا جا سکتا ہے کہ جو قابل درک نہیں ہے اور نہ ہی اسے حس کیا جا سکتا؟

یہ شبہ ہمیشہ ان لوگوں کے ذہنوں میں اٹھتا ہے کہ جو قوی فکر کے مالک نہیں ہیں، لیکن ایسے دانشور بھی ہیں کہ جنھوں نے اپنے تفکر کی بنیاد اصالت حس پر قائم کی ہے اور نامحسوس موجود سے انکار ہے یا کم از کم اسے یقینی معرفت سے بعید سمجھا ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ادراکات حسی کو جسم وجسمانیات سے بدن کو مس کرنے کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے اور ہمارے حواس میں سے ہر حس اپنی موقعیت اور خاص شرائط کے تحت مادی موجودات کو درک کرتی ہے اور جس طرح آنکھ سے سننے یا کان سے دیکھنے کی توقع باطل

ہے اسی طرح یہ انتظار بھی باطل ہے کہ ہمارے حواس تمام موجودات کو درک کر لیں گے۔
ایک تو یہ کہ مادی موجودات کے درمیان ایسی بھی چیزیں موجود ہیں جو حس کے دائرے سے باہر ہیں جس طرح کہ ہمارے حواس (ULTRA-VIOLET) اور (INFRA - RED) کے انوار اور الکٹر ومنٹک وغیرہ امواج کو درک کرنے سے عاجز ہے۔
دوسرا یہ کہ ہم بہت سے حقائق کو ظاہری حواس کے علاوہ دوسری راہوں سے درک کرتے ہیں، اوران کے وجود کا یقینی اعتقاد حاصل کر لیتے ہیں جبکہ وہ حس کی قدرت سے باہر ہیں، جیسے کہ ہم خود اپنے ڈر، ارادہ، محبت اور دوسری صفات سے آگاہ ہیں، اوران کے وجود پر پورا ایمان بھی رکھتے ہیں، حالانکہ یہ روحی آثار خود روح کی طرح حس کے دائرے سے باہر ہیں، اس کے علاوہ خود ادراک ایک غیر عادی اور نامحسوس امر ہے۔
لہذا حواس کے ذریعہ کسی چیز کا درک نہ ہونا نہ تنہا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا بلکہ اسے بعید بھی نہیں کہا جا سکتا۔

خدا پر ایمان رکھنے کے سلسلہ میں جہل اور خوف کا کردار۔

جامعہ شناسوں کی طرف سے دوسرا شبہ جو پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خدا پر اعتقاد رکھنا، خوف و خطر کی وجہ سے ہے بجلی یا زلزلہ یا اسی طرح کے اور دوسرے خطرات کی وجہ سے یہ تصور وجود میں آیا ہے دراصل بشر نے اپنی روحی اطمینان کی خاطر (العیاذ باللہ) ایک خیالی موجود بنام

اللہ کو مانا ہے اور اس کی عبادت میں مشغول ہے، اسی وجہ سے خطرات کے مقابلہ میں محافظت کا امکان جس قدر بڑھتی جاتی ہے یا خطرات، حوادثات کے اسباب و علل جیسے جیسے آشکار ہوتے جاتے ہیں ویسے اسی اعتبار سے خدا پر ایمان ضعیف ہوتا جاتا ہے۔

مارکسیسم نے اس شبہ کو اپنی کتابوں میں بعنوانعلم جامعہ شناسی کے نتائج کے تحت بڑی آب وتاب کے ساتھ بیان کیا ہے جسے غیر مطلع لوگوں کو دھوکا دینے کا ایک بہترین وسیلہ تصور کیا جاتا ہے

اس شبہ کے جواب میں یہ کہنا بہتر ہے کہ سب سے پہلے یہ شبہ تنہا ایک مفروضہ ہے جسے بعض جامعہ شناسوں نے پیش کیا ہے اور اس کے صحیح ہونے پر کسی بھی علمی دلیل کا وجودنہیں ہے۔

دوسرے، اس زمانہ میں بہت بڑے بڑے مفکرین تھے جو ہر ایک سے زائد حوادثات کے علل واسباب سے آگاہ تھے اور خدائے حکیم پر مضبوط عقیدہ رکھتے تھے اور اب بھی اسی عقیدہ باقی ہیں، (۱) ایسا ہرگزنہیں ہے کہ خدا پر ایمان رکھنا خوف وجہل کا نتیجہ ہے۔

تیسرے، اگر بعض حوادثات سے خوف یا اس کے و اسباب سے نا آگاہی ہی خدا پر اایمان رکھنے کا سبب ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگزنہیں ہے کہ وجود خدا خوف وجہل کا نتیجہ ہے جس طرح سے کہ بہت سے روحی اثرات جیسے لذت طلبی اور شہرت طلبی وغیرہ... علمی وفنی اور فلسفی انکشافات کا سبب ہے، لیکن یہ ان کے اعتبار کو خدشہ دارنہیں کرتا۔

چوتھے: اگر بعض لوگوں نے خدا کو، اس عنوان سے پہچانا ہے کہ وہ مجہول العلۃ حوادثات کو وجود

بخشنے والا ہے یہاں تک کہ اگر علل واسباب کے آشکار ہونے کی وجہ سے ان کے ایمان میں کمی واقع ہوگئی ہے تو یہ خدا پر اعتقاد کے معتبر نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی بلکہ یہ سب کچھ ان کے ایمان کے ضعیف ہونے کی علامت ہے، اس لئے کہ جہانی حوادثات کی بہ نسبت خدا کا علت قرار دیا جانا، اسکی طبیعی علتوں کے اثر انداز ہونے کی سنخیت کے اعتبار سے علت خدا کے عرض میں واقع نہیں ہے بلکہ ایک ایسی علت ہے جو ہر ایک کو شامل ہوتی ہے، اور تمام مادی وغیر مادی علتوں کے پہچاننے یا نہ پہچاننے میں اس کے طول میں موثر ہے، اور اس کی نفی و اثبات کے لئے کسی بھی قسم کی تاثیر سے عاری ہے۔(۲)

کیا قاعدہ علیت ایک قاعدہ کلی ہے۔

شبہات میں سے ایک شبہ جسے غربی دانشمندوں نے بیان کیا ہے یہ ہے کہ اگر اصل علیت کلیت سے متصف ہے تو پھر خدا کے لئے بھی علت کا ہونا ضروری ہے، حالانکہ اس کے لئے فرض یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی علت نہیں ہے لہذا بے علت خدا کو ماننا قانون علیت کا نقض کرنا اور عدم کلیت

پر دلیل ہے، اور اگر قاعدہ علیت کی کلیت کو نہ مانیں تو پھر واجب الوجود کو ثابت کرنے کے لئے اس

....

(۱) جیسے انشٹن، کرسی وریس والکسیس کارل اور دوسرے برجستہ مفکرین کہ جنھوں نے وجود

کے اثبات کے لئے مقالہ تحریر کئے جن میں سے بعض مقالے جات کو کتاب اثبات وجود خدا میں جمع کیا گیا ہے۔

(۲) آئندہ دروس میں مزید وضاحت آئے گی۔

قاعدہ وقانون سے استفادہ نہیں کر سکتے، اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ اصل مادہ یا انرجی خود بخود علت کے بغیر وجود میں آ گیا ہو، اور اس میں ہونے والے تغیرات کی وجہ سے تمام موجودات ظہور میں آئے ہیں۔

یہ شبہ بھی جیسا کہ ساتویں درس میں اشارہ کیا جا چکا ہے، قاعدہ علیت کے تحت کی گئی غلط تفسیر کا نتیجہ ہے، یعنی ان لوگوں نے یہ تصور کرلیا ہے کہ اس قاعدہ کا مفاد یہ ہے کہ (ہر شی موجود علت کی محتاج ہے) جبکہ اس کی صحیح تعبیر یہ ہے کہ (ہر ممکن الوجود یا وابستہ موجود علت کا محتاج ہے) یہ ایک استثنا ناپذیر قاعدہ کلی ہے، لیکن یہ فرضیہ کہ اصل مادہ یا انرجی علت کے بغیر وجود میں آجائے اور اس میں ہونے والے تغیرات کی وجہ سے یہ جہان خلق ہو جائے، اشکالات و اعتراضات سے خارج نہیں ہے، جسے ہم آئندہ دروس میں بیان کریں گے۔

علوم اجتماعی کے نتائج۔

ایک شبہ یہ ہے کہ جہان و انسان کے پیدا کرنے والے وجود پر اعتقاد رکھنا جدید علوم کی رو سے سازگار نہیں ہے مثلاً کمیسٹری میں یہ بات مسلم ہے کہ مادہ اور انرجی ہمیشہ ثابت ہیں لہٰذا کوئی بھی شی عدم سے وجود میں نہیں آتی اور کوئی موجود بھی پوری طرح فنا نہیں ہوتا حالانکہ خدا

پر عقیدہ رکھنے والوں کا یہ کہنا ہے کہ اس نے مخلوقات کو عدم سے، ہستی کی صورت میں وجود بخشا ہے۔

اسی طرح بیالوجی میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زندہ موجودات بے جان موجودات سے متولد ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ انھیں کمال حاصل ہوتا ہے، یہاں تک کہ انسان وجود میں آتا ہے حالانکہ خدا پر ایمان رکھنے والوں کا عقیدہ ہے کہ اس نے ہر ایک کو جداگانہ خلق کیا ہے۔

جواب میں یہ کہنا بہتر ہے کہ

پہلے یہ کہ مادہ اورانرجی کی بقا کا قانون ایک علمی اور تجربی قانون کے عنوان سے تنہا ان موجودات کے لئے ثابت ہے کہ جو قابل تجزیہ ہیں، لہٰذا اس کے ذریعہ اس فلسفی مسئلہ کو حل نہیں کیا جاسکتا، کہ مادہ یا انرجی ازلی وابدی ہیں یا نہیں؟

دوسرے یہ کہ مجموعی اعتبار سے مادہ، انرجی کا ثابت ہونا اور اس کی ہمیشگی سے تعلق رکھنا کسی خالق سے بے نیازی کی دلیل نہیں ہے بلکہ دنیاء جہان کی عمر جس قدر بھی طولانی ہوگی اس خالق کی ضرورت اتنی ہی زیادہ ہوگی، اس لئے کہ معلول کے لئے علت کی احتیاج کا معیار اس کی ذاتی وابستگی اور اس کا ممکن ہونا ہے نہ یہ کہ وہ حادث ہے اور محدودیت (قید) زمانی سے متصف ہے۔

ایک دوسری تعبیر کے مطابق مادہ اور انرجی جہان کی علت مادی کو تشکیل دیتے ہیں، نہ علت فاعلی کو بلکہ وہ خود علت فاعلی کے محتاج ہیں۔

تیسرے، مادہ وانرجی کے ثابت ہونے کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ نئے موجودات وجود میں نہ

آئیں اوران میں کمی یا زیادتی واقع نہ ہو، بلکہ بعض موجودات جیسے روح، عقل ارادہ وغیرہ مادہ اورانرجی کی قسم سے نہیں ہیں، کہ جس کی کمی یا زیادتی، مادہ اورانرجی کے قانون بقا سے منافات رکھے۔

چوتھے: فرضیہ تکامل جسے ابھی تک پوری طرح علمی حلقے میں اعتبار نہیں ملا ہے اور جسے بہت سے مفکرین نے رد کیا ہے، خدا پر اعتقاد رکھنے سے منافات نہیں رکھتا، اور حد اکثر زندہ موجودات کے درمیان صرف علت اعدادی کو ثابت کرتا ہے نہ یہ کہ خدا سے اس کے رابطہ کی نفی کرتا ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ اسی فرضیہ کے بہت سے طرفدار آج بھی اور گذشتہ ادوار میں جہان وانسان کے پیدا کرنے والے پر ایمان رکھتے تھے اور رکھتے آئے ہیں۔

سوالات

١۔حس گرائی اورنامحسوس امور کے انکار پر کیا اشکالات ہیں؟

٢۔وہ اشکالات کیا ہیں جو بعض ماہر سماجیات کے فرضیہ پر وارد ہوئے ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ وجود خدا کا نظریہ انسان کے خوف وجہل کا نتیجہ ہے؟

٣۔کیا وجود خدا پر ایمان رکھنے کا عقیدہ علیت کی کلیت سے منافات رکھتا ہے؟ کیوں؟

٤۔کیا مادہ اورانرجی کی بقا کا قانون پروردگار عالم پر اعتقاد رکھنے منافات رکھتا ہے؟ کیوں؟

٥۔کیا فرضیہ تکامل وجود خدا پر ایمان رکھنے کے عقیدہ کو باطل قرار دیتا ہے؟ کیوں؟

چودہواں درس

مادی جہان بینی اوراس پر تنقید

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے۔

مادی جہان بینی کے اصول

اصل اول

اصل دوم

اصل سوم

اصل چہام

مادی جہان بینی کے اصول

مادی جہان بینی کے لئے درج ذیل اصول فرض کئے جا سکتے ہیں

پہلی اصل: ہستی جو مادہ (۱) اور مادیات کے ہم پلّہ و مساوی ہے اوراسی چیز کو موجود کا نام دیا جا سکتا ہے کہ جو یا تو مادہ اور جسم سے متصف ہونے کے علاوہ ابعاد ثلاثہ (طول، عرض، عمق) سے متصف ہو، یا مادہ کے خواص میں سے اس کا شمار ہو اوراسی ضمن میں مادہ بھی قابل تقسیم اور کمیت کا حامل ہے لہذا اسی اصل کی بنیاد پر خدا کے وجود کا ایک غیر مادی اور طبیعت سے بلند

موجود ہونے کے عنوان سے انکار کردیا جاتا ہے۔

دوسری اصل: مادہ ازلی و ابدی نیز نا قابل خلق ہے اور کسی علت کا محتاج بھی نہیں ہے اور اصطلاح فلسفی کے مطابق واجب الوجود ہے۔

تیسری اصل: اس جہان کے لئے علت غائی اور کسی ہدف کا تصور نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ کسی باشعور فاعل کا وجود نہیں ہے کہ جس کے لئے ہدف کا تصور کیا جائے۔

....

(١) مفہوم مادہ اور اس کی تعریف سے زیادہ آشنائی کے لئے پاسداری از سنگر ہائی آئیڈیا لوجیک،، جہان بینی مادی ص ٢٩٢ ٢٩٧ اور آموزش فلسفہ ج ٢ ص ٤١ اکتالیسویں درس کی طرف رجوع کریں۔

چوتھی اصل: اس جہان کے موجودات، (اصل مادہ کے علاوہ) مادہ کے ذرات کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں، اسی وجہ سے گذشتہ موجودات کو آنے والے موجودات کے لئے شرط اور علت اعدادی مانا جاتا ہے، اور مادیات کے درمیان اکثر ایک قسم کی فاعل طبیعی کو قبول کیا جاتا ہے، جیسے کہ درخت کے پھل کے لئے فاعل طبیعی یا بیالوجی اور کمیسٹر ی کے اثرات کو خود اسی کی طرف نسبت دی گی ہے، پھر کسی بھی موجود کے لئے فاعل الٰہی اور ہستی بخش کی ضرورت نہیں ہے۔

مذکورہ اصول کے علاوہ اصل پنجم کا اضافہ کیا گیا ہے جو معرفت شناسی سے مربوط ہے بلکہ ایک طرح سے تمام اصول پر مقدم ہے اور وہ یہ ہے کہ صرف اسی شناخت کو معتبر مانا جا سکتا ہے کہ

جوتجربہ حسی کے نتیجہ میں حاصل ہو،اور چونکہ حسی تجربہ صرف مادہ اور مادیات کے وجود کوثابت کرتے ہیں لہٰذا کسی بھی شی کا وجود غیر قابل قبول ہے۔

لیکن اس اصل پنجم کا باطل ہونا گذشتہ درس میں بیان کیا جاچکا ہے(۱) جسے دوبارہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ بقیہ چار اصول کے سلسلہ میں گفتگو جاری رہے گی۔

پہلی اصل۔

مادی جہان بینی میں اس اصل کا شمار بنیادی اصول میں کیا جاتا ہے لیکن یہ اصل بے بنیاد دعوے کے علاوہ کچھ نہیں ہے،اور ماوراءطبیعت کے انکار کے لئے کسی بھی قسم کے برہان و دلیل قائم نہیں کی جاسکتی، بالخصوص ماٹریالسٹی معرفت شناسی کے ذریعہ کہ جس کی بنیاد اصالت حس وتجربہ پر قائم ہے، ماوراءطبیعت کی نفی پر دلیل لانا غیر ممکن ہے،اس لئے کہ یہ بات بخوبی روشن ہے کہ کوئی بھی حس

....

(۱)اس سلسلہ میں مزید اطلاح کے لئے آئیڈیا لوجی تطبیقی کے آٹھویں درس سے سولہویں درس تک،اورآموزش فلسفہ کے تیرہویں درس سے اٹھارہویں درس تک کا مطالعہ کیا جائے۔

تجربی،،اپنے حدود یعنی مادہ اور مادیات سے ہٹ کر کسی شی کی نفی یا اثبات کا فریضہ انجام نہیں دے سکتی

،حس گرائی کی منطق کی بنا پر حد اکثر جو مطلب ثابت کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ حس تجربی،،

سے ماوراء طبیعت کو ثابت نہیں کیا جا سکتا، لہذا اس صورت میں کم از کم اس کے موجود ہونے کا احتمال باقی رہ جاتا ہے، اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ انسان بہت سے غیر مادی موجودات کو جو مادہ کی خصوصیات کی حامل نہیں ہیں منجملہ روح کو، اپنے علم حضوری کے ذریعہ درک کر لیتا ہے، اس کے علاوہ بھی مجردات کے اثبات میں بے شمار دلیلیں فلسفی کتابوں میں ذکر کی گئیں ہیں۔(۱)

موجود مجرد یعنی روح کے شواہد میں سے رویائے صادقہ، مرتاضوں کے خارق عادات امور اور انبیائ، ائمہ علیہم السلام اور اولیا الٰہی کے معجزات وکرامات ہیں (۲) بہر حال خدا کے وجود اور اس کے جسمانی نہ ہونے پر جو دلائل قائم کئے گئے ہیں اس اصل کے بطلان کے لئے کافی ہیں۔(۳)

دوسری اصل۔

اسی اصل میں مادہ کے ازلی اور ابدی ہونے پر تاکید اور پھر یہ نتیجہ حاصل کیا گیا ہے کہ وہ خلق کئے جانے سے مستغنی ہے۔

لیکن مادہ کا ازلی اور ابدی ہونا، علمی اور تجربی دلائل کے ذریعہ یہ بات قابل اثبات نہیں ہے اس لئے کہ تجربہ کا دائرہ محدود ہے اس لئے کہ کوئی بھی تجربہ زمان ومکان کے اعتبار سے جہان کے بے نہایت ہونے کو ثابت نہیں کرتا۔

....

(۱) نمونہ کے لئے آموزش فلسفہ ج ۲ چوالیسویں درس سے انچاسویں درس کا مطالعہ کریں۔
(۲) کتاب (نقدی فشردہ براصول مارکسیسم) میں دوسرے درس کی طرف رجوع کریں۔
(۳) اسی کتاب کے ساتویں اور آٹھویں درس کا مطالعہ کیا جائے اسی طرح کتاب آموزش فلسفہ کے باسٹھویں اور ترسٹھویں درس کا مطالہ کیا جائے۔

اور مادہ کا ازلی ہونا اس بات کا لازمہ نہیں ہے کہ وہ خالق سے بے نیاز ہے جس طرح سے کہ ایک ازلی مکینکی حرکت کا فرض، ازلی قوتِ محرک کا لازمہ ہے نہ یہ کہ وہ قوت محرک سے بے نیاز ہے مادہ کا خلق ہونے سے مستغنی ہونا، واجب الوجود ہونے کے مساوی ہے، اور ہم نے آٹھویں درس میں اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ مادہ کا واجب الوجود ہونا محال ہے۔

تیسری اصل

تیسری اصل جہان کے ہدف مند ہونے کا انکار ہے جس کے نتیجہ میں خالق کے منکر ہونے کا لازمہ پیش آتا ہے، لہٰذا خدا کے وجود کے ثابت ہونے کے ساتھ یہ اصل بھی باطل ہو جاتی ہے، اس کے علاوہ یہ سوال باقی ہے کہ ایک عقلمند انسان اس منظم جہان کو دیکھتے ہوئے کس طرح اس کے بے ھدف ہونے کو مان سکتا ہے جبکہ اس میں نہایت نظم وضبط کے علاوہ بے شمار آثار وفوائد رونما ہیں۔

چوتھی اصل۔

چوتھی اصل مادی موجودات میں علیت کو منحصر سمجھنا ہے، لیکن اس اصل پر بے شمار اعتراضات ہیں جن میں سے مہم ترین اعتراضات درج ذیل ہیں۔

پہلے یہ کہ اس اصل کی بنیاد پر اس جہان بینی میں کسی نئے موجود کا وجود میں آنا غیر ممکن ہے، حالانکہ ہم برابر عالم انسان اور حیوانات میں نئے موجودات کی پیدائش کے شاہد ہیں، کہ جن میں سے مہم ترین حیات، شعور، عواطف، احساسات اور افکار ہیں۔

ماٹریالیسٹوں کا کہنا ہے کہ یہ موجودات مادہ کے خواص کے علاوہ کچھ اور نہیں ہیں۔

تو ان کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کے امتداد اور تقسیم پذیری مادہ اور مادیات کی خصوصیات میں سے ہے جبکہ یہ خصوصیات ان کے وجود میں نہیں پائی جاتیں۔

اور وہ موجودات جنھیں مادہ کے خواص کے نام سے یاد کیا جاتا ہے بے شک یہ خواص بے جان مادہ میں نہیں پائے جاتے یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق مادہ ایک مدت تک ان خواص سے عاری ہے اور ایک مدت کے بعد وہ ان سے متصف ہو جاتا ہے، پس وہ موجودات جنھیں خواص مادہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اسے بھی کسی خالق کی ضرورت ہوگی جو اسے مادہ کی صورت میں وجود بخشے اور یہ وہی

علّت ہے کہ جسے علت ایجادی اور ہستی بخش کہتے ہیں۔

اس قول کے تحت ایک دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس قول کی بنیاد پر تمام موجودات کا وجود میں

آنا جبری ہے، اس لئے کہ مادہ کی تأثیر اور اس کے تأثرات میں انتخاب واختیار کا کوئی وجود نہیں ہے، اور اختیار سے انکار خلاف وجدان ہونے کے علاوہ تمام معنوی واخلاقی اقدار کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی ذمہ داریوں سے انکار کا ہے اور ظاہر ہے کہ معنوی اقدار اور ذمہ داری سے انکار کے نتیجہ میں انسانی زندگی میں کس طرح کے اثرات مرتب ہوں گے ؟! (وہ سب عیاں ہیں) آخر کار، مادہ کے واجب الوجود نہ ہونے کی صورت میں جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے، کسی نہ کسی علّت کی ضرورت ہوگی، اور یہ علت کبھی بھی علت طبیعی اور علت اعدادی نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ روابط تنہا مادیات میں ایک دوسرے کے ساتھ متصور ہیں، لیکن تمام مادہ کا، علت کے ساتھ اس طرح کے رابطہ ہونے کا تصور نہیں کیا جا سکتا، لہذا جو علت بھی مادہ کو وجود بخشے گی وہ علت ایجادی اور ماوراء مادی ہوگی۔

سوالات

١۔ مادی جہان بینی کے اصول بیان کریں؟

٢۔ مادہ اور مادی شی کی تعریف کریں؟

٣۔ پہلی اصل پر ہونے والے اشکالات کو بیان کریں؟

٤۔ دوسری اصل پر ہونے والے اشکالات کو بیان کریں؟

٥۔ تیسری اصل پر تنقید کریں؟

٦۔ چوتھی اصل پر ہونے والے اشکالات کو بیان کریں؟

پندرہواں درس

ماٹریالیسم ڈیالٹیک اوراس پر تنقید

مکینکی اورڈیالٹیکی ماٹریالیسم

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے

قاعدہ تضاداوراس پر تنقید

قاعدہ جہش اوراس پر تنقید

قاعدہ نفی نفی اوراس پر تنقید

مکینکی اورڈیالٹیکی ماٹریالیسم

ماٹریالیسم کی مختلف شاخیں ہیں، کہ جن میں سے ہرایک اپنے اندار میں کائنات اوراس کی اشیا کی پیدائش کو بیان کرتا ہے لیکن عصر جدید کے آغاز میں ان لوگوں نے جہان کے موجودات کی پیدائش کو مکینکی حرکت کی بنیاد پر مفاہیم فیزیک نیوٹنی کے ذریعہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے، اور ہراس حرکت کو قوتِ محرّکہ کا معلول سمجھا ہے کہ جو خارج سے جسم متحرک میں داخل ہوئی ہے، ایک اورتعبیر کے مطابق وہ لوگ اس جہان کو ایک عظیم گاڑی کی طرح تصور کرتے ہیں کہ جس میں قوت محرک ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں منتقل ہوتی ہے اوراس طرح یہ عظیم

گاڑی حرکت میں آجاتی ہے۔

یہ فرضیہ(ماٹریالیسم مکینکی) کے نام سے مشہور ہوا ہے مختلف جہت سے اس نظریہ کے ضعیف ہونے کی وجہ سے، مخالفین کی جانب سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، منجملہ یہ کہ اگر ہر حرکت ،قوت خارجی کا معلول ہے تو اس صورت میں جہان کے مادۂ اول کے لئے بھی ، کسی قوت کوفرض کرنا ہوگا کہ جوخارج سے اس کے جسم میں داخل ہوئی ہواوراس امر کالازمی نتیجہ یہ ہوگا، ماوراء مادہ ایک قوت کو

قبول کرنا ہوگاہ جوکم ازکم عالم مادہ میں پہلی حرکت کا عامل بنی ہو۔

دوسرا نقطہ ضعف یہ ہے کہ مکینکی قوت کے ذریعہ صرف وضعی اورانتقالی حرکات کی توجیہ کی جاسکتی ہے حالانکہ تمام موجودات جہان کو مکانی تغیرات میں منحصر نہیں سمجھا جا سکتا، لہٰذا موجودات جہان کی پیدائش میں کسی اورموجودکوعامل ماننا پڑے گا۔

ان اعتراضات کے سامنے مکینکی ماٹریالیسم کی ناتوانی سبب بنی ،کہ وہ لوگ اس جہان کی پیدائش کے لئے کسی دوسرے عامل کی تلاش شروع کریں لہذا انھوں نے بعض حرکات کو بصورت ڈینامیکی تفسیر کی،اور مادہ کے لئے ایک قسم کی خودتحرکی کانظریہ تسلیم کرلیا۔

مکتب ماٹریالیسم دیالٹیک کے نظریہ کی بنیاد رکھنے والے منجملہ (مارکس وانگلس ہگل) ہیں کے انھوں نے مادی موجودات کے باطنی تضاد کو عامل حرکت کے عنوان سے پہچنوانے کی کوشش کی ہے، اور اصول مادہ کا ابدی اورخلق ہونے سے مبرا ہونا، موجودات کا ایک دوسرے پراثر انداز ہونا اوراجتماعی حرکت کوقبول کرنے کے علاوہ اپنے فرضیہ کوثابت کرنے

کے لئے جدید اصول پیش کئے۔

(۱) قاعدہ تضاد (۲) کمی تغیرات کو کیفی تغیرات میں تبدیل کرنا (۳) قاعدہ نفی نفی یا (طبیعت میں تحقیق وجستجو کا قانون) اب اس کے بعد ہم ان تینوں اصل کو بیان کریں گے اور اس پر ہونے والے اعتراض کو ذکر کریں گے۔

قاعدہ تضاد،، ماٹریالیسم ڈیالٹیک کے مطابق ہر موجود دو ضدوں سے مرکب ہے (فعال وغیر فعال) (THESE ANTI THESE) موجودات میں تضاد کا پایا جانا حرکت کا سبب ہے، یہاں تک کہ غیر فعال غالب ہوجاتا ہے اور ایک دوسرا موجود جو (انقلاب) (CENTTHESE) کے نام سے وجود میں آتا ہے، جیسے انڈا جو اپنے آغاز میں ایک نطفہ ہوتا ہے کہ جو آہستہ آہستہ رشد کرتا ہے اور ایک مدت کے بعد ایک بچہ جو بہ صورت انقلاب (CENTTHESE) ہے وجود میں آتا ہے۔

فیزیک میں مثبت اور منفی ،تضاد کا ایک نمونہ ہے جس طرح سے کہ جمع وتفریق ابتدائی ریاضیات میں تضاد کا ایک نمونہ ہے، اور کامل ریاضی میں جمع اور تفریق تضاد کا ایک نمونہ ہے یہ کیفیت موجودات اجتماعی اور تاریخی میں بھی قابل مشاہدہ ہے مثلاً دولت مندوں کے مقابلہ میں فقراء غیر فعال

(ANTI THESE) ہیں جو آہستہ آہستہ رشد کرتے ہیں اور دولتمندوں کے مقابلہ میں کامیاب ہوجاتے ہیں اس طرح دولتمندوں کے مقابلہ میں انقلاب (CENTTHESE) فقراء کی جماعت بصورت سوسیالسٹی اور کمیونسٹی وجود میں آجاتی ہے۔

تنقید۔

آغاز سخن میں اس نکتہ کی طرف توجہ رہے کہ دو مادی موجود کا اس طرح اکٹھا ہونا کہ ایک دوسرے کی تضعیف کا سبب بنے ، یا ایک دوسرے کی نابودی کا درپے ہو، اس مطلب کو ہر ایک نے قبول کیا ہے جیسا کہ اس کی مثال آگ اور پانی کے اکٹھا ہونے کی صورت میں دی جاتی ہے لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے اور اسے تمام موجودات پر صادق آنے والے قاعدہ کے عنوان سے نہیں مانا جاسکتا، اس لئے کہ اس ضمن میں سیکڑوں مثالیں موجود ہیں۔

دوسرے یہ کہ بعض مادی موجودات میں تضاد کا پایا جانا، اس تناقض و تضاد سے کہ جو منطق و فلسفہ کی کتابوں میں ذکر ہوئے ہیں، اور جن کا محال ہونا بدہی ہے کسی بھی حال میں کوئی ربط نہیں ہے، اس لئے کہ (موضوعِ واحد) میں اجتماعِ ضدین کو محال سمجھا گیا ہے اور جو مثالیں بیان کی گئیں ہیں ان میں موضوعِ واحد نہیں ہے، اور مارکسسٹوں نے ضدین کے تحت جو مثالیں (اجتماع جمع وتفریق میں) پیش کی ہیں ان کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اسی طرح ان پیشنگوئیوں کو ذکر کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے جو نظام سرمایہ داری سے متصف ممالک میں حکومت وکارگر کے قیام میں بیان کی گئی ہیں۔

تیسرے یہ کہ اگر ہر موجود دوضدوں کا مجموعہ ہو تو ان میں فعاّل اور غیر فعاّل کے لئے بھی ایک دوسری ترکیب کو فرض کرنا پڑے گا، اس لئے کہ وہ بھی ایک موجود ہیں، اور اصل مذکور کی بنیاد پر ان کا بھی دوضدوں سے مرکب ہونا ضروری ہے، اس طرح ہر محدود موجود کا بے نہایت

اضداد سے مرکب ہونا لازم آتا ہے۔

لیکن وہ باطنی تضاد جسے عاملِ حرکت کے عنوان سے پہچنوایا گیا ہے اور اس طرح مکینکی ماٹریالیسم کے نقطہ ضعف کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس پر ہونے والے اعتراضات میں سے ایک معمولی اعتراض یہ ہے کہ اس فرضیہ کے لئے کسی بھی علمی دلیل کا وجود نہیں ہے اس کے علاوہ خارجی قوت کے ذریعہ وجود میں آنے والی مکینکی حرکت سے کسی بھی حال میں انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن فوٹبال کی حرکت کو اس کے داخلی تضاد کا نتیجہ سمجھنا باطل ہے۔

قاعدہ جہش۔

چونکہ جہان میں ہونے والے تغیرات تدریجی اور ایک سمت میں رواں نہیں ہیں، اور بعض اوقات ایسے موجودات میں وجود پائے جاتے ہیں کہ جو گذشتہ موجودات سے کسی بھی صورت میں مشابہ نہیں ہوتے اور انھیں گذشتہ حرکت کی ایک کڑی نہیں مان سکتے لہٰذا مارکسسٹوں نے ایک دوسری اصل بنام جہش یا بنام (تغیرات کمی (مقداری) سے تغیرات کیفی میں منتقل ہو جانا) کا سہارا لیا اور اس طرح بیان کرنے کی کوشش کی، کہ تغیرات کمی جب ایک معین حد تک پہنچ جاتی ہے تو وہ تغیری کیفی کی پیدائش کا سبب بن جاتی ہے جس طرح سے کہ جب پانی کی حرارت ایک معین مقدار تک پہنچ جائے تو وہ پانی بخار میں تبدیل ہو جاتا ہے یا جب ایک دھات حرارت میں اپنی معین مقدار کو پہنچ جائے تو وہ پگھل جاتی ہے اسی طرح جب سماج میں اختلافات شدید ہو جائے تو انقلاب وجود میں آ جاتا ہے۔

تنقید۔

پہلے تو یہ کہ کسی بھی حال میں کمیت کیفیت میں نہیں بدلتی، ہاں اتنا ضرور ہے کہ کسی خاص موجود کی پیدائش میں ایک معین کمیّت کے وجود کی ضرورت ہے، جیسے پانی کا درجہ حرارت، بخار میں تبدیل جہیں ہوتا بلکہ پانی کے بخار میں تبدیل ہونے کے لئے ایک معین مقدار میں حرارت کا پایا جانا ضروری ہے۔

دوسرے یہ کہ،ضروری نہیں ہے کہ یہ کمیت لازم،سابقہ کمیت میں بالتدریج اضافہ کی وجہ سے ہے، بلکہ سابقہ کمیّت میں کمی واقع ہونے کے سبب جدید کمیت کے وجود میں آنے کا امکان ہے،جیسے کہ بخار کا پانی میں تبدیل ہونا حرارت کے کم ہونے پر مشروط ہے۔

تیسرے یہ کہ کیفی تغیرات ہمیشہ ناگہانی نہیں ہیں، بلکہ بہت سے مقامات پر تدریجی ہوتے ہیں،جیسا کہ موم اور شیشہ کا پگھلنا تدریجی ہے۔

ہاں جس حقیقت کو یہاں مانا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ بعض طبیعی موجودات کے متحقق ہونے کے لئے ایک کمیت کا ہونا ضروری ہے،لیکن کمیت کا کیفیت میں تبدیل،کمیت میں تدریجی اعتبار سے اضافہ کا لازم ہونا اور تمام کیفی تغیرات کے لئے ایسی کلیت کو تسلیم کر لینا،کسی بھی حال میں قابل قبول نہیں، لہذا قانون جہان شمول بنام (تغیرات کمی سے تغیرات کیفی میں منتقل ہوجانے) کا کوئی وجود نہیں ہے۔

قاعدہ نفی نفی۔

قاعدہ نفی نفی کا مطلب کہ جسے کبھی قانون تکامل ضدین یا جستجو طبیعت کا نام دیا جاتا ہے یہ ہے دیالتکی تحولات اور تغیرات میں ہمیشہ فعال (THESE) کے ذریعہ غیر فعال (ANTI THESE) کی نفی کی جاتی ہے اور خود بخود غیر فعال انقلاب (CENTTHESE ANTI THESE) کے ذریعہ منتفی ہوجاتا ہے، جیسا کہ گھاس دانہ کی نفی کرتی ہے اور خود وہ گھاس نئے دانوں کے وجود میں آجانے کی وجہ سے منتفی ہوجاتی ہے، اسی طرح نطفہ انڈے کی نفی کرتا ہے اور وہ خود چوزہ کے ذریعہ منتفی ہوجاتا ہے، یعنی ہر آنے والا وجود گذشتہ موجود کی بہ نسبت کامل تر ہوتا ہے اور اس اصل قاعدہ کی اہمیت اسی نکتہ میں پوشیدہ ہے کہ یہ (تغیرات کی کیفیت کو آشکار کرتی ہے، اور تغیرات کو کمال کی جانب رواں دواں ہونے کی طرف تاکید کرتی ہے۔

تنقید۔

اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر تغیر وتحول کے بعد سابقہ حالت متغیر ہوجاتی ہے اور ایک جدید شکل اختیار کرلیتی ہے اور اگر قاعدہ نفی نفی کو اسی معنی میں لیا جائے تو پھر اس کے معنی لوازم تغیر کے بیان کرنے کہ علاوہ کچھ اور نہیں ہیں لیکن اس اصل کے لئے جن تفسیروں کو ذکر کیا گیا ہے وہ جہت حرکت اور اس کے تکاملی (بہ تدریج کامل) ہونے کو بیان کرنے والی ہیں لہذا اس کے مطابق یہ کہنا بہتر ہے کہ جہان کے تمام تغیرات کا مطلب یہ ہے کہ ہر ہونے والا وجود

گذشتہ موجود سے کامل ہونا چاہیئے، لیکن یہ امر قابل قبول نہیں ہے، کیا یورنیسم ،، شعاعوں کے اثر سے سرب میں تبدیل ہونے کی وجہ سے کامل ہو جاتی ہے؟ کیا پانی بخار میں بدل جانے کے بعد تکامل یافتہ ہوجاتا ہے؟ یا بخار کے پانی میں بدل جانے کی وجہ سے اسے کمال مل جاتا ہے؟ کیا جو درخت خشک ہوجاتے ہیں اور ثمر دینے کی قوت کھوب بیٹھتے ہیں وہ راہ کمال کی طرف گامزن ہیں؟ ان تمام شواہد کے ہوتے ہوئے صرف بعض موجودات کے سلسلہ میں قانون تکامل کو مانا جاسکتا ہے، لیکن تمام موجودات کے لئے ایک کلی قانون ہونے کے عنوان سے اسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

آخرکار اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اگر بالفرض ان تمام اصول (قواعد) کا کلی ہونا مان لیا جائے تو یہ علوم طبیعی میں ثابت شدہ قوانین موجودات کی پیدائش کی کیفیت ہی کو بیان کرسکتے ہیں، لیکن جہان میں قانون کلی کے ثابت ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موجودات علت جہان آفرین سے بے نیاز ہوں، اور جیسے کہ ہم سابق میں بیان کر چکے ہیں کہ مادہ اور مادیات ممکن الوجود ہیں، لہٰذا ان کا واجب الوجود کا محتاج ہونا ضروری ہے۔

سوالات

۱۔ ماٹریالیسم ڈیالٹیکی اور مکینکی کے درمیان موجود فرق کی وضاحت کریں؟

۲۔ قاعدہ تضاد کی شرح پیش کریں اور اس پر ہونے والے اشکالات ذکر کریں؟

۳۔ قاعدہ جہش اور اس پر ہونے والے اشکالات ذکر کریں؟

٤۔ قاعدہ نفی نفی کو بیان کرتے ہوئے اس پر تنقید کریں؟

٥۔ کیا ان قواعد کے کلی ہونے کی صورت میں انکا جہان کے خالق سے بے نیاز ہونا ثابت ہوتا ہے؟ کیوں؟

سولھواں درس

خدا کی لاثانیت

مقدمہ

اس کی لاثانیت پر دلیل

مقدمہ

گذشتہ دروس میں وجود خدا کی ضرورت کوثابت کیا جاچکا ہے،اور آخر کے چند دروس میں مادی جہان بینی کے تحت بحث گذر چکی ہے،اس نظریہ کے تحت تحقیق و جستجو سے یہ پہلو روشن ہو گیا، کہ علت (خدا) کے بغیر جہان کوفرض کرنا، نامعقول اور غیر قابل قبول ہے۔

لیکن اب اس کے بعد،ہم توحید کے سلسلہ میں بحث کریں گے اور مشرکین کے غلط عقائد کو برملا کریں گے،لیکن سوال یہ ہے کہ شرک آمیز عقائد انسانوں کے درمیان کیسے رائج ہوئے، اس سلسلہ میں ماہر سماجیات کے نظریات مختلف ہیں،لیکن ان تمام نظریات میں سے کوئی بھی نظریہ قابل اعتماد دلائل سے متصف نہیں ہے،اس ضمن میں شاید یہ کہنا درست ہو کہ آسمانی اور زمینی موجودات میں تنوع واختلاف،شرک آمیز عقائد میں مبتلا ہونے کا سبب بنا،اس طرح ان لوگوں نے ہر موجود کے لئے ایک خاص خدا کوفرض کرلیا،اچھائیوں اور برائیوں کے لئے الگ الگ خدا کے ہونے پر اعتقاد پیدا کرلیا،اوراس طرح ان لوگوں نے جہان کے لئے دو

خدا فرض کر لئے۔

اس کے علاوہ چونکہ زمینی حوادثات میں جب آفتاب، ماھتاب اور ستاروں کی دخالت کو مشاہدہ کیا تو ان کے ذہنوں میں یہ خیال آیا کہ یہ چاند سورج اور ستارے زمینی موجودات کی بہ نسبت ربوبیت سے متصف ہیں، اور چونکہ اپنی طبیعت میں کسی معبود کی پرستش کولمس کرتے تھے لہٰذا ان لوگوں نے اپنے خیالی معبودوں کے لئے بت بنا لئے، اور ان کی پرستش میں مشغول ہو گئے، اس طرح بتوں کو ضعیف افکار سے متصف لوگوں کے درمیان اصالت مل گئی، اور پھر ہر قبیلہ نے اپنے توھمات کی بنیاد پر بتوں کی عبادت کے لئے قوانین وضع کر لئے تا کہ ایک طرف خدا پرستی کی حس کی تسکین ہوتی رہے اور دوسری طرف اپنی نفسانی خواہشات کو تقدس کا لباس عطا کر سکیں، اور انھیں مذہبی شکل وصورت دے کر اپنی مراد حاصل کر لیں، اسی وجہ سے آج بھی بت پرستوں کے درمیان ناچنا، گانا، شراب نوشی اور شہوت رانی، مذہبی رسومات کے تحت رائج ہے...

مذکورہ تمام عوامل کے علاوہ سب سے مہم وجہ وقت کے ظالموں اور جبارں کی خودخواہی اور تکبر جیسے عوامل سبب بنے، کہ وہ پنا مقصد حاصل کرنے کے لئے سادہ لوح افراد کے افکار سے فائدہ اٹھائیں، لہٰذا اپنی قدرت وحدود سلطنت کو وسعت دینے کے لئے شرک آلود عقائد کی بنیاد ڈالی، اور اس کی ترویج کرتے رہے اور اپنے لئے ایک قسم کی ربوبیت کے قائل ہو گئے اور اس طرح طاغوتوں کی پرستش مذہبی مراسم کا جز شمار کی جانے لگی کہ جس کی مثالیں ہند، چین، ایران اور مصر کے علاوہ دوسرے مما لک میں بھی قابل مشاہدہ ہیں۔

بہرحال شرک آلود ادیان مختلف اسباب وعلل کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں جنہوں نے دین الٰہی کے سایہ میں انسان کے تکامل اور کامیابی کے راستہ میں بڑے موانع ایجاد کئے، اسی وجہ سے انبیاء الٰہی کی تبلیغ کا ایک عظیم حصہ، شرک اور شرک آلودہ افراد سے مقابلہ کے لئے مخصوص تھا۔

لہٰذا شرک آلود عقائد کی بنیاد، جہانی حوادثات کے مقابلہ میں خدا کے علاوہ کسی دوسرے موجود کی ربوبیت کے اعتقاد پر استوار ہے، یہاں تک کہ بہت سے مشرکین اس جہان کے خالق کی، یگانگی کے قائل تھے، اور خالقیت میں توحید کو قبول کرتے تھے، لیکن وہ اس سے کم مرتبہ دوسرے درجہ کے ل داکے بھی قائل تھے جوان کے اعتقاد کے مطابق بطور مستقل اس جہان کو چلانے والے ہیں، اور خالق جہان کو خداؤں کا خدااور رب الارباب کا نام دیتے تھے۔

لیکن یہ کم درجہ والے خدا کہ جس کے اختیار میں کائنات کا نظام ہے بعض لوگوں کے گمان کے مطابق فرشتہ ہیں کہ جنھیں مشرکین عرب خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے، لیکن بعض لوگوں کے خیال کے مطابق جنّات ہیں، یا ستاروں کی روحیں یا گذشتہ لوگوں کی روحیں یا پھر نامرئی موجودات ہیں ہم نے دسویں درس میں اشارہ کردیا ہے کہ حقیقی خالقیت اور ربوبیت کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا خدا کی خالقیت کو قبول کرتے ہوئے کسی دوسری کی ربوبیت کو قبول کرنا درست نہیں ہے اور جو لوگ اس طرح کے عقیدے رکھتے ہیں وہ اس تناقض سے بے خبر ہیں، لہٰذا ان کے عقائد کو باطل کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اسکے تناقض کو بیان کردیا جائے۔

خدا کی یکتائی کے اثبات میں مختلف دلیلیں فلسفی اور کلامی کتابوں میں موجود ہیں، لیکن ہم

یہاں پر صرف انھیں دلائل کو پیش کریں گے کہ جو ربوبیت میں یگانگت کوم براہ راست ثابت کرتے ہوں اور مشرکین کے عقائد کو باطل کرتے ہوں۔

خدا کی لا ثانیت پر برہان و دلیل۔

اگر اس جہان کے لئے دو یا دو سے زائد خداؤں کے فرض کو تسلیم کرلیا جائے تو چند حال سے خالی نہیں، یا یہ کہ اس جہان کی تمام مخلوقات، ان تمام خداؤں کی مخلوق اور معلول قرار پائے گی یا یہ کہ مخلوقات کے مجموعوں، میں سے ہر مجموعہ، مفروض خداؤں میں سے کسی ایک کی مخلوق اور معلول ہوگا یا یہ کہ یہ تمام موجودات، تنہا ایک خدا کی خلق کردہ اور بقیہ خدا مدبّر کی حیثیت سے ہوں گے۔

لیکن ایک موجود کے لئے چند خداؤں کا ہونا محال ہے، اس لئے کہ دو یا چند خالقوں (علت جہان آفرین) کا کسی موجود کو خلق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان خداؤں میں سے ہر ایک، کسی ایک وجود کا افاضہ کرے، جس کے نتیجہ میں متعدد وجود خلق ہو جائیں گے، حالانکہ ہر موجود کے لئے صرف ایک ہی وجود ہے، وگرنہ ایک موجود نہیں رہ سکتا۔

لیکن دوسرا فرض یہ کہ ان خداؤں میں سے ہر ایک، کسی ایک مخلوق یا مخلوقات کے کسی خاص مجموعہ کا خالق کہلائے تو اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ ہر مخلوق اپنے خالق کی مدد سے قائم ہو اور کسی دوسری مخلوق کی محتاج نہ ہو مگر یہ احتیاج ایسی ہو جو اسکے خالق تک پہنچتی ہو اور تنہا وہی خدا اس مخلوق کی رسیدگی کرتا ہو، یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق اس جہان کے لئے چند خداؤں کا

فرض متعدد نظام کے موجود ہونے کا لازمہ ہے جو ایک دوسرے سے جدا ہیں، حالانکہ اس جہان میں صرف ایک ہی نظام ہے اور تمام موجودات ایک دوسرے سے مربوط ہیں، ایک دوسرے سے متاثر ہیں، ایک دوسرے کے محتاج ہیں، گذشتہ وآئندہ کے تمام موجودات میں ارتباط برقرار ہے، ہر موجود اپنے بعد آنے والے موجود کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے پس وہ جہان جس میں صرف ایک ہی نظام برقرار ہے اور اس کے اجزا ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اسے چند علتوں کا معلول (چند خداؤں کا خلق کردہ) نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ تمام مخلوقات کا خالق ایک خدا ہے اور بقیہ خدا جہان کی تدبیر اور اس کی ہدایت کے عہدہ دار ہیں، تو یہ فرض بھی صحیح نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ ہر معلول اپنی پوری ہستی کے ساتھ علت وجود آفرین کے ذریعہ قائم ہے اور کوئی بھی مستقل موجود اس میں تصرف کی قدرت نہیں رکھتا بلکہ یہ تمام معلولات علت وجود آفرین کی طاقت وقدرت کے زیر سایہ ہیں اور تمام تاثیر اور اثر پذیری اس کے اذن تکوینی کے ذریعہ انجام پاتے ہیں، اس بنا پر ان خداؤں میں سے کوئی بھی حقیقی رب نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ رب کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مربوب کی ذات میں بطور مستقل تصرف کرے جبکہ فرض یہ ہے کہ ایسے تصرفات مستقل نہیں ہیں، بلکہ یہ سارے تصرفات اسکی ربوبیت کے زیر سایہ اور اسی کی قدرت سے انجام پاتے ہیں اس طرح کے اختیارات وتصروفات، توحید (ربوبی) سے منافات نہیں رکھتے، جیسے کہ اگر خالقیت بھی اذنِ خدا سے ہو تو توحید خالقیت کے منافی نہیں ہے قرآن اور روایات میں بعض بندوں کے لئے ایسی خالقیت اور غیر استقلالی ربوبیت ثابت ہے، جیسا کہ قرآن نے حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے۔

(وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي)(۱)

اور جب تم میرے حکم سے مٹی سے پرندہ کی شکل بناتے اور پھر اس پر کچھ دم کرتے ہو اور وہ میرے حکم سے سچ مچ پرندے بن جاتے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا۔

(فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْراً)(۲)

اوران کی قسم جو زمین وآسمان کے درمیان تیرتے پھرتے ہیں۔

نتیجہ۔

جہان کے لئے چند خداؤں کا توہّم، خدا کو مادی اور اعدادی علتوں سے قیاس کرنے کے ذریعہ وجود میں آیا ہے حالانکہ علت وجود آفرین کو ایسی علتوں سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی، اور کسی بھی معلول کے لئے چند علت وجود آفرین یا رب یا مستقل مدبّر فرض نہیں کیا جاسکتا۔

لہٰذا اس توہّم کو دفع کرنے کے لئے پہلے علت وجود آفرین کے معنی اور پھر اس کی خصوصیات اور نوعیت میں خوب غور کرنا ہوگا، تاکہ معلوم ہوجائے کہ معلول واحد کے لئے چند علتوں کا تصور باطل ہے، اور پھر اس جہان کے انتظامات میں غور وفکر کرنا ہوگا تاکہ معلوم ہوجائے کہ ایسا منظم جہان چند خداؤں یا چند ارباب یا مستقل مدبروں کا خلق کردہ نہیں ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی واضح ہوگئی، کہ خدا کے بعض شائستہ بندوں کے لئے ولایت تکوینی کو

ماننا جبکہ مستقل خالقیت اور ربوبیت کے معنی میں نہ ہوتو، یہ توحید سے منافات نہیں رکھتا، جیسا کہ رسول اکرم اور ائمہ علیہم السلام کی ولایت تشریعی الٰہی ربوبیت تشریعی سے کوئی منافات نہیں رکھتی، اس لئے کہ یہ خدا کی عطا کردہ اور اسی کے حکم سے ہے۔

....

(۱) سورۂ مائدہ۔ آیت/ ۱۱۰

(۲) سورہ نازعات۔ آیت/ ۵

سوالات

۱۔ شرک آلود عقائد کی پیدائش کے اسباب بیان کریں؟

۲۔ شرک سے آلود عقائد کی بنیاد کیا ہے؟

۳۔ خالقیت اور ربوبیت کے درمیان پائے جانے والے لازمہ کو بیان کریں؟

٤۔ کیوں ہر موجود کے لئے چند خالقوں کا فرض کرنا باطل ہے؟

٥۔ کیوں مخلوقات کے ہر مجموعہ کے لئے کسی ایک خالق کو فرض نہیں کیا جاسکتا؟

٦۔ اس امر میں کیا اشکال ہے کہ یہ جہان خدائے واحد کا خلق کردہ ہے اور اس کے لئے متعدد، ارباب ہیں؟

٧۔ چند خداؤں کا توہم کہاں سے وجود میں آیا اور اسے دفع کرنے کا راستہ کیا ہے؟

٨۔ کیوں اولیاء الٰہی کے لئے ولایت تکوینی کا تصور خالقیت و ربوبیت میں توحید سے منافات نہیں رکھتا؟

سترہواں درس

توحید کے معانی

مقدمہ

نفی تعدد

نفی ترکیب

زائد بر ذات صفات کی نفی

توحید افعالی

تاثیر میں استقلال

دو اہم نتیجہ

شبہ کا جواب

مقدمہ

کلمہ توحید لغوی اعتبار سے یگانہ اور یکتا کے معنی میں آیا ہے لیکن فلاسفہ، متکلمین، علماء اخلاق اور عرفاء کی نظر میں یہ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے، اور ان معانی میں سے ہر ایک توحید پر دلالت کرتا ہے، جنھیں اقسامِ توحید یا مراتب توحید بھی کہا جاتا ہے، لیکن یہاں پر ان کا

بیان کرنا ہمارے ہدف سے خارج ہے۔

اسی وجہ سے یہاں پر ہم اس بحث سے مناسب اصطلاحات کا ذکر کریں گے،

۱۔تعدد کی نفی:

توحید کی سب سے پہلی اور معروف اصطلاح خدا کی وحدانیت کا اعتقاد رکھنا ہے نیز شرک صریح کے مقابلے میں تعدد خدا کی نفی ،یعنی دو یا دو سے زائد خدا کے وجود سے انکار اس طرح سے کہ ہر ایک کا وجود مستقل اور ایک دوسرے سے علیدہ ہو۔

۲۔ترکیب کی نفی:

دوسری اصطلاح اس معنی میں ہے، کہ اس کی احدیت نیز درون ذاتی کے اعتبار سے، اس کے بسیط ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے یعنی ذات الھی ، بالفعل اور بالقوہ اجزا

سے مرکب نہیں ہے۔اس صفت کو زیادہ تر بصورت صفات سلبیہ بیان کیا جاتا ہے، جیسا کہ دسویں درس میں اشارہ کیا جاچکا ہے، اس لئے کہ ہمارا ذہن مفہومِ ترکیب اور اس کے بطلان سے مفہوم بساطت کی بہ نسبت زیادہ آشنا ہے۔

۳۔زائد بر ذات صفات کی نفی۔

تیسری اصطلاح ذات الٰہی کا صفات ذاتیہ کے ساتھ یگانگت اور صفات کے زائد بر ذات نہ

ہونے کے معنی میں ہے، کہ جسے (توحید صفاتی) کہا جاتا ہے اور روایات میں نفیِ صفات کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے جبکہ اشاعرہ صفات الٰہیہ کے زائد بر ذات اور قدماء ثمانیہ ہونے کے قائل ہیں۔

توحید صفاتی کی دلیل یہ ہے کہ اگر تمام صفات الٰہی میں سے ہر ایک کے لئے جداگانہ وعلیحدہ مصداق فرض کر لئے جائیں تو چند صورتوں سے خالی نہیں ہے، پہلی صورت، یا ان صفات کے مصادیق ذات الٰہی میں یا داخل ہوں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ذات الٰہی کا اجزا سے مرکب ہونا لازم آئے گا کا مرکب کہلائے ،جس کو ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ ایسا ہونا محال ہے یا وہ مصادیق ذات الٰہی سے جدا فرض کئے جائیں گے ایسی حالت میں یا تو وہ واجب الوجود ہوں گے یعنی وہ پیدا کرنے والے سے بے نیاز ہوں گے، یا وہ ممکن الوجود ہوں گے کہ جس کے لیے ایک خالق کا ہونا ضروری ہے ،لیکن صفات واجب الوجود ہونے کا فرض تعددِ ذات اور شرکِ صریح کا موجب ہے، اور ہم یہ تصور نہیں کر سکتے کہ کسی مسلمان کا عقیدہ ایسا ہوگا، یا پھر صفات کا ممکن الوجود ہونے کا یہ مطلب ہے کہ خداوند عالم ان صفات سے عاری ہے مزید برآں، وہ ان صفات کو خلق کرے اور پھر ان سے متصف ہو جائے جیسے اگر وہ حیات نہیں رکھتا لیکن وہ ایک موجود بنام حیات خلق کرے ،اور اس طرح وہ حیات کا مالک بن جائے اسی طرح اس کی دوسری صفات بھی فرض کر لی جائیں، حالانکہ یہ امر محال ہے کہ علت وجود آفرین مخلوقات کے کمالات کا حامل نہ ہو اور اس فرضیہ سے بدتر ،تو یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوقات کے ضمن میں علم وقدرت اور بقیہ صفات کمالیہ سے متصف ہو۔

اس فرضیہ کے بطلان کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ خداوند عالم کے صفات زائد بر ذات نہیں ہیں بلکہ وہ عین ذات ہیں اور وہ ایسے مفاہیم ہیں کہ عقل جس سے ایک مصداق بسیط کہ جسے ذات مقدس الٰہی رہتے ہیں اخذ کرتی ہے۔

٤۔توحید افعالی۔

فلاسفہ اور متکلمین کے نزدیک توحید کی چوتھی اصطلاح توحیدِ افعالی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا اپنے امور کو انجام دینے میں نہ تو کسی شی کا محتاج ہے اور نہ ہی کسی بھی موجود میں اتنی استطاعت ہے کہ وہ اس کے امور میں اس کی مدد کر سکے۔

یہ مطلب علت وجود آفرین کی خصوصیات یعنی ذات الٰہی کا تمام مخلوقات کے مقابلہ میں قیومیت سے متصف ہونے کی طرف توجہ کے ذریعہ سمجھ میں آجاتا ہے اس لئے کہ ایسی علت کا معلول اپنے تمام وجود کے ساتھ علت کے سہارے قائم ہوتا ہے اور بذات خود کسی بھی قسم کے استقلال سے عاری نہیں ہے۔

ایک دوسری تعبیر کے مطابق جس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کا عطا کردہ ہے اور اسی کے دائرہ قدرت میں ہونے کے ساتھ اسی کی مالکیت حقیقی اور تکوینی کے زیر سایہ ہے، اور نیز خدا کی قدرت و مالکیت، قدرت الٰہی کا ایک جز بلکہ اس کے طول میں سے ہے نہ یہ کہ اس کی قدرت خدا کی قدرت کے مدمقابل کسی مزاحمت کا باعث ہے، جیسے کہ ایک غلام کی مالکیت مولٰی کی اعتباری مالکیت کے زیر سایہ ہوتی ہے العبد وما فی یدہ لمولاہ لہذا کیسے ممکن ہے کہ خدا

ان مخلوقات محتاج وضرورت مند ہو جو خود اسی کے ذات سے وابستہ اور اسی کے ذریعہ قائم ہیں؟!

۵۔تاثیر استقلالی۔

توحید کی پانچویں اصطلاح اثر انداری میں استقلال ہے(۱) یعنی مخلوقات اپنے امور میں ذات الٰہی سے بے نیاز نہیں ہیں، اور جو اثرات بھی ایک دوسرے پر ڈالتے ہیں وہ خدا کی دی ہوئی طاقت اور اس کی اجازت سے ہے درحقیقت جو ذات ہر شی سے بے نیاز ہو کر اپنے امور انجام دیتی ہے وہ ذات اقدس الٰہی ہے، دوسروں کی تاثیر اور فاعلیت، اسی کی تاثیر اور فاعلیت کے زیرِ سایہ ہے۔

اسی وجہ سے قرآن کریم، طبیعی اور غیر طبیعی فاعلوں (جیسے جن وانس اور ملک) کی نسبت خدا کی طرف دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ بارش کا برسنا، سبزہ کا اگنا اور درختوں کا پھل دینا یہ سب اسی کی طرف سے ہے اور اس بات کی تاکید کرتا ہے تاکہ لوگ اس بات کو درک کریں اور برابر خدا کی طرف متوجہ رہیں، کہ امور کی نسبت خدا کی جانب تمام عوامل کی بہ نسبت قریب ہے تقریب ذہن کے لئے یہ مثال کافی ہے کہ اگر کسی محکمہ کا رئیس اپنے زیر دست خدمت گذاروں کو کسی امر کے انجام دینے کا فرمان صادر کرے جبکہ امور کا انجام دینا انھیں کاری گروں پر موقوف ہے لیکن کاریگروں کے ذریعہ انجام دیئے گئے امور کی نسبت محکمہ کے رئیس کی طرف دی جاتی ہے بلکہ عقلا فرمان صادر کرنے والے کی طرف نسبت دینے کو قوی اور بہتر

جانتے ہیں۔

فاعل تکوینی کے بھی مراتب ہیں اور چونکہ کسی بھی فاعل کا وجود ارادۂ الٰہی کے ذریعہ قائم ہے، بالکل اسی طرح کہ جیسے صورت ذہنیہ کا وجود، تصور کرنے والے کے ذریعہ قائم ہے وللہ المثل الاعلی لہٰذا اگر کسی فاعل سے کوئی اثرات ظاہر ہوتے ہیں تو وہ خدا کے اذن اور اس کے ارادہ تکوینی کے سبب سے ہیں (ولاحول ولاقوّۃ الا باللّٰہ العلی العظیم)

....

(۱) عرفاء توحیدِ افعالی کو اس معنی میں استعمال کرتے ہیں.

دو مہم نتیجے۔

توحیدِ افعالی کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان خدا کے علاوہ کسی بھی موجود کو لائق عبادت نہ سمجھے، اس لئے کہ صرف انسان کا خالق اور اس کا رب لائق پرستش ہے اور بس، یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق الوہیت، خالقیت اور ربوبیت کا لازمہ ہے۔

اس کے علاوہ انسان کا تمام اعتماد خدا پر ہونا چاہیے اور اپنے تمام امور میں اسی پر توکل کرنا چاہیے، اور صرف اسی سے مدد مانگنا چاہیے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کا خوف دل میں نہیں آنا چاہیے نہ کھائے یہاں تک کہ جب اس کی احتیاجات کو پورا کرنے والے اسباب کا وجود نہ ہو تو تب بھی ناامید نہ ہو اس لئے کہ خدا غیر عادی راہوں سے اس کی احتیاجات کو پورا کرنے

کی قدرت رکھتا ہے۔

ایسا انسان ولایت خاصہ کے سایہ میں ہوتا ہے اور بے نظیر روحی اطمینان سے برخوردار ہوتا ہے (اَلَا اِنَّ اَولِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوف عَلَیہِم وَلَا ھُم یَحزَنُونَ).(۱)

آگاہ ہوجاؤ اس میں شک نہیں، کہ دوستان خدا (قیامت میں) نہ کوئی خوفہوگا اور نہ وہ آزردہ خاطر ہوں گے۔

(اِیَّاکَ نَعبُدُ وَاِیَّاکَ نَستَعِینُ)

اس آیہ شریفہ میں یہ دو نتیجے موجود ہیں، جسے ہر مسلمان روزانہ کم از کم دس مرتبہ تلاوت کرتا ہے۔

شبہ کا جواب۔

اس مقام پر شاید ذہن میں یہ شبہ اٹھے کہ اگر توحید کامل کا اقتضا یہ ہے کہ انسان خدا کے علاوہ کسی دوسرے سے مدد طلب نہ کرے تو پھر اولیاء الٰہی سے بھی مدد طلب کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

....

(۱) سورۂ یونس۔ آیت/ ٦٢.

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اگر اولیاء الٰہی سے توسل اسی عنوان کے تحت ہو کہ وہ خدا سے ماوراء ہو کے مستقل حثیت سے مدد کرتے ہیں تو ایسا توسل توحید سے سازگار نہیں ہے، لیکن اگر اس عنوان کے تحت ہو کہ خدا نے انھیں اپنی رحمت تک پہنچنے کا وسیلہ اور بندوں کو ان کی طرف

رجوع کرنے کا حکم دیا ہے تو یہ تصور نہ صرف یہ کہ توحید کے منافی نہیں ہے اس کا شمار عبادت و اطاعت خدا میں ہے، اس لئے کہ یہ توصل اسی ذات الٰہی کے اذن سے انجام دیا گیا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ خدا نے کیوں ایسے وسائل بنائے ؟ اور کیوں لوگوں کو ان سے توسل کا حکم دیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام احکام حکمتوں پر مبنی ہیں جن میں سے بعض حکمتوں کو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱۔ لائق بندوں کے مقام کو پہچنوانا۔

۲۔ لوگوں کو ان کے مقام تک لے جانے کے لئے انھیں شوق دلانا۔

۳۔ لوگوں کو اپنی عبادتوں پر مغرور ہونے اور اپنے آپ کو کمالات کے آخری مراتب پر فائز ہونے کے تصور سے روکنا وغیرہ، جیسا کہ وہ لوگ جو ائمہ علیہم السلام سے توسل کے منکر تھے وہ اسی طرح کے تصورات کی وجہ سے گمراہ ہوئے ہیں جس کی مثالیں بے شمار ہیں۔

سوالات

۱۔توحید کے لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کریں؟

۲۔توحید صفاتی کے لئے کیا دلیل ہے؟

۳۔توحید افعالی کو کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے؟

٤۔تاثیر استقلالی میں توحید بہ معنی یگانگت کی شرح پیش کریں؟

٥۔وہ نتائج جو توحید کی آخری دو قسموں سے حاصل ہوتے ہیں وہ کیا ہیں؟

٦۔کیا اولیاء سے توسل کرنا توحید سے منافات رکھتا ہے؟ کیوں؟!

٧۔کیوں خدا نے، لوگوں کو اولیا سے توسل کا حکم دیا ہے اور اس کی حکمت کیا ہے؟!

اٹھارہواں درس

جبرواختیار

مقدمہ

اختیار کی وضاحت

جبریوں کے شبہات کا جواب

مقدمہ

جیسا کہ گذشتہ دروس میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ تاثیر استقلالی میں توحید کا شمار عظیم معارف میں ہوتا ہے کہ جو انسانوں کی تربیت میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے، اسی وجہ سے قرآن میں اس مطلب کی طرف بڑی تاکید ہوئی ہے، اور مختلف بیانات کے ذریعہ اس مطلب کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، منجملہ تمام موجودات کا اذن ومشیت، ارادہ وقضائے الٰہی سے وابستہ ہونے پر ایمان لانا وغیرہ...

لیکن اس مطلب کو سمجھنے کے لئے رشد فکری اور عقلی بالیدگی کے علاوہ صحیح تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے، اسی وجہ سے وہ لوگ جو عقلی بالیدگی سے متصف نہیں تھے یا ان کی تعلیم میں نقص تھا یعنی جھنوں نے معصوم رہنماؤں، اور قرآن کے حقیقی مفسرین سے استفادہ نہیں کیا،

انھوں نے، اس مطلب کو سمجھنے میں غلطی کی، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ تمام اثرات اور علیت صرف اور صرف خدا سے وابستہ ہے نیز اسی سے مخصوص ہے اور قرآن کریم کی صریح آیات کے برخلاف انھوں نے اسباب و وسائط سے ہر قسم کی تاثیر اور علیت کی نفی کی ہے اور اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مثلاً الٰہی طریقہ کار یہ ہے کہ جب آگ کا موجود ہوگا تو اس کی حرارت بھی پائی جائے گی اسی طرح کھانا کھاتے وقت سیری اور پانی پیتے وقت سیرابی کا وجود ضروری ہے، وگرنہ ایسا نہیں ہے کہ آگ، حرارت پیدا کرنے میں موثر ہے یا کھانا اور پانی، سیری و سیرابی کے حاصل ہونے میں کرئی رول ادا کرتے ہیں ہیں۔

اس انحراف فکری کے برے نتائج اس وقت آشکار ہوتے ہیں کہ جب ہم ان نتائج کو انسان کے افعالِ اختیاری اور اس کی ذمہ داریوں کے تحت تجزیہ وتحلیل قرار دیتے ہیں اور اس کے سلسلہ میں تحقیق وجستجو کرتے ہیں، یعنی ایسی فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال خدا سے منسوب ہوں، اور ان امور کے تحت انسان کی فاعلیت سلب ہوجائے، لہذا اس صورت میں کوئی بھی اپنے عمل کے مقابل میں ذمہ دار نہیں ٹھہر سکتا۔

ایک دوسری تعبیر کے مطابق اس کج اندیشی کا تباہ کن نتیجہ جبر ہے یعنی انسانوں کا اپنے اعمال کے سبب کسی بھی ذمہ داری سے بری ہونا ہے، جس کی وجہ سے تمام نظام، خواہ اخلاقی ہوں یا تربیتی، فردی ہوں یا اجتماعی، بلکہ تشریعی نظام تو سرے ہی سے باطل ہوجاتے ہیں، اس لئے کہ جب انسان اپنے امور میں اختیار کا مالک نہ رہا تو پھر اس کے لئے وظیفہ، تکلیف، امر، نہی، ثواب وعذاب وغیرہ کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا، بلکہ اس فکر کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نظام

تکوینی بے بنیاد ہوجائیں اس لئے کہ آیات قرآنی (۱) اور احادیث کے علاوہ براہین عقلی سے جو مطلب سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ جہان کی خلقت کا ہدف انسان کیخلقت کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے تا کہ یہ انسان اپنے اختیارات کے ذریعہ عبادت واطاعت اور بندگی کے ذریعہ کمالات کے عظیم درجات اور قرب پروردگار کا مالک بن جائے ،اور اس کے اندر پروردگار کی خصوصی رحمت کے مالک بننے کی صلاحیت پیدا ہوجائے لیکن اگر
انسان تمام ذمہ داریوں سے بری ہو اور اسے کرئی اختیار نہ ہوتو وہ رضوان الٰہی، اور خدا کی جاودانی نعمتوں سے سرفرازی کا اہل نہیں ہوسکتا۔

....

۱۔ان آیات کی طرف مراجعہ کریں۔سورۂ ہو۔د آیت/ ۷ ۔سورۂ ملک ۔آیت/ ۲ ۔سورۂ کہف ۔آیت/ ۷ ۔سورۂ ذاریات ۔آیت/ ۵۷ ۔سورۂ توبہ۔آیت/ ۷۲
اوراس طرح ھدف خلقت کا نقض ہونا لازم آئے گا۔جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خلقت کی مشینری ایک کھلونا بن جائے ،اور پھر جبری انداز میں کچھ انسان خلق ہوں ،اور چند حرکات و افعال کے
نتیجہ میں بعض کو سزا اور بعض کو جزا دے دی جائے ،جبکہ ان امر کی انجام دہی میں سارا نقش اسی مشینری کا ہے اور انسان مجبور ہے۔
اس فکر کے پھیلنے میں مہم ترین عامل ظالم حکومتوں کے برے مقاصد ہیں، جو اپنے ناشائستہ امور کو اس فکر کے ذریعہ عملی جامہ پہناتے تھے ،جو اس حربہ کو کمزوروں پر اپنی برتری کے لئے

اور مظلوموں کے قیام کو دبانے کے لئے استعمال کرتے تھے، یقیناً ایسے نتائج کے پیش نظر، ملتوں کو خواب غفلت میں رکھنے کے لئے جبر کو ایک خطرناک سبب ماننا ہوگا۔

اس کے علاوہ وہ لوگ جو تھوڑا بہت اس نظریہ کے نقطہ ضعف سے آشنا تھے لیکن توحید کامل اور نفی جبر کے درمیان کوئی راہ حل نکالنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات سے استفادہ کرتے تھے، لہٰذا تفویض کے قائل ہو گئے، اور انسان کے اختیاری افعال کو فاعلیت الٰہی کے دائرے سے خارج سمجھ بیٹھے اور اس طرح سے وہ اشتباہ میں مبتلا ہو گئے، اور یوں اسلام کے عظیم معارف اور اس کے فوائد سے محروم ہو گئے۔

لیکن وہ لوگ کہ جو ایسے عظیم معارف کو درک کرنے کی استعداد سے سرفراز تھے اور قرآن کے حقیقی مفسرین کی معرفت حاصل کر چکے تھے، وہ اس کج فکری سے محفوظ رہ گئے، اور چونکہ اپنی فاعلیت اختیاری کو اس قدرت کے سایہ میں دیکھا جسے خدا نے انھیں عطا کیا تھا لہٰذا اس قدرت کی وجہ سے حاصل ہونے والے افعال کی ذمہ داری قبول کر لی، اور اس کے علاوہ خدا کی جانب سے تاثیر استقلالی کو درک کرلیا، اور اس طرح ایسے مفید نتائج کے حصول میں کامیاب ہو گئے۔

خاندان نبوت سے حاصل ہونے والی روایات میں اس بحث کے آثار ملتے ہیں، احادیث میں استطاعت جبر وتفویض کے عنوان کے تحت اور اس کے علاوہ اذن، مشیت، ارادہ، قضا وقدر الٰہی کے ابواب میں ذکر کیا گیا ہے۔

ان مطالب کے علاوہ بعض روایتوں میں ایسے لوگوں کو ان مسائل میں غور وفکر کرنے سے روکا

گیا ہے کہ جو فکری اعتبار سے ضعیف ہیں تا کہ وہ گمراہ ہونے سے محفوظ رہیں۔

ہاں، جبر واختیار کے مختلف اقسام ہیں کہ جن میں سے ہر ایک کے سلسلہ میں تحقیق و جستجو اس کتاب کے ہدف سے خارج ہے، لہٰذا اس موضوع کی اہمیت کی وجہ سے ان میں سے فقط بعض مسائل کو ذکر کریں گے اور ان لوگوں کو ہماری یہ تلقین ہے کہ جو مزید تحقیق کے خواہاں ہیں کہ وہ مبانی عقلی و فلسفی کو سمجھنے میں صبر سے کام لیں۔

اختیار کی وضاحت۔

ارادہ کی قوت، امور یقینی میں سے ہے، کہ جو ہر انسان میں پائی جاتی ہے، اس لئے کہ ہر انسان خطا ناپذیر علم حضوری کے ذریعہ اسے اپنے وجود میں درک کرتا ہے، جیسا کہ اسی علم کے ذریعہ اپنی بقیہ روحی خصوصیات کا پتہ لگا تا ہے یہاں تک کہ علم حضوری ہی کے ذریعہ کسی امر کے سلسلہ میں شک کا بھی احساس کرتا ہے، اور اسے درک کرنے میں کوئی شک نہیں کرتا۔

اسی طرح انسان ایک معمولی توجہ کے ذریعہ اپنے وجود میں اس بات کا احساس کرتا ہے کہ وہ تکلم کر سکتا ہے یا نہیں، غذا تناول کر سکتا ہے یا نہیں، ہاتھوں کو حرکت دے سکتا ہے یا نہیں۔

کسی بھی امر کو انجام دینے کا ارادہ بنانا کبھی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے جیسے کہ ایک بھوکا کھانا کھانے کا رادہ کرتا ہے، یا ایک پیاسا پانی پینے کا ارادہ کرتا ہے اور کبھی عقلی آرزوؤں کو پورا کرنے اور انسانی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ارادہ کیا جاتا ہے جیسے کہ ایک مریض اپنی سلامتی حاصل کرنے کے لئے تلخ دوائیں کھاتا کرتا ہے، اور لذیذ

غذاؤں سے پرہیز کرتا ہے، یا ایک محقق اپنے مقصود کی تلاش میں مادیات سے چشم پوشی کرتا ہے اور بے شمار زحمتیں تحمل کرتا ہے یا ایک فدا کار فوجی اپنے ہدف تک پہنچنے میں اپنی جان کو بھی قربان کردیتا ہے۔

دراصل انسان کی عظمتوں کا اندازہ اس وقت لگتا ہے کہ جب مختلف خواہشیں جمع ہوں، اور اس کے بعد انسان، فضائل اخلاقی، کرامت نفسانی، اور قرب خداوندی و رضوان الٰہی کو حاصل کرنے کے لئے اپنی پست اور حیوانی خواہشات سے چشم پوشی کرلے، اس لئے کہ کوئی بھی عمل جس قدر دلچسپی اور کامل ارادہ سے انجام دیا جائے گا، اسی کے مطابق روحی تکامل یا تنزل حاصل ہوگا، اور اسی اعتبار سے جزاء وسزا کا مستحق ہوگا۔

البتہ نفسانی خواہشات کے مقابل میں ٹھہرنے کی طاقت تمام انسانوں میں برابر نہیں ہے لیکن تمام انسانوں میں یہ (ارادہ) موہبت الٰہی موجود ہے انسان اگر چاہے تو تمرین کے ذریعہ اسے قوی بنا سکتا ہے۔

لہٰذا ارادہ کے موجود ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور مختلف طرح کے شبہات ذہن میں پیدا ہونے کی وجہ سے ارارہ جیسے امرِ وجدانی کے سلسلہ میں شک وتردید نہیں ہونا چاہئے اور جیسا کہ ہم نے اشارہ کردیا ہے کہ اختیار کا وجود ایک آشکار اصل کے عنوان سے تمام ادیانِ آسمانی، شرائع، اور تربیتی و اخلاقی نظاموں میں قبول شدہ ہے اور اس کے بغیر وظیفہ، تکلیف امر، نہی، جزا وسزا کا کوئی مطلب نہیں ہے۔

وہ امور جو اس حقیقت سے انحراف کا باعث ہوتے ہیں اور جبر سے لگاؤ کا سبب بنتے ہیں ہمیں

ان کا جواب دینا ضروری تا کہ اس وسوسہ کا خاتمہ ہوجائے لہٰذا اس مقام پر چند شبہات کے جوابات پیش کئے جا رہے ہیں۔

شبہات کے جوابات۔

جبریوں کے مہم ترین شبہات درج ذیل ہیں۔

۱۔انسان کا ارادہ باطنی میلانات کا نتیجہ ہے،اور یہ میلانات نہ انسان کے اختیار میں ہیں اور نہ ہی ان کے ظہور میں کوئی خارجی عامل سبب بنا ہے،لہذا اس طرح اختیار اور انتخاب کا کوئی معنی باقی نہیں رہتا۔

۲۔اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ میلانات کا اٹھنا ارادہ کے بننے کا سبب ہے نہ یہ کہ کسی امر کو انجام دینے کے لئے کسی ارادہ کے وجود کا سبب ہے، جبر کا نتیجہ یہ ہے، کہ جب خواہشات ظہور کریں تو مقاومت کی قوت سلب ہوجائے، حالانکہ بہت سے امور میں انسان شک کرتا ہے کہ اسے انجام دے یا نہ دے اور کسی بھی امر کو انجام دینے کے لئے غور وفکر کی ضرورت ہے جو کبھی سود و منفعت، تو کبھی دشواری کا سبب ہے۔

۲۔مختلف علوم میں یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ مختلف عوامل جیسے وراثت، (غذائیات اور دواؤں کے نتیجہ میں) غدود کے ترشحات، اجتماعی عوامل، انسان کے ارادہ کے موجود ہونے کا سبب بنتے ہیں، اور انسانوں کے اخلاق کا بدلنا انھیں عوامل کے اختلاف کا سبب ہے جیسا کہ دینی متون میں بھی اسی مطلب کی طرف تاکید کی جاتی ہے، لہٰذا انسانی افعال کو آزاد، ارادہ کا نتیجہ

نہیں کہا جا سکتا۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ آزاد ارادہ کو قبول کر لینے کا مطلب ان عوامل کی اثر گذاری کا منکر ہونا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان ان عوامل کے ہوتے ہوئے بھی مقاومت کر سکتا ہے اور مختلف خواہشات کے جمع کے دوران کسی ایک کا انتخاب کر سکتا ہے۔

البتہ یہ امر مسلم ہے کہ کبھی کبھی یہ عوامل انتخاب میں دشواری کا سبب بنتے ہیں لیکن اس کے باوجود مقاومت کرنا اور کسی ایک کا انتخاب کر لینا ،کمال میں تاثیر اور جزا کے مستحق ہونے کا سبب ہوتا ہے، جیسا کہ غیر معمولی ہیجانات سزا کے کم ہونے اور جرم میں تخفیف کا باعث ہوتے ہیں۔

۳۔ خدا تمام موجودات منجملہ افعالِ انسان کے وقوع سے پہلے پوری طرح ان سے آگاہ ہے، اور علم الٰہی میں کسی قسم کی خطا کا کوئی امکان نہیں ہے، لہذا تمام حوادث، علم الٰہی کے مطابق واقع ہوتے ہیں، اور اس کے مخالف ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا اس مقام میں انسان کے ارادہ اور اختیار کا کوئی مطلب باقی نہیں رہتا۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ علم الٰہی ہر اس حادثہ سے متعلق ویسا ہی ہے جیسا کہ واقع ہونے والا ہے، اور انسان کے افعال اختیاری وصف اختیاریّت کے ہمراہ خدا کے نزدیک معلوم ہیں پس اگر یہ افعال وصف جبریت کے ساتھ واقع ہوں تو علم الٰہی کے خلاف واقع ہوں گے۔

جیسے خدا کو معلوم ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت میں ایک عمل کو انجام دینے کا ارادہ بنانے والا ہے اور اسے ضرور انجام دے گا، یہاں پر ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ علم صرف وقوع فعل سے

متعلق ہے بلکہ وہ ارادہ اور اختیار سے بھی مربوط ہے لہذا علم الٰہی انسان کے آزاد ارادہ اور اس کے اختیار سے کوئی منافات نہیں رکھتا۔

جبریوں کا ایک دوسرا شبہ قضا وقدر کے سلسلہ میں ہے ان کے اعتقاد کے مطابق انسان کے اختیار سے ساز گار نہیں ہے اور ہم آئندہ دروس میں اس مطلب کے تحت گفتگو کریں گے۔

سوالات

١۔ جبر کے رواج اور اس سے وابستہ ہونے کے اسباب کیا ہیں؟

٢۔ جبر سے وابستہ ہونے کے برے نتائج کیا ہو سکتے ہیں؟

٣۔ انسان کے ارادہ اور اختیار کی آزادی کی وضاحت کریں؟

٤۔ کیا باطنی میلانات اور ان کے وجود میں آنے کا سبب بننے والے عوامل انسان کے اختیار سے منافات رکھتے ہیں؟ کیوں؟

٥۔ وہ لوگ جو غیر معمولی ہیجانات اور دشوار شرائط میں گرفتار ہو جاتے ہیں، ان میں اور دوسروں میں کیا فرق ہے؟

٦۔ کیا وراثت اور اجتماعی عوامل جبر کا سبب ہیں؟ کیوں؟

٧۔ کیا علم الٰہی انسان کے اختیار کی نفی کرتا ہے؟ کیوں؟

انیسواں درس

دین کیا ہے

قضاوقدر کا مفہوم

قضاوقدر علمی و عینی

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہیں

انسان کے اختیار سے قضاوقدر کا رابطہ

متعدد علتوں کے اثر انداز ہونے کی قسمیں

قضااور قدر پر اعتقاد کے آثار

قضاوقدر کا مفہوم

کلمہ قدر کے معنی اندازہ اور کلمہ تقدیر کے معنی تولنا اور اندازہ لگانے کے ہیں اور کسی چیز کو ایک معین اندازے و پیمانے کے مطابق ساخت وساز کے ہیں اور کلمہ قضا کے معنی انجام تک پہنچا نے اور فیصلہ کرنے کے ہیں اور کبھی یہ دونوں کلمہ ایک ساتھ تقدیر کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

تقدیر الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے ہر شی کے لئے کم (مقدار) و کیف (حالت)، زمان و

مکان کے اعتبار سے کچھ خاص حدود قرار دئے ہیں، جو تدریجی اسباب وعوامل کے ذریعہ پاتے ہیں اور قضا الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شی کے مقدمات، اسباب وشرائط فراہم ہو جائیں تو وہ شی اپنے اختتام تک پہنچ جائے۔

اس تفسیر کے مطابق، مرحلہ تقدیر، مرحلہ قضا سے پہلے ہے، اوراس کے تدریجی مراتب ہیں، جو قریب، متوسط، بعید مقدمات کو شامل ہیں اور اسباب وشرائط کے بدلنے کے ساتھ یہ بھی بدل جاتے ہیں جیسے ایک جنین پہلے نطفہ پھر علقہ، پھر مضغہ یہاں تک کہ ایک کامل جنس کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس میں زمانی و مکانی تشخصات بھی پیدا ہو جاتے ہیں، اب اس کا ایک مرحلہ میں ساقط ہو جانا، تقدیر،، میں تغیر سے تعبیر کیا جاتا ہےلیکن مرحلہ قضا ایک دفعی مسئلہ ہے جو اسباب وشرائط کے فراہم ہونے پر ہی منحصر ہے اس کے بعد اس کا پایا جانا حتمی، و نا قابل تبدیل ہے

)اِذَا قَضیٰ اَمراً فَاِنَّمَا یَقُولُ لَہُ کُنْ فَیَکُونُ).(۱)

جب وہ کسی امر کے بارے میں ٹھان لیتا ہےتو بس اس سے کہتا ہے کہ ہو جا، وہ ہو جاتا ہے لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ کبھی قضا وقدر دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، اسی وجہ سے انھیں حتمی اور غیر حتمی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ روایات اور دعاؤں میں قضا کو بدلنے والے اسباب میں سے صدقہ ماں باپ کے ساتھ نیکی، صلۂ رحم، دعا وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔

قضا وقدر علمی و عینی۔

کبھی تقدیر اور قضا الٰہی، موجودات کی پیدائش کے لئے اسباب و شرائط اور مقدمات کے فراہم ہونے کے تحت، علم خدا کہ معنی میں آیا ہے اسی طرح ان امور کے حتمی واقع ہو جانے کے سلسلہ میں یہ کلمات استعمال ہوتے ہیں جسے قضا وقدر علمی کا نام دیا جاتا ہے، اور کبھی موجودات کی پیدائش کے تدریجی مراحل اور ان کے عینی تحقق کو، خدا کی ذات سے نسبت دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جسے قضا وقدر عینی کا نام دیا جاتا ہے۔

آیات و روایات کی روشنی میں علم الٰہی ان تمام موجودات کو شامل ہوتا ہے کہ جو خارج میں موجود ہوتے ہیں اور وہ سب کے سب خدا کی ایک مخلوق لوح محفوظ میں درج ہیں، لہٰذا جو بھی خدا کی اجازت سے اس لوح محفوظ تک رسائی حاصل کر لے وہ گذشتہ اور آئندہ کے واقعات سے باخبر ہو جاتا ہے،

....

(۱) سورۂ آل عمران۔ آیت/ ٤٧ ،سورہ بقرہ۔ آیت/ ١١٧ ،سورۂ مریم۔ آیت/ ٣٥ ،سورۂ غافر۔ آیت/ ٦٨.

اس لوح محفوظ کے علاوہ دوسرے کم مرتبہ لوح محفوظ بھی ہیں جو واقعات کو ناقص اور حدود و شرائط کے ساتھ بیان کرتے ہیں لہٰذا جو بھی ان تک رسائی حاصل کر لے وہ واقعات کے سلسلہ میں اجمالی علم حاصل کر لیتا ہے، جو قابل تبدیل بھی ہیں، شاید یہ آیت انھیں دو قسموں کی طرف اشارہ کر رہی ہے(یَمْحُو اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہُ اُمُّ الْکِتٰبِ)(۱)

پھراس میں سے خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اورحس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اس کے پاس اصل کتاب،لوح محفوظ موجود ہے۔

بہرحال قضا وقدر علمی کے اعتبار کے سلسلہ میں اس سے زیادہ مشکلات ودشواریاں نہیں ہیں جوہم نے خدا کے علم ازلی ہونے کے بارے میں بیان کی ہیں،گذشتہ دروس میں علم الٰہی کے بارے میں جبریوں کے شبہات کے تحت گفتگو ہوچکی ہے اوران کے شبہات کو کمزوراوران کے بطلان کوواضح کیا جاچکا ہے۔

لیکن قضا وقدر عینی پراعتقاد کے سلسلہ میں جومشکل ترین اعتراضات پیش کئے گئے ہیں ان کے جوابات دینا ضروری ہیں اگر چہ اس بابت تاثیر استقلالی میں توحید کے مباحث کے درمیان ایک اجمالی جواب دیا جاچکا ہے۔

انسان کے اختیار سے قضا وقدر کا رابطہ۔

ہمیں یہ معلوم ہوگیا ہے کہ قضاوقدر عینی پراعتقاد کا اقتضاء یہ ہے کہ موجودات کی پیدائش سے کمال تک بلکہ آخرعمر تک حتی کہ الٰھی حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ مقدمات بعیدہ کے فراہم ہونے پرایمان لانا ہوگا اور پیدائش کے شرائط کے فراہم ہونے سے آخری مرحلہ تک ارادہ الٰہی سے وابستہ ہونے پریقین کرنا ہوگا۔(۲)

....

(۱)سورۂ رعد آیت ۳۹.(۲)ارادہ اور قضا کا ایک دوسرے پر منطبق ہونا سورہ آل عمران کی

آیت نمبر ٤٧ اور سورۂ یس کی آیت نمبر ٨٣، کی تطبیق کے ذریعہ یہ مطلب روشن ہوجاتا ہے.

اِنَّمَآ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ.

یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق جس طرح ہر موجود کا خدا کی مشیت اور اس کے ارادہ کی طرف نسبت دینا ضروری ہے اوراس کی اجازت کے بغیر کوئی وجود بھی موجود نہیں ہوسکتا، اسی طرح ہر شی کی پیدائش قضا وقدر الٰہی سے وابستہ ہے، اوراس کے بغیر کوئی بھی وجود اپنے حدود میں موجود نہیں رہ سکتا، لہٰذا اس نسبت کو بیان کرنا دراصل توحید کی تدریجی تعلیم یعنی تاثیر میں استقلال کے معنی میں ہے جو توحید کے عظیم مراتب میں سے ہے، اور جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ انسانوں کی تربیت میں توحید کی یہ قسم عظیم اثرات کی حامل ہے۔

لیکن موجودات کو اذن الٰہی اوراس کی مشیت سے نسبت دینا نہایت آسان ہے برخلاف اس کے آخری مرحلہ نیز قطعی ہونے کی نسبت قضا الٰہی کی طرف اس لئے کہ اس میں پیچیدگیاں بہت زیادہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ مسئلہ سب سے زیادہ متکلمین کی بحثوں کا مرکز بنا رہا ہے، اس لئے کہ تقدیر کے بننے میں انسان کے مختار ہونے کے اعتقاد کو قبول کرنے کے ساتھ اس اعتقاد (قضاوقدر) کو ماننا اوراس پر ایمان لانا بہت مشکل ہے، اسی وجہ سے متکلمین کے ایک گروہ (اشاعرہ) نے چونکہ انسانی اعمال میں قضا الٰہی کے انتساب کا حامی تھا، لہٰذا جبر کا قائل ہوگیا، لیکن متکلمین کا دوسرا گروہ (معتزلہ) چونکہ جبر اوراس کے جبران ناپذیر نقصانات سے آگاہ تھا لہٰذا اسے قبول نہ کرتے ہوئے انسانی افعال میں قضا الٰہی کی شمولیت کا منکر ہوگیا، اوران میں سے ہر ایک نے قرآنی آیات کی تفسیر اپنی رائے کے مطابق انجام دی اور

مخالف آیتوں اور روایتوں کی تاویل کی جسے ہم نے مفصل جبر وتفویض کے سلسلہ میں لکھے گئے رسالہ میں پیش کیا ہے۔

لیکن اصل اعتراض یہ ہے کہ اگر واقعاً انسان کے افعال اختیاری ہیں اور وہ اپنے ارادہ میں مختار ہے تو اسے کس طرح ارادۂ الٰہی اور اس کی قضا سے نسبت دی جاسکتی ہے؟ اور اگر اس کے افعال

کی قضا الٰہی سے نسبت دی گئی ہے تو پھر کس طرح انسان سے نسبت دی جاسکتی ہے؟

لٰہذا اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے اور ان دونوں نسبتوں کو جمع کرنے کے لئے ایک علت کی طرف چند معلول کو نسبت دینے کے بارے میں ایک مختصر وضاحت پیش کریں گے تا کہ ان دونوں

نسبتوں کی نوعیت معلوم ہو سکے۔

متعدد علتوں کے اثر انداز کی قسمیں۔

ایک موجود کی پیدائش میں چند علتوں کے اثر انداز ہونے کی چند صورتیں ہیں۔

۱۔ چند علتیں ایک ساتھ اثر انداز ہوں جیسے کہ بیج، پانی، ہوا، آفتاب جیسے اسباب مل کر سبزہ کے اگنے کا سبب بنتے ہیں۔

۲۔ چند علتیں نیابتاً ایک دوسرے کے بعد عمل کریں جیسے کہ ہوائی جہاز کے متعدد انجن یکے بعد دیگرے روشن ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ہوائی جہاز برابر پرواز کرتا ہے

۳۔ چند علتوں کا آپس میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا جیسے کہ متعدد گیند کا ایک دوسرے سے ٹکرانا، یا متعدد کاروں کا ایک ساتھ اکسیڈنٹ، یا ارادہ کا موئر ہونا ہاتھ کی حرکت پر اور ہاتھ کی حرکت کا اثر انداز ہونا قلم کی حرکت پر اور قلم کی حرکت کا نتیجہ ایک نوشتہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح تمام موجودات ایک دوسرے کی تاثیر کا نتیجہ ہیں۔

٤۔ متعدد عوامل کا ایک دوسرے پر اثر، جبکہ ہر ایک دوسرے سے مستقل ہو، یہ فرض گذشتہ فرض سے بالکل جدا ہے اس لئے کہ وہاں ہاتھ کی حرکت، ارادہ پر منحصر تھی اور قلم کی حرکت، ہاتھ کی حرکت پر منحصر تھی۔

ان تمام صورتوں میں چند علتوں کے ذریعہ ایک معلول کا وجود میں آنا لازمی ہے، لہٰذا فعل اختیاری میں ارادۂ الٰہی اور انسان کے ارادے کی تاثیر اسی قسم میں سے ہے، اس لئے کہ انسان اور اس کا ارادہ، ارادۂ الٰہی سے وابستہ ہے۔

لیکن وہ صورت کہ جس میں معلول واحد پر دو علتوں کا اجتماع غیر ممکن ہے، وہ دو ہستی بخش (وجود آفرین) علتوں کا اجتماع ہے یا ایسے دو علتوں کا اجتماع ہے کہ جو مانعۃ الجمع، مستقل، اور ایک دوسرے کے بدلے اثر انداز ہوتے ہیں، جیسے کہ ایک ارادہ دو مزید فاعلوں سے وجود میں آئے یا دو مشابہ موجود دو تامہ علتوں کا نتیجہ ہوں۔

شبہ کا جواب۔

گذشتہ توضیحات کی روشنی میں انسان کے افعال اختیاری کو خدا سے نسبت دینے کے علاوہ خود انسان سے نسبت دینے میں کوئی اشکال نہیں ہے، اس لئے کہ یہ نسبتیں آپس میں مزاحم نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے طول میں ہیں۔

ایک دوسری تعبیر کے مطابق ایک فعل کو اس کے فاعل کی طرف نسبت دینا یہ ایک مرحلہ ہے اور خود اس کے وجود کو خدکی طرف نسبت دینا اس شے بالاتر مرحلہ ہے کہ جس مرحلہ میں خود انسان کا وجود اور وہ مادہ کہ جس پر وہ فعل انجام پاتا ہے اور وہ آلاتُ جس کی مدد سے فعل واقع ہوا ہے سب کے سب اسی سے وابستہ ہیں۔

پس انسان کے ارادہ کی تاثیر علت تامہ کے ایک جز کے عنوان سے اپنے امور میں اس امر سے کوئی منافات نہیں رکھتا، کہ علت تامہ کے تمام اجزا کو خدا سے نسبت دیدی جائے، اور وہ صرف خدا ہے جو جہان انسان اور اس کے تمام افعال و کردار کو اپنے دست قدرت میں سنبھالے ہوئے ہے، ہمیشہ انھیں وجود عطا کرتا ہے اور ان میں ہر ایک کو ایک معین شکل میں خلق کرتا ہے لہٰذا کوئی موجود بھی کسی بھی حال میں اس سے بے نیاز نہیں ہے، اور انسان کے اختیاری افعال بھی اس سے بے نیاز اور اس کی قدرت سے باہر نہیں ہیں، اور اس کی تمام خصوصیات، اور صفات الٰہی قضا و قدر سے وابستہ ہیں، لہذا ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ یا تو وہ، انسان کے ارادہ سے وابستہ ہوں یا خدا کے ارادہ کے تحت ہوں اس لئے کہ یہ دونوں

ارادے، مستقل اور مانعۃ الجمع نہیں ہیں، اور اعمال کو تحقق بخشنے میں ایک دوسرے کے بدلے اثر انداز نہیں ہوتے، بلکہ انسان کا ارادہ اس کے وجود کی طرح ارادۂ الٰہی سے وابستہ ہے، اور اسے تحقق بخشنے کے لئے خدا کے ارادہ کی ضرورت ہے۔

(مَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ).(۱)

اور تم کچھ چاہتے ہی نہیں مگر وہی جو سارے جہان کا پالنے والا خدا چاہتا ہے۔

قضا و قدر پر اعتقاد کے آثار۔

قضا قدر پر اعتقاد، معرفت خدا کے حصول اور عقلی اعتبار سے انسان کے تکامل (بتدریج کامل ہونے) کے علاوہ بے شمار علمی فوائد کا حامل ہے جن میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اور بعض کو ہم یہاں ذکر کریں گے۔

وہ اشخاص جو حوادث کی پیدائش میں ارادہ الٰہی کی اثر اندازی اور قضا وقدر الھی پر ایمان رکھتے ہیں وہ نا گوار حادثوں سے نہیں ڈرتے، اور نالہ وزاری نہیں کرتے، بلکہ چونکہ انھیں معلوم ہے کہ یہ حوادث بھی اس کے حکیمانہ ارادہ کا ایک جز ہے اور اس کے واقع ہونے میں کوئی نہ کوئی حکمت کار فرما ہے لہٰذا رضا کارانہ اور والھانہ طور پر اس کا استقبال کرتے ہیں، اور اس طرح صبر و رضا، تسلیم و توکل جیسے صفات کے مظور بن جاتے ہیں اور دنیا کی خوشیوں و رعنائیوں پر مغرور و سرمست نہیں ہوتے اور خدائی نعمتوں کو اپنے لئے فخر کا وسیلہ نہیں سمجھتے۔

یہ تو وہی آثار ہیں کہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

(مَا اَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلاَ فِي اَنفُسِكُم اِلاَّ فِي كِتَٰبٍ مِن قَبلِ اَن نَّبرَأَهَا اِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِير ۔لِّكَيلاَ تَأْسَوا عَلَى مَافَاتَكُم وَلاَ تَفرَحُوا بِمَاءَاتَكُم وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُختَالٍ فَخُورٍ)(۲)

....

(۱) سورۂ تکویر۔آیت/ ۲۹.

(۲) سورہ حدید۔آیت/ ۲۲ ۲۳.

جتنی مصیبتیں روئے زمین پر اور خود تم لوگوں پر نازل ہوئی ہیں قبل اس کے کہ ہم انھیں ظاہر کریں (لوح محفوظ) میں مکتوب ہیں بیشک یہ خدا پر آسان ہے، تا کہ جب تم سے کوئی چیز چھین لی جائے اس کا رنج نہ کرو اور جب کوئی چیز (نعمت) خدا تم کو دے تو اس پر نہ اترایا کرو اور خدا کسی اترانے والے شیخی باز کو دوست نہیں رکھتا۔

لیکن اس بات کی طرف اشارہ کرنا لازم ہے کہ تاثیر استقلالی میں توحید قضا و قدر سے غلط مطلب نکالنا انتہائی سستی، کاہلی اور ذمہ داریوں سے از نو منھ موڑنا ہے۔

اور ہمیں یہ یاد رہنا چاہیے کہ جاودانی سعادت وشقاوت ہمارے اختیاری افعال میں ہے۔

(لهَا مَا كَسبَت وَ عَلَيهَا مَا اَكتَسَبَت).(۱)

اس نے اچھا کام کیا تو اپنے نفع کے لئے اور برا کام کیا تو (اس کا وبال) کا خمیازہ بھی وہی بھگتے گا،

(وَ اَن لَّيسَ لِلاِنسَانَ اِلاَّ مَا سَعَىٰ)(۲)

اور انسان کے لئے نہیں ہے مگر یہ کہ جتنی وہ کوشش کرے

....

(۱) سورہ بقرہ۔ آخری آیت.

(۲) سورۂ نجم۔ آیت/ ۳۹.

سوالات

۱۔ قضاوقدر کے لغوی معنی بیان کریں؟

۲۔ تقدیر الٰہی اور اس کی قضا کا مطلب کیا ہے؟

۳۔ کس اعتبار سے قضاوقدر کو حتمی اور غیر حتمی امور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟

٤۔ بداء کیا ہے؟

٥۔ علمی اور عینی قضاوقدر کو بیان کریں؟

٦۔ لوح محفوظ اور لوح محو اثبات اور ان دونوں کا حتمی اور غیر حتمی تقدیر سے ارتباط کو بیان کریں؟

۷۔ قضا وقدر اور انسان کے مختار ہونے کے درمیان جمع کی مشکلات کے علاوہ اس موضوع کے تحت متکلمین کے اختلافات کی شرح دیں؟

۸۔ معلول واحد میں متعدد علتوں کے اثر انداز ہونے کی قسموں کو بیان کریں اور ان میں سے کون سی قسم محال ہے؟

۹۔ قضاوقدر کے مسئلہ میں جبر کے متعلق شبہات کو بیان کریں؟

۱۰۔ قضاوقدر الٰھی پر اعتقاد رکھنے کے اثرات بیان کریں؟

بیسواں درس

عدل الٰہی

مقدمہ

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے

مفہوم عدل

دلیل عدل الٰہی

چند شبہات کا حل

مقدمہ

ہم نے گذشتہ دروس میں متکلمین کے دو گروہوں (اشعری اور معتزلی) کے نظریات کلامی، ارادہ الٰہی، توحید، جبر و اختیار، قضا و قدر کے سلسلہ میں گفتگو کی کہ جن میں یا تو افراط ہے تفریط۔

انھیں دو گرہوں کے درمیان بنیادی اختلاف میں سے ایک عدل الٰہی کا مسئلہ ہے، اس نظریہ میں شیعہ متکلمین، معتزلہ کے موافق ہیں جنھیں اشاعرہ کے مقابل میں عدلیہ کہا جاتا ہے، اور یہ مسئلہ اپنی اہمیت کی وجہ سے علم کلام کے بنیادی و اساسی مسائل میں شمار کیا جاتا ہے، یہاں تک

کہ اس مسئلہ کو اصول عقائد کا ایک حصہ اور شیعہ ومعتزلہ متکلمین کی پہچان کے عنوان سے جانا گیا ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ اشاعرہ عدل الٰہی کے منکر نہیں ہیں، اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ وہ (العیاذ باللہ) خدا کو ظالم سمجھتے ہوں، اس لئے کہ قرآن کی آیات واضح انداز میں عدل الٰہی کے اثبات اور اس سے ہر طرح کے ظلم کی نفی کرتی ہیں، لیکن اصل اختلاف یہ ہے کہ کیا عقل، شرعی بیانات (کتاب وسنت) سے ہٹ کر خدا کے افعال کے لئے قوانین کا ادراک کرسکتی ہے، اور اس طرح کسی عمل کے انجام دینے یا اسے ترک کرنے کا حکم دے سکتی ہے، مثلاً کیا خدا کے لئے لازم ہے کہ مومنوں کو بہشت اور کافروں کو دوزخ میں لے جائے کیا عقل حکم دے سکتی ہے، یا پھر ایسے قضایا کا حل صرف وحی کے ذریعہ ممکن ہے اور عقل کو ایسے مسائل میں دخل اندازی کا کوئی امکان نہیں ہے؟

لہذا اختلاف کا محوری نقطہ (حُسن وقبح عقلی) کا مسئلہ ہے جس سے اشاعرہ نے انکار کیا ہے اور وہ قائل ہیں کہ تکوینی امور میں جو خدا کا فرمان ہے وہی بہتر ہے، اور (تشریعی امور) میں صرف اسی کا حکم اچھا اور بہتر ہے، اور ایسا ہرگز نہیں ہے چونکہ وہ نیک کام ہے لہٰذا اسے انجام دینے کا حکم دیا جائے یا برا کام ہے لہذا اس سے روکا جائے۔

لیکن عدلیہ حضرات کا یہ نظریہ ہے کہ تکوینی اور تشریعی مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے افعال خدا کو (حُسن وقبح) سے متصل کیا جاسکتا ہے، اور عقل بھی ایک حد تک افعال کے برے یا اچھے ہونے کے اسباب کا پتا لگا سکتی ہے اور وجود مقدس الٰہی کو افعال قبیحہ سے منزہ کرسکتی ہے

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عقل خدا کو (العیاذ باللہ) نیک امور کا حکم دے یا برے امور سے منع کرے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل ذات خداوندی سے افعال قبیحہ کے صدور کو محال جانتی ہے نیز ذات الٰہی اور افعال حسنہ یا قبیحہ کے درمیان نسبتوں کا اندازہ لگا سکتی ہے۔
یہ بات آشکار ہے کہ ان مباحث کی تفصیلی تحقیق اور اس ضمن میں شبہات کا جواب جس میں اشاعرہ کی طرف سے (حُسن و قبح) عقلی کا انکار کیا گیا ہے اور انھیں جماعت عدلیہ کے مقابلہ میں لا کر کھڑا کر دیا ہے اس کتاب کی وسعت سے باہر ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس مسئلہ کے تحت معتزلہ کے بعض ضعیف نظریات ہوں کہ جن کی ہم مناسب موقع پر وضاحت کریں گے، لیکن یہ حُسن و قبح عقلی کا مسئلہ شیعوں کے نزدیک قابل قبول اور کتاب و سنت کی طرف سے تائید کے علاوہ، معصومین علیہم السلام نے اس کے اثبات میں بڑی تاکید کی ہے۔
اسی وجہ سے ہم یہاں پر مفہوم عدل کے تحت تھوڑی وضاحت کریں گے، اور چونکہ یہ خدا کی صفاتِ فعلیہ ہے لہٰذا اس پر دلیلا قائم کرتے ہوئے اس ضمن میں موجودہ شبہات کے سلسلہ میں بحث کریں گے

مفہوم عدل۔

عدل کے لغوی معنی برابری اور مساوی کرنے کے ہیں، اور عرف عام میں لوگوں کے حقوق کی رعایت کرنے کے معنی میں ہے جسے دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے پس عدل کی اس طرح تعریف کی جاسکتی ہے اِعطَاءُ کُلِّ ذِی حَقٍ حَقَّهُ صاحب حق کے حق کو عطا کرنا

لہٰذا اس تعریف کے تحت ایک ایسے موجود کو فرض کرنا ہوگا جو صاحب حق ہو، تا کہ اس کی رعایت کو عدل اور اس پر تجاوز کو ظلم کا نام دیا جا سکے لیکن کبھی مفہوم عدل کو وسعت دیتے ہوئے اس طرح تعریف کی جاتی ہے، کہ (کسی بھی شی کو اس کے مقام پر رکھنا اور کسی بھی فعل کو شائستہ صورت میں انجام دینا) اور پھر اس طرح عدل کی تعریف (وضع کل شیٍٔ ف موضعہ). (کسی بھی شی کو اس کے مقام پر رکھنا) کی جا سکتی ہے، عدل کی یہ تعریف حکمت کے مساوی اور ایک عادلانہ حکیمانہ عمل کا مساوی کہلائے گی لیکن کسی طرح (صاحب حق کا حق) کسی بھی شئی کا اپنا مقام معین ہو، اس سلسلہ میں کافی بحث ہے جس نے فلسفہ اور کلام کے ایک عظیم مباحث کو اپنے سے مخصوص کرلیا ہے جنھیں ہم یہاں پر کسی بھی صورت میں بیان نہیں کر سکتے۔

لیکن جس مسئلہ کی طرف توجہ لازم ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام عقلا اس بات کو سمجھتے ہیں کہ یتیم کے دہن سے لقمہ کو چھینا یا ناحق کسی کا خون بہانا، ایک قبیح عمل ہے، یا یتیم کے دہن سے چھینا گیا لقمہ اس کے منھ میں لوٹا دینا یا ناحق خون بہانے والے کو سزا دینا ایک عادلانہ اور شائستہ عمل ہے، اور یہ امر خدا کے امر و نہی پر منحصر نہیں ہے یہاں تک کہ ایک ملحد بھی اپنے مقام پر یہی قضاوت کرتا ہے لیکن اس فیصلہ کا راز کیا ہے؟ اور کون سی طاقت حسن و قبح کے تعین کی صلاحیت رکھتی ہے اسی طرح کے اور دوسرے مسائل کے بارے میں فلسفہ کی کتابوں میں بحث کی جاتی رہی ہے۔

نتیجہ۔

عدل کے لئے دو مفہوم خاص اور عام فرض کئے جا سکتے ہیں، ایک یہ کہ دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنا، اور دوسرے یہ کہ حکیمانہ عمل انجام دینا، کہ جس میں لوگوں کے حقوق کی رعایت کرنا شامل ہے

لٰہذا عدل کا لازمہ تمام انسانوں یا اشیاء کو برابر اور مساوی تقسیم کرنا نہیں ہے جیسے کہ عادل استاد یہ نہیں ہے جو محنتی اور کاہل شاگردوں کو برابر سے تشویق یا انھیں مساوی حثیت سے سزا دے، یا عادل قاضی یہ نہیں ہے جو مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان مورد نزاع مال کو مساوی تقسیم کر دے، بلکہ عادل استاد یہ ہے جو ہر شاگرد کو اس کی شائستگی کے مطابق تشویق یا اس کی کاھلی کے اعتبار سے اسے سزا دے، اور عادل قاضی یہ ہے جو مال کو اس کے مالک کے حوالہ کر دے۔

اسی طرح حکمت الٰہی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ تمام مخلوقات کو ایک جیسا خلق کرے، جیسے کہ پرندوں کی طرح انسان کو بھی بال و پر عطا کرے... بلکہ حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ جہان کو اسی صورت میں خلق کرے کہ جس سے زیادہ سے زیادہ خیر و کمال مل سکے، اور مختلف موجودات کو انتہائی ہدف کے مطابق خلق کرے اسی طرح حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر انسان کو اس کی استعداد کے مطابق عمل انجام دینے کا حکم دے(۱) اور پھر اس کی استعداد اور توانائی کے مطابق قضاوت کرے(۲) اور اس کے عمل کے عوض میں سزا، یا جزا عطا

کرے۔(۳)

دلیل عدل الٰہی۔

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے کہ عدل ایک تعریف کے مطابق حکمت الٰہی کا حصہ اور دوسری تعریف کے مطابق عین حکمت الٰہی ہے، لہٰذا اس کے اثبات میں دلیل بھی ایسی ہونی چاہیے جو حکمت الٰہی کو ثابت کر سکے، جس کے بارے میں گیارہویں درس میں اشارہ کیا جا چکا ہے، یہاں پر مزید اس کی وضاحت کی جا رہی ہے

....

(۱)لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفساً اِلاَّ وُسعَھَا .سورۂ بقرہ۔ آیت/۲۸۶
(۲)وَقُضِیَ بَینَھُم بِالقِسطِ وَھُم لاَ یُظلَمُونَ.سورۂ یونس۔آیت/۵۴
(۳)فَالیَومَ لاَ تُظلَمُ نَفس شَیئاً وَلاَ تُجزَونَ اِلَّا مَا کُنتُم تَعمَلُونَ.سورۂ یس۔ آیت /۵۴

ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ خدا بے نہایت قدرت واختیار کا مالک ہے اور تمام ممکن الوجود امور اسی کی قدرت میں ہیں، اور کسی بھی خارجی طاقت کے سامنے تسلیم اور مغلوب ہوئے بغیر امور کی انجام دہی یا انھیں ترک کرنے پر قادر ہے، لیکن ہر وہ فعل جسے انجام دے سکتا ہے انجام نہیں دیتا بلکہ جس کے لئے ارادہ بناتا ہے اسے انجام دیتا ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا ارادہ بے حساب وکتاب نہیں ہے، بلکہ صرف وہ اپنے صفات کمالیہ کے مطابق ارادہ بناتا ہے، اور اگر اس کے صفات کمالیہ کسی فعل کا تقاضا نہ رکھتے ہوں تو

وہ کبھی بھی اسے انجام نہیں دیتا، چونکہ ذات خداوند کمالِ محض ہے، لہٰذا اس کا ارادہ بھی مخلوقات کے کمال اوران کے خیر سے متعلق ہوتا ہے، اور اگر کسی مخلوق کے وجود کا لازمہ، جہان میں نقائص کی پیدائش کا سبب ہوتو اس کے نقائص مقصود بالتبع ہوں گے۔

یعنی اس لئے کہ وہ خیر فراواں ناقابل انفکاک (شر) کا لازمہ ہے، لہٰذا اس خیر غالب سے ارادہ الٰہی متعلق ہوگا۔

پس الٰہی صفات کمالیہ کا اقتضایہ ہے کہ جہان اس طرح خلق ہو کہ جو مجموعاً زیادہ سے زیادہ خیر و کمال کا سر چشمہ بن سکے لہذا یہیں سے خدا کے لئے صفات کمالیہ ثابت ہوجاتے ہیں اسی بنیاد پر ارادۂ الٰہی اسی انسان کی خلقت سے متعلق ہوتا ہے کہ جس میں امکان وجود ہو اور خیر و برکت کا منشا ہو، اور انسان کے امتیازات میں سے اس کا مختار ہونا اور ارادہ کے اعتبار سے آزاد ہونا ہے، بے شک اختیار وانتخاب کی طاقت سے متصف ہونا کمالات وجودی میں سے شمار کیا جاتا ہے، لیکن انسان کے مختار ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ نیک امور انجام دے، اور اپنے انتہائی کمال کی جانب قدم بڑھاتا رہے، اوراس میں اتنی طاقت ہو کہ وہ ناپسند اور برُے امور سے اپنے آپ کو بچالے تاکہ شقاوت جاودانی اور خسران عظیم سے محفوظ رہ سکے، البتہ وہ امر جو تنہا ارادہ الٰہی سے متعلق ہوتا ہے وہ صرف تکامل ہے لیکن چونکہ انسان کے تکاملِ اختیاری کے لازمہ کے ساتھ امکانِ سقوط بھی ہے، جو نفسانی خواہشوں کی پیروی سے حاصل ہوتا ہے، لہٰذا ایسا سقوط اختیاری بھی بالتبع ارادہ الٰہی سے متعلق ہوگا۔

اور چونکہ صحیح انتخاب خیر وشر کی راہوں کی صحیح شناخت کا محتاج ہے، لہٰذا خدا نے انسان کو انھیں

امور کے انجام دینے کا حکم دیا ہے جن میں زیادہ سے زیادہ خیر و مصلحت ہو اسی طرح تباہی و بربادی کے عوامل سے بچنے کا حکم بھی دیا ہے، تا کہ اس طرح اس کے تکامل کا وسیلہ فراہم ہو جائے اور چونکہ تکالیف اور احکام اس لئے وضع ہوئے ہیں تا کہ انسان ان پر عمل کرتے ہوئے مفید نتائج تک پہنچ سکے کہ جس میں خدا کے لئے نہ کوئی نفع ہے اور نہ ہی نقصان، اس وجہ سے حکم الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ یہ احکام مکلفین کی طاقت کے مطابق ہوں اس لئے کہ وہ احکام جن پر عمل نہیں کیا جا سکتا وہ بے فائدہ اور لغو ہیں۔

پس اس طرح عدل کا پہلا مرحلہ (اپنے خاص معنی میں) یعنی مقام تکلیف میں عدالت اس دلیل سے ثابت ہے کہ اگر خدا بندوں کی طاقت سے ماوراء ان پر کوئی حکم نافذ کرے تو وہ چونکہ امکان عمل سے باہر ہے لہٰذا ایک بے فائدہ عمل کہلائے گا۔

لیکن بندوں کے درمیان فیصلہ میں عدالت کا مسئلہ اس نکتہ کی طرف توجہ دینے کے ذریعہ ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا کا ایسا کرنا صرف اس وجہ سے ہے تا کہ سزا و جزا کے اعتبار سے انسان مشخص ہو سکے، لہذا اگر ایسی صورت میں خدا نے عدل و انصاف سے کام نہیں لیا تو نقص غرض لازم آئیگی۔

آخر کار سزا اور جزا دینے کا مقصد مقام عدالت ہدفِ خلقت کے پیش نظر ثابت ہو جاتا ہے اس لئے کہ جس نے انسان کو اچھے اور برے امور کے نتائج تک رسائی کے لئے خلق کیا ہے اگر انھیں اس ہدف کے خلاف سزا یا جزا دینا چاہے تو وہ کبھی بھی اپنے ہدف تک نہیں پہنچ سکتا۔

لہذا تمام مظاہر کے درمیان عدل الٰہی کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اس کے صفات ذاتیہ حکیمانہ اور

عادلانہ اعمال کا سبب ہیں اور ایسی کوئی صفت بھی اس کی ذات میں نہیں پائی جاتی جس میں ظلم وستم یا عبث ہونے کا شائبہ پایا جاتا ہو۔

چند شبہات کا حل۔

۱۔مخلوقات کے درمیان خصوصاً انسانوں میں موجود اختلافات عدل الٰہی سے کس طرح سازگار ہیں؟ اور کیوں خدا نے اپنی تمام مخلوقات کو یکساں خلق نہیں کیا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مخلوقات کے درمیان خلقت کے اعتبار سے موجودہ اختلافات نظام خلقت اور اس پر حاکم قانونِ علت ومعلول کا لازمہ ہیں تمام مخلوقاتکا اپنی خلقت میں یکساں ہونا ایک خام خیالی ہے اگر اس سلسلہ میں ہم تھوڑا بھی غور کرلیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ فرض ترک خلقت کے مساوی ہے اس لئے کہ اگر تمام مخلوقات مرد یا عورت ہوتے تو نسل آگے بڑھ نہیں سکتی تھی اور انسانی نسل کا خاتمہ ہو جاتا، اسی طرح اگر تمام مخلوقات انسان ہوتی تو انھیں اپنی احتیاجات کو برطرف کرنے کے لئے کوئی چیز باقی رہ نہ جاتی اس کے علاوہ اگر تمام حیوانات یا نباتات ایک ہی جیسے اور ایک ہی رنگ سے سرفراز ہوتے تو ایسے دلکش مناظر کے علاوہ مختلف فوائد کا وجود نہ ہوتا، موجودات کا مختلف اشکال میں پیدا ہونا مادہ کے تغیرات کا نتیجہ ہے، اور خلقت سے پہلے کسی کا کوئی بھی حق خدا کے ذمہ نہیں ہے کہ وہ اسے کیسے اور کس شکل میں خلق کرے، کہاں قرار دے کس مقام میں اتارے، تا کہ اس طرح عدل قائم رہے اور ظلم کا خاتمہ ہو جائے۔

۲۔ اگر حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اس جہان میں خلق کرے، تو پھر اسے موت کیوں دیتا ہے اور کیوں اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ

پہلے تو یہ: اس جہان میں موجودات کی زندگی اور موت قوانین تکوینی اور علت ومعلول روابط کی وجہ سے ہے، اور یہی نظام خلقت کا لازمہ بھی ہے

دوسرے یہ کہ: اگر زندہ موجودات نہیں مرتے اور باقی رہ جاتے تو آئندہ مخلوقات کے لئے خلقت کا کوئی مقام نہیں رہ جاتا اور وہ وجود وحیات کی نعمتوں سے محروم ہو جاتے۔

تیسرے یہ کہ: اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تمام انسان خلقت کے بعد ہمیشہ زندہ رہیں تو چند ہی سال کے اندر یہ زمین انسانوں کے لئے تنگ ہو جاتی اور لوگ رنج والم اور تنگی کی وجہ سے موت کی تمنا کرنے لگتے۔

چوتھے یہ کہ: انسان کی خلقت کا اصل ہدف کمال تک پہنچنا ہے اور جب تک انسان موت کے ذریعہ اس جہان سے جہانِ ابدی میں منتقل نہیں ہوتا اس وقت تک اپنے انتہائی ہدف تک نہیں پہنچ سکتا۔

۳۔ یہ اس زمین پر بے شمار طبیعی بلاؤں اور رنج والم (جیسے زلزلہ سیلاب وغیرہ) اور اجتماعی مشکلات جیسے جنگ، جدال) کیونکر عدل الٰہی سے سازگار ہیں؟

سب سے پہلے، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایسے ناگوار حوادث کا وجود مادی تغیرات کا نتیجہ ہے اور جبکہ اس کی حکمت ان کے عیوب پر غالب ہے لہٰذا یہ کسی بھی حال میں مخالف حکمت

نہیں ہو سکتے اس کے علاوہ اجتماعی مشکلات کا اٹھنا انسان کے مختار ہونے کا لازمہ ہے جو حکمت الٰہی کا تقاضا ہے اور زندگی کے مصالح اس کے مفاسد سے کہیں زیادہ ہیں اس لئے کہ اگر صرف مفاسد ہی مفاسد ہوتے تو اس زمین پر کوئی انسان باقی نہ رہتا۔

دوسرے یہ کہ، ایک طرف بے شمار رنج و زحمت کا ہونا اسرار طبیعت کو کشف کرنے کے لئے انسانوں کی حرکت کا سبب اور مختلف علوم وفنون کے ایجاد کا انگیزہ ہے اور دوسری سختیوں سے نبرد آزمانا، نیز اس سے مقابلہ کرنا انسانی صلاحیتوں کو پر ثمر بنانے کے لئے اور راہ تکامل کو طے کرنے کے لئے ایک زبردست عامل ہے اس کے علاوہ اس جہان میں اگر سختیوں کو تحمل کرنا نیت خیر کے ساتھ ہو تو جہانِ ابدی میں عظیم نعمات سے سرفرازی کا سبب ہے۔

٤۔ اس زمین پر ہونے والے محدود گناہوں کی سزا عذاب ابدی کی شکل میں کیونکر عدالت سے سازگار ہے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ نیک اور بد اعمال کے درمیان، اور اخروی سزا و جزا کے درمیان ایک قسم کا رابطۂ علیت پایا جاتا ہے جسے وحی الٰہی کے ذریعہ لوگوں کو سنادیا گیا ہے اور جس طرح اس جہان میں بعض حوادث واشرار، طولانی آثار کا سبب بنتے ہیں جیسے کہ انسان کا اپنی یا دوسروں کی آنکھوں کو پھوڑ دینا ایک لحظہ کا عمل ہے لیکن اس کے آثار یعنی نابینائی آخر عمر تک باقی رہتی ہے اس طرح بڑے بڑے گناہ آخرت میں ابدی آثار سے متصف ہیں، لہٰذا اگر کوئی اس جہان میں انھیں ان کی تلافی نہ کرے (جیسے کہ توبہ نہ کرے) تو اس کے برے آثار ابد تک ،اس کے دامن پر رہیں گے، جس طرح انسانوں کا آخری عمر تک اندھا رہنا تنہا اور تنہا ایک لحظہ

کی شرارات کا نتیجہ ہے، اور عدل الٰہی سے کوئی منافات نہیں رکھتا، اسی طرح گناہوں کے نتیجہ میں عذاب ابدی میں گرفتار ہونا، عدل الٰہی سے منافات نہیں رکھتا، اس لئے کہ جو کچھ بھی دیکھ رہا ہے، وہ ان گناہوں ں کا نتیجہ ہے، جسے اس نے جانتے ہوئے انجام دیا ہے۔

سوالات

١۔عدل الٰہی کے مسئلہ میں موجودہ اختلاف کا ریشہ کیا ہے؟

٢۔مفہوم عدل کی وضاحت کریں؟

٣۔کیا عدل کا لازمہ تمام موجودات کا ایک ہونا ہے؟ کیوں؟

٤۔حکمت اور عدل الٰہی کے لوازمات کیا ہیں؟

٥۔عدل الٰہی کی دلیل کیا ہے؟

٦۔انسان کے خلق کرنے کا ہدف کیا ہے؟

٧۔مخلوقات کے درمیان تکوینی اختلافات کس طرح عدل اور حکمت الٰہی سے سازگار ہیں؟

٨۔کیوں خدائے حکیم اپنی مخلوقات کو موت دیتا ہے؟

٩۔طبیعی اور اجتماعی بلائیں کس طرح حکمت الٰہی سے سازگار ہیں؟

١٠۔کیوں ایک محدود گناہ، ابدی عذاب میں گرفتاری کا سبب ہوتے ہیں؟

اکیسواں درس

مسائل نبوت پر بحث کرنے کے نتائج

مقدمہ

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے۔

اس حصہ کے مباحث کا ہدف

علم کلام میں تحقیق کی روش

مقدمہ

ہمیں یہ مطلب معلوم ہو چکا ہے کہ وہ مسائل جنھیں حل کرنا اور جاننا ہر عاقل شخص پر واجب ہے تا کہ وہ ایک انسانی زندگی بہ حُسن خوبی گذار سکے، درج ذیل ہیں۔

١۔ انسان اور جہان کا وجود کس سے ہے یا اِن دونوں کی تدبیر اور ارادہ کس کے ہاتھ میں ہے؟

٢۔ انسان کی زندگی کا انتہائی مرحلہ اور انتہائی ہدف کہاں ہے؟

٣۔ انسانوں کی وہ احتیاجات جس کے لئے بھی صحیح زندگی گذارنے کے طور طریقہ کا جاننا ضروری ہے تا کہ اس راستہ کے ذریعہ کمال حقیقی اور سعادت ابدی کو حاصل کیا جا سکے، لہٰذا ان مسائل کے پیش نظر کیا اس معرفت کو حاصل کرنے میں کوئی ضمانت ہے؟ اور اگر ہے؟ تو کن

لوگوں کے اختیار میں ہے؟

ان سوالات کے صحیح جوابات دراصل (توحید، قیامت، نبوت) جیسے اصول ہیں کہ جو تمام ادیان آسمانی میں اصلی ترین عقائد میں شمار کئے جاتے ہیں۔

ہم نے اس کتاب کے پہلے مرحلہ میں معرفتِ خدا کے تحت بحث کی ہے اور اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ تمام موجودات اپنے وجود کو، خالق ہستی سے حاصل کرتے ہیں، اور ہر ایک اسی کے حکیمانہ تدبیر کے زیر سایہ ہیں۔ اور کوئی بھی کسی بھی حال میں کہیں بھی، اور کسی بھی امر میں اس سے بے نیاز نہیں ہے

ہم نے ان مطالب کو، عقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کر دیا ہے، اور اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ ایسے مسائل کو صرف عقلی دلائل کے ذریعہ ہی حل کیا جا سکتا ہے، اس لے کہ تعبدی دلائل اور کلام خدا کو، اسی وقت دلیل بنایا جا سکتا ہے جب وجود خدا اور اس کا کلام اس کا معتبر ہونا، دلیل عقلی کے ذریعہ ثابت ہو چکا ہو، جس طرح سے کہ نبی اور امام کے کلام کو سنت قرار دینا، ان کی نبوت و امامت اور ان کے کلام کی حجیت کے اثبات پر منحصر ہے تفصیل معاد کو وحی کے ذریعہ ثابت کیا جا سکتا ہے، اگر چہ اصل قیامت، عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعہ قابل اثبات ہے۔

لہذا (نبوت اور قیامت) کے مسائل کو بیان کرنے کے لئے پہلے عقلی دلائل کے ذریعہ اصل قیامت اور اصل نبوت کو ثابت کرنا ہوگا، پھر جب رسول اکرم کی نبوت اور قرآن کریم کی حقانیت ثابت ہو جائے تو کتاب و سنت کے مطابق ان دونوں کے تفصیلی مسائل کو بیان کیا

جائے گا، لیکن چونکہ ان دونوں کے مسائل کو جداگانہ بیان کرنا سمجھانے کے لئے نہایت مفید ہے لہٰذا گذشتہ سنت پر عمل کرتے ہوئے پہلے ہم نبوت کے مسائل اور پھر قیامت کے مسائل کو بیان کریں گے اور اگر بعض مقامات پر کسی ایسے مطلب کی ضرورت پڑی کہ جسے بعد میں ثابت کرنا ہوا تو اس کو استدلال کے درمیان (اصل موضوع) کے عنوان سے ذکر کردیں گے تا کہ بآسانی بات اپنی جگہ پر ثابت ہو سکے۔

اس حصہ کے مباحث کا ہدف

اس حصہ کو ذکر کرنے سے ہمارا پہلا ہدف یہ ہے کہ حقائق ہستی اور صحیح زندگی کے راستوں کی معرفت حاصل کرنے کے لئے حس و عقل کے علاوہ ایک اور راستہ بھی ہے، کہ جس میں خطا کا کوئی امکان نہیں ہے، جسے وحی کہا جاتا ہے جو ایک قسم کی الٰہی تعلیم ہونے کے ناطے اس کے خاص بندوں سے مخصوص ہے اور عوام اس کی حقیقت سے بے خبر ہے، لیکن آثار اور علامتوں کے ذریعہ وحی کے ہونے کا پتہ لگاتے ہوئے انبیاء الٰہی کے ادّعا یعنی وحی کے ہونے پر یقین کیا جاسکتا ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کسی کے لئے وحی الٰہی کا ہونا ثابت ہوجائے اور جب اس کے پیغامات دوسروں تک پہنچ جائیں تو ان پر واجب ہے، کہ اس کے احکامات پر عمل کریں، اور اس صورت میں کوئی بھی اس کی مخالفت کر کے عذر پیش نہیں کرسکتا، مگر یہ کہ وحی کسی خاص فرد، یا گروہ یا ایک معین زمانہ سے مخصوص ہو۔

لہٰذا اِس حصہ کے بنیادی مسائل، بعثت انبیاء کی ضرورت، وحی کا لوگوں تک پہنچنے تک عمدی یا

سہوی تصرفات سے محفوظ رہنا، یا انبیاء کا پیغامات الٰہی کو لوگوں تک پہنچانے میں معصوم ہونا، اوران کی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے کافی دلائل کا ہونا وغیرہ ہیپس جب وحی اور نبوت کے بنیادی مسائل دلیل عقلی کے ذریعہ ثابت ہو گئے تو اُس کے بعد دوسرے مسائل جیسے تعدد انبیائ، کتب، آسمانی شریعتیں، آخری رسول آخری کتاب اوران کے جانشین کی تعیین جیسے مسائل کے تحت بحث کی جائے گی۔

لیکن ان تمام مسائل کو عقلی برہان کے ذریعہ ثابت کرنا میسر نہیں ہے بلکہ بہت سے مقامات پر نقلی اور تعبدی دلائل کا سہارا لینا ضروری ہے۔

علم کلام میں تحقیق کی روش

اب تک جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کے مطابق فلسفہ اور علم کلام کے درمیان بنیادی فرق روشن ہو گیا اس لئے کہ فلسفہ ان مسائل میں سے ہے کہ جو عقلی دلائل کے ذریعہ ثابت ہوتا ہے لیکن علم کلام ان مسائل پر مشتمل ہے کہ جو نقلی اور تعبدی دلائل کے بغیر قابل اثبات نہیں ہے۔

ایک دوسری تعبیر کے مطابق فلسفہ اور علم کلام کے درمیان موجودہ نسبت (عموم خصوص من وجہ) کی ہے یعنی فلسفہ اور علم کلام مشترک مسائل سے متصف ہوتے ہوئے دونوں اپنے مخصوص مسائل کے مالک بھی ہیں، ہاں فلسفہ کے اپنے مخصوص مسائل عقل کی بنیاد پر حل کئے جاتے ہیں، لیکن علم کلام کے مسائل عقلی اور تعبدی دلائل کے ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔

ایک دوسری تعبیر کے مطابق درحقیقت علم کلام (تلفیقی) یعنی اس میں دلائل عقلی کے استعمال

کے علاوہ تعبدی دلائل کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔

نتیجہ۔فلسفہ اور علم کلام میں دو بنیادی فرق یہ ہے کہ دونوں مشترک مسائل (خدا کی معرفت) سے سرفراز ہونے کے علاوہ کچھ مخصوص مسائل کے مالک بھی ہیں، کہ جن میں فلسفہ کے مخصوص مسائل سے کلام اور کلام کے مخصوص مسائل سے فلسفہ میں بحث نہیں کی جاتی، اور دوسرا فرق یہ ہے کہ فلسفہ میں اس کے مسائل کے تحت تحقیق ایک، عقلی روش ہے لیکن علم کلام اپنے بعض مسائل میں جو ان دونوں میں مشترک ہیں عقلی روش کے ذریعہ اور بعض مسائل (جیسے امامت) میں نقلی روش کے ذریعہ بحث کرتا ہے، لیکن بعض مقام پر (جیسے اصل قیامت کو ثابت کرنے کے لئے) دونوں روش کو استعمال میں لاتا ہے، اِس مقام پر اِس بات کی طرف اشارہ کرنا لازم ہے، کہ علم کلام کے اپنے تمام خاص مسائل جو نقلی اور تعبدی روش کے ذریعہ ثابت ہوتے ہیں، ایک جیسے نہیں ہیں، بلکہ بعض مسائل جیسے رسول اکرم کے کردر و گفتار کی حجیّت خود قرآنی آیات کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے لیکن اس سے پہلے عقلی دلائل کے ذریعہ قرآن کی حقانیت کا ثابت ہونا ضروری ہے اور پھر آنحضرت کے خلفا کے تعیین اور اُن کے اقوال کی حجیت کے تحت بحث کی جاتی ہے۔

لیکن یہ امر واضح و آشکار ہے کہ دلائل نقلی کے ذریعہ حاصل ہونے والے نتائج اس صورت میں یقینی ہوں گے کہ جب ان کی سند قطعی اور ان کی دلالت آشکار ہوں۔

سوالات

۱۔ کیوں خدا کی معرفت کے بعض مسائل کو ہم نے صرف عقلی اسلوب کے ذریعہ بیان کیا ہے؟

۲۔ نبوت کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟

۳۔ کیا نبوت اور قیامت کے بنیادی مسائل کو نقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا ان دونوں میں کوئی فرق ہے؟

٤۔ علم کلام کے کن مسائل کو نقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا جا سکتا ہے؟

٥۔ مسائل نبوت کو معاد کے مسائل پر مقدم کرنے کی وجہ کیا ہے؟ اور کیا ان دونوں کے مسائل کو منظم کرنے کے لئے کوئی منطقی ترتیب ہے؟

٦۔ فلسفہ اور علم کلام میں کیا فرق ہے؟

۷۔ علم کلام کے مسائل کے اثبات کی جہت سے اُسے چند قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ ان قسموں کی ترتیب بیان کریں؟

بائیسواں درس

بشر کو وحی اور نبوت کی ضرورت

بعثت انبیاء (ع) کی ضرورت

بشری علم کی نا کامی

بعثت انبیاء (ع) کے فوائد

بعثت انبیاء (ع) کی ضرورت۔

یہ مسئلہ نبوت کے مسائل میں سے ہے جسے ایک ایسے برہان کے ذریعہ ثابت کرنا ہوگا کہ جو تین مقدمات پر مشتمل ہو۔

پہلا مقدمہ یہ ہے انسان کی خلقت کا ہدف یہ ہے کہ وہ اپنے مختار ہونے کے ساتھ اعمال کے ذریعہ راہ تکامل کو انتہائی کمال تک طے کرے، ایسا کمال کہ جو انسان کے مختار ہوئے بغیر قابل دست رسی نہیں ہے، ایک دوسری تعبیر کے مطابق انسان کو اس لئے خلق کیا گیا ہے، کہ وہ خدا کی اطاعت وعبادت کے ذریعہ اپنے وجود میں رحمت الٰہی کی دریافت کی لیاقت پیدا کرے، جو صرف اور صرف انسان کامل سے مخصوص ہے، اور خدا کا ارادہ بھی انسان کی سعادت اور اس کے کمال سے متعلق ہے لیکن چونکہ یہ سعادت اختیاری افعال انجام دئے بغیر میسر نہیں ہے اس مسئلہ نے بشری زندگی کو دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے، تا کہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہے

انتخاب کرے جن میں سے ایک راستہ شقاوت کی طرف جاتا ہے جو بالتبع ارادہ الٰہی سے متعلق ہے نہ بالا صالۃً۔

یہ مقدمہ عدل وحکمت الٰہی کی بحث کے ضمن میں واضح ہوگیا۔

دوسرا مقدمہ: یہ ہے کہ غور وفکر کے ذریعہ اختیار وانتخاب کرنا، مختلف امور کی انجام دہی میں بیرونی عوامل کا مہیا ہونا اوران کی طرف باطنی کشش کے پائے جانے کے علاوہ امور کے صحیح یا غلط ہونے اوراسی طرح شائستہ اور ناشائستہ راستوں کی ضرورت ہے، اورانسان اسی صورت میں غور وفکر کے ساتھ انتخاب کرسکتا ہے کہ جب ہدف اوراس تک پہنچنے والے راستہ کو اچھی طرح جانتا ہو، اوراس کے فراز ونشیب، پیچ وخم سے پوری طرح آگاہ ہولہذا حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی معرفت کے حصول کے لئے خداوند متعال ضروری وسائل وامکانات، بشر کے اختیار میں قرار دے، وگرنہ اس کی مثال اس شخص کی ہوگی جو کسی کو اپنے مہمان سرا پر دعوت دے، لیکن اسے اس کا پتہ اور وہاں تک جانے والے راستہ کی نشاندہی نہ کرے، ظاہر ہے کہ ایسا عمل حکمت اورغرض کے خلاف ہوگا۔

یہ مقدمہ بھی چونکہ واضح ہے لہٰذا اس کے لئے زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

تیسرا مقدمہ: یہ ہے کہ انسانوں کی وہ معمولی معرفت جو حس وعقل کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے اگرچہ انسانی ضروریات کو پورا کرنے میں اپنا پورا کردارادا کرتی ہے لیکن سعادت حقیقی اورراہ کمال کو فردی واجتماعی، مادی ومعنوی، دنیوی وآخروی پہلوں کے لحاظ سے پہچاننے کے لئے کافی نہیں ہے، اوراگران مشکلات کے حل کے لئے کوئی اورراستہ نہ ہوتو انسان کی خلقت سے

خدا کا ہدف پورا نہیں ہوسکتا۔

ان مقدمات کی بدولت ہم اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ راہ تکامل کی پہچان کے لئے حس و عقل کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ انسان کے اختیار میں ہونا چاہیے، تا کہ انسان براہ راست یا ایک یا چند واسطہ کے ذریعہ اس سے مستفید ہو سکے، ہاں، یہ وہی وحی کا راستہ ہے جسے خدا نے اپنے انبیاء (ع) کے اختیار میں دے دیا ہے، جس سے عوام، انبیاء (ع) کے ذریعہ اور انبیاء (ع) براہ راست مستفید ہوتے ہیں، اور جو چیز کمال نہائی اور سعادت کے حصول میں ضروری ہے اسے انسانوں کے اختیار میں قرار دیا ہے۔

ان تینوں مقدموں میں تیسرے مقدمہ کی بہ نسبت ممکن ہے کسی کے دل میں کوئی شبہ پیدا ہو لہٰذا اس سلسلہ میں تھوڑی سی وضاحت کریں گے تا کہ اس طرح راہ تکامل کی تشخیص میں علوم بشری کی کمزوری اور بشر کیلئے راہ وحی کی ضرورت پوری طرح روشن ہوجائے۔

بشری علوم کی ناکامی۔

زندگی کے صحیح راستہ کو اس کے تمام جوانب کے ساتھ پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے انسان کے آغاز وانجام نیز بقیہ موجودات کے ساتھ اس کے روابط اور مخلوقات کے ساتھ اس کی معاشرت کے علاوہ سعادت وشقاوت میں اثر انداز ہونے والے مختلف پہلوؤں کا جانا ضروری ہے نیز مصالح ومفاسد، سود وزیاں میں کمی اور زیادتی کی تشخیص بھی ضروری ہے، تا کہ اس طرح کھربوں انسان کے وظائف مشخص ہوسکیں، جو مختلف طبیعی اور اجتماعی

شرائط اور بدنی اور وحی تفاوت واختلافات کے ساتھ زندگی گذارر ہے ہیں،لیکن ان تمام امور پرایک یا چندافراد کی بات کیا ہزاروں علوم انسانی کے ماہرین بھی اکٹھا ہوجائیں تو بھی ایسے پیچیدہ فارمولے کو کشف کر کے اسے منظم اصول وقوانین کی ایسی شکل نہیں دے سکتے کہ جو تمام انسانوں کے لئے فردی و اجتماعی، مادی، معنوی، دنیوی و اخروی اعتبار سے مصالح و مفاسد کی ضمانت دے سکے، اس کے علاوہ بے شمار مصالح و مفاسد کے ٹکراؤ کے دوران جو اکثر اوقات پیش آتے ہیں ان میں اہم کو انتخاب کر کے وظیفہ کو معین کرنا بھی ان کی استطاعت کے باہر ہے۔

تاریخ بشر میں بدلتے ہوئے قوانین نے اس بات کو ثابت کردیا ہے کہ ہزاروں سال تک ہزاروں حقوق دانوں کی تحقیق و جستجو سے آج تک کامل اور عیب ونقص سے مبرا قوانین کا ایک مجموعہ وجود میں نہیں آسکا، بلکہ ہمیشہ قانون کو وضع کرنے والے ایک مدت کے بعد اپنے ہی وضع کردہ قانون میں خطا سے آگاہ ہوئے، یا تو اسے بدل دیا یا پھر اسے کسی دوسرے وضع کردہ قانون کے ذریعہ کامل کردیا۔

لیکن اس مقام پر اس مطلب کی طرف توجہ مبذول رہے، کہ انھوں نے بہت حد تک اپنے قوانین کو وضع کرنے میں الٰہی قوانین کا سہارالیا ہے اور یہ بھی معلوم رہے، کہ قانون گذاروں کی تمام سعی وکوشش دنیوی اور اجتماعی زندگی کو سنوارنے کے لئے صرف ہوتی رہی ہے، لیکن کبھی بھی انھوں نے اخروی منافع کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور دنیوی قوانین سے اس کا کوئی موازنہ نہیں کیا، بلکہ اگر وہ اس مسئلہ کو مدنظر رکھ کر قوانین وضع کرتے تو کبھی بھی اس راہ میں

کامیاب نہ ہوتے، اس لئے کہ مادی اور دنیوی مصلحتوں کو ایک حد تک تجربوں کے ذریعہ معین کیا جاسکتا ہے لیکن معنوی اور اخروی مصلحتیں کسی بھی حال میں تجربہ حسی کے قابل نہیں ہیں، اور پوری طرح سے اس کے مصالح کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، اسی طرح ان کے لئے مصالح اخروی اور مصالح دنیوی کے ٹکراؤ کے ہنگام اہم ومہم کو تشخیص دینا بھی غیر ممکن ہے؟

بشر کے موجودہ قوانین کی حالت کو دیکھتے ہوئے ہزاروں سال پہلے جینے والے انسانوں کے علوم کا انداہ لگایا جاسکتا ہے اور یہ قطعی نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ گذشتہ ادوار میں جینے والے اس عصر میں جینے والوں کے مقابلہ میں زندگی کے صحیح راستہ کی تشخیص میں نہایت ناتواں تھے، اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اس عصر کے انسانوں سے ہزاروں سالہ تجربات کے پیش نظر کامل قوانین کے مجموعہ کو وضع کرنے میں کامیابی حاصل کر بھی لی ہے یا بالفرض یہ قوانین انسانوں کی اخروی سعادت کے ضامن بھی بن گئے ہیں، لیکن پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ کس طرح ہزاروں انسانوں کو ان کی جہالت میں چھوڑ دینا حکمت الٰہی سے سازگار ہے؟

نتیجہ۔ آغاز سے انجام تک انسانوں کی خلقت کا ہدف اسی صورت میں قابل تحقّق ہے کہ جب زندگی کے حقائق اور فردی و اجتماعی وظائف کی معرفت کے لئے حس و عقل سے ماورا کوئی دوسرا راستہ بھی موجود ہو، اور وہ راستہ وحی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوسکتا۔

اس بحث کی روشنی میں یہ مطلب بھی واضح ہوگیا کہ اس برہان کا تقاضا یہ ہے کہ اس زمین پر قدم رکھنے والے سب سے پہلے انسان کا نبی ہونا ضروری ہے تاکہ وہ وحی کے ذریعہ زندگی کے صحیح طریقہ کو پہچانے اور ہدف خلقت اُس کے متعلق متحقق ہوجائے اور اس کے بعد آنے

والے انسان اسی کے ذریعہ ہدایت یافتہ ہوں۔

بعثت انبیاء (ع) کے فوائد۔

انبیاء الٰہی انسانوں کے کمال کو مشخص کرنے اور وحی کو دریافت کرنے کے بعد لوگوں کے سامنے اُسے بیان کرنے کے علاوہ انسانوں کے تکامل (بتدریج کمال تک پہنچنے) کے لئے دوسرے مہم راستوں سے بھی آگاہ تھے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ بہت سے ایسے مطالب ہیں کہ جنھیں درک کرنے کے لئے انسانی عقول میں طاقت نہیں ہے، بلکہ اسے سمجھنے کے لئے گذشتہ زمانے کے علاوہ بے شمار تجربوں کی ضرورت ہے یا پھر وہ مطالب حیوانی خواہشات میں ملوث ہونے اور مادیات سے وابسطہ ہونے کی وجہ سے فراموشی کا شکار ہو گئے ہیں، یا پھر زہریلی تبلیغات اور لوگوں کے درمیان غلط پروپگنڈوں کی وجہ سے مخفی ہو گئے ہیں، ایسے مطالب بھی انبیاء الٰہی کی جانب سے بیان کئے جاتے ہیں جنھیں پے در پے تذکرات اور بار بار تکرار کے ذریعہ پوری طرح فراموش ہونے سے بچا لیا جاتا ہے اور صحیح تعلیم کے ذریعہ ایسی زہریلی تبلیغات کے اثرات سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

یہیں سے انبیاء (ع) کا مذکّر اور نذیر اور قرآن کا ذکر اور تذکرہ جیسی صفات سے متصف ہونا سمجھ میں آتا ہے امام علی علیہ السلام بعثت انبیاء (ع) کی حکمتوں کو بیان کرنے کے دوران فرماتے ہیں

(لِیسَتأدُوهم میثاقَ فِطرَته و یُذکِّروهم مَنسِیِّ نِعمَتِه وَ یَحتجّوا عَلَیهم

بِالتّبليغ)

یعنی خدا نے اپنے رسولوں کو پے در پے بھیجا تا کہ لوگوں سے پیمان فطرت پر وفاداری کا اقرار لیں، فراموش شدہ نعمتوں کی یاد دلائیں اور تبلیغ کے ذریعہ اتمام حجت کریں:

۲۔ انسان کے تکامل (کمال کے آخری درجہ تک پہنچنے) کے مہم ترین عوامل میں سے اسوہ اور نمونہ کا ہونا ہے کہ جس کی اہمیت علم نفسیات ثابت ہے انبیاء الٰہی انسان کامل اور دست الٰہی کے ہاتھوں تربیت پانے کی وجہ سے اس کردار کو بہترین صورت میں پیش کرتے ہیں، لوگوں کو اپنی تعلیمات کامیابی حاصل کرنے کے علاوہ ان کی تربیت اور تزکیہ کا اہتمام بھی کرتے ہیں، اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ قرآن میں تعلیم وتزکیہ کو باہم ذکر کیا گیا ہے یہاں تک کہ بعض مقامات پر تزکیہ کو تعلیم پر مقدم کیا گیا ہے۔

۳۔ لوگوں کے درمیان انبیاء (ع) کے موجود ہونے کی برکات میں سے ایک برکت یہ بھی ہے کہ صورتحال کے موافق ہوتے ہی لوگوں کی سیاسی، اجتماعی رہبری کو بھی سنبھالتے ہیں، اور یہ امر بخوبی روشن ہے کہ ایک سماج کے لئے معصوم رہبر کا ہونا عظیم نعمتوں میں سے ہے اس لئے کہ اس کے ذریعہ سماج کی بہت سی مشکلات کو روک دیا جاتا ہے، اور سماج اختلاف، گمراہی اور کج روی سے نجات پا جاتا ہے اور کمال کی جانب گامزن ہو جاتا ہے۔

سوالات

۱۔انسان کی خلقت کا ہدف کیا ہے؟

۲۔کیا جس طرح خدا کا حکیمانہ ارادہ انسان کی سعادت سے متعلق ہے اسی طرح اس پر عذاب سے بھی متعلق ہے؟ یا پھران دونوں میں کوئی فرق ہے؟

۳۔غور وفکر کے ساتھ انسان کو اختیار و انتخاب کے لئے کن امور کی ضرورت ہے؟

٤۔کیوں عقلِ بشر تمام معارف کے سمجھنے میں ناقص وقاصر ہے؟

٥۔بعثت انبیاء (ع) کی ضرورت پر موجودہ برہان کو بیان کریں؟

٦۔اگر انسان طولانی تجربوں کے ذریعہ دنیوی اور اجتماعی سعادتوں کو حاصل کر لیتا تو کیا پھر بھی اسے وحی کی ضرورت تھی؟ اور کیوں؟

٧۔کیا سب سے پہلے انسان کے نبی ہونے پر دلیل قائم کی جاسکتی ہے؟

٨۔انبیاء (ع) کے موجود ہونے کے تمام فوائد کو بیان کریں؟

تیئسواں درس

چند شبہات کا حل

کیوں بہت سے لوگ انبیاء کی ہدایت سے محروم ہو گئے؟

کیوں خدا نے انحرافات اور اختلافات کا سد باب نہیں کیا؟

کیوں انبیاء الٰہی صنعتی اور اقتصادی امتیازات سے سرفراز نہ تھے؟

چند شبہات کا حل۔

بعثت انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں جو دلائل ذکر ہوئے ہیں انھیں دلائل کے ضمن میں چند شبہات اور سوالات ہیں جن کے جوابات یہاں ذکر کئے جائیں گے۔

کیوں بہت سے لوگ انبیاء ؑ کی ہدایت سے محروم ہو گئے؟

اگر تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے بعثت انبیاء کا اقتضا یہ ہے کہ وہ انبیاء کو مبعوث کرے تو پھر کیوں سب کے سب فقط ایک ہی سرزمین ایشیا میں مبعوث ہوئے، اور بقیہ سرزمینیں اس نعمت سے محرم رہیں، خصوصاً گذشتہ ادوار میں ارتباطات کے وسائل بہت محدود تھے اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک، کسی خبر کو پہنچانا نہایت سختی سے انجام پاتا تھا اور شاید اس وقت کچھ ایسی قومیں رہی ہوں، جنھیں اصلاً بعثت انبیاء کی کوئی خبر نہ ملی ہو۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ پہلے، انبیاء کی بعثت کسی خاص سرزمین سے مخصوص نہیں تھی، بلکہ قرآن کی آیات کے مطابق ہر امت اور ہر قوم کے پاس پیغمبر بھیجے گئے جیسا کہ سورۂ فاطر کی چوبیسویں آیت

میں خدا فرماتا ہے:

(وَان مِّن اُمَّۃٍ اِلَّا خَلا فِیھا نَذِیر)

اور دنیا میں کوئی امت ایسی نہیں گئی جس کے پاس ہمارا ڈرانے والا پیغمبر نہ آیا ہو۔

سورۂ نحل کی آیت چھتیسویں میں وارد ہوا ہے:

(وَلَقَد بَعَثنَا فِی کُلِّ اُمَّۃٍ رَسُولاً اَنِ اعبُدُوا اللّٰہَ وَاجتَنِبُوا الطَّاغُوتَ)

اور ہم نے تو ہر امت میں ایک نہ ایک رسول ضرور بھیجا کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں کی عبادت سے بچے رہو۔

اور اگر قرآن میں محدود انبیاء کا نام آیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کل انبیاء کی تعداد اتنی ہی تھی بلکہ خود قرآن کے بیان کے مطابق بہت سے انبیاء تھے کہ جن کے اسماء اس قرآن میں ذکر نہیں کئے گئے، جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت ۱٦٤ میں خدا فرماتا ہے:

(وَرُسُلاً لَّم نَقصُصھُم عَلَیکَ)

جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا گیا۔

دوسرے: اس برہان کا تقاضا یہ ہے کہ حس وعقل کے ماوراء کوئی ایسا راستہ ہونا چاہیے کہ جس کے ذریعہ یہ امکان ہو کہ لوگوں کی ہدایت کی جا سکے، لیکن بشر کی ہدایت کو مرحلۂ فعلیت تک پہنچنے کے لئے دو شرط ہے۔

۱۔ پہلییہ کہ وہ لوگ خود اس نعمت الٰہی سے استفادہ کرنا چاہیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ کوئی دوسرا اُن کی ہدایت میں مانع ایجاد نہ کرے، اور لوگوں کا انبیاء سے محروم ہونے کا سبب خود اُن کے ناجائز اختیارات تھے، جس طرح کہ بہت سے لوگوں کا انبیاء کی ہدایت سے محروم ہونا اِنھیں موانع کی وجہ سے ہے، جسے وہ لوگ خود انبیاء کی تبلیغ میں ایجاد کرتے تھے، اور ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ انبیاء الٰہی برابر ایسے موانع کو برطرف کرنے کے لئے کوشاں رہے، اور ہمیشہ ستمگروں، ظالموں اور مستکبروں سے برسر پیکار رہتے تھے، بلکہ انبیاء کی ایک کثیر تعداد راہ تبلیغ اور لوگوں کی ہدایت کی راہ میں شہید بھی ہوگئی، بلکہ جب بھی انھیں نیک ساتھیوں کی حمایت ملی تو

اُنھوں نے وقت کے اُن ظالموں سے مقابلہ کیا، کہ جو اُن کے اہداف میں موانع ایجاد کرتے تھے۔

قابل توجہ نکتہ تو یہ ہے کہ انسان کی تکاملی حرکت کی خصوصیات کا تقاضا یہ ہے کہ یہ تمام تدابیر اس طرح انجام پذیر ہوں کہ حق و باطل کے حامیوں کے لئے حسن انتخاب یا سوء انتخاب فراہم ہو جائے، مگر یہ کہ ظالموں اور مستکبروں کا تسلط اس حد تک بڑھ جائے کہ ہادیوں کی ہدایت کا راستہ پوری طرح بند ہو جائے اور سماج سے نور ہدایت خاموش ہو جائے، یہی وہ صورت ہے کہ جب خدا غیب اور غیر عادی راہوں سے حق کے طرفداروں کی مدد فرماتا ہے۔

نتیجہ: اگر ایسے موانع انبیاء کے راستوں میں نہ ہوئے تو ان کی دعوتِ توحید تمام انسانوں کے کانوں تک پہنچ جاتی اور تمام انسان وحی اور نبوت کے ذریعہ نعمت ہدایت سے بہرہ مند

ہوجاتے، لہذا بہت سے لوگوں کا ہدایت انبیاء سے محروم ہونے کا گناہ، ان لوگوں کی گردنوں پر ہے کہ جنھوں نے راہ ہدایت انبیاء میں رکاوٹیں ایجاد کی ہیں۔

کیوں خدا نے انحرافات اور اختلافات کا سد باب نہیں کیا؟

اگر انبیاء تکامل انسان کے شرائط کو کامل کرنے کے لئے مبعوث ہوئے ہیں تو پھر کیوں ان کے ہوتے ہوئے بشر خطا اور بد بختیوں کا شکار رہا اور ہر زمانہ میں لوگوں کی ایک بڑی جماعت کفر و الحاد میں گرفتار رہی، یہاں تک کہ ادیان آسمانی کے پیروکاروں نے ایک دوسرے کے خلاف جنگ کے شعلہ بھڑکائے جس کی وجہ سے خونی جنگیں دیکھنے میں آئیں؟ کیا حکمت الٰہی کا تقاضا یہ نہ تھا کہ وہ کچھ ایسے راستہ بھی مہیا کرتا، جن کے ذریعہ ایسی بد بختیوں کا سد باب ہوجاتا اور کم از کم ادیان آسمانی کے پیروکار ایک دوسرے کے مقابلہ میں نہ ٹھہرتے۔

اس سوال کا جواب تکامل انسان کے اختیارات کی خصوصیات میں غور وفکر کرنے کے ذریعہ معلوم ہوجاتا ہے، اس لئے کہ حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کے تکامل کے اسباب و شرائط کا جبری ہونے کے بدلے اختیاری ہونا ضروری ہے تا کہ وہ لوگ جو راہ حق کو پہچاننا چاہتے ہیں اور اسے اختیار کرنا چاہتے ہیں، وہ کمال اور سعادت ابدی کو حاصل کرنے میں مختار رہیں، لیکن ایسے تکامل اور کمال کے لئے اسباب و شرائط کا مہیا ہوجانا اس معنی میں نہیں ہے کہ تمام انسانوں نے بہ نحو احسن اس سے استفادہ کیا ہو، اور صحیح راستہ کا انتخاب کیا ہو بلکہ قرآن کی تعبیر کے مطابق خدا نے انسانوں کو ایسے شرائط کے تحت اس لئے خلق کیا ہے تا کہ انھیں

آزما سکے کہ ان میں کون نیکوکار ہے(۱)، اس کے علاوہ قرآن میں بارہا اس بات کی تاکید ہوئی ہے کہ اگر خدا چاہتا تو تمام انسانوں کو راہ ہدایت کی طرف راہنمائی کر دیتا اور ظلم وستم کو دبا دیتا(۲)۔ لیکن اس صورت میں انتخاب کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا، نیز انسانوں کے کردار قابل ارزش بھی نہ رہتے، اور اسطرح انسان کی خلقت سے غرض الٰہی (اختیار وانتخاب) میں نقص آجاتا۔

نتیجہ۔ انسانوں میں فساد وتباہ کاری اور کفر وعصیان کی طرف میلان خود ان کے ناجائز اختیارات کا نتیجہ ہے، اور خود انسانوں کی خلقت میں ایسے امور پر قدرت کا لحاظ رکھا گیا ہے لہذا ایسے اختیار کے اثرات کا حاصل ہونا بالتبع لازم ہے، اگرچہ خدا کا ارادہ یہ ہے کہ انسان اپنے کمال کو حاصل کرلے، لیکن چونکہ اس ارادہ کا تعلق مختار ہونے پر مشروط ہے لہٰذا اس صورت میں سوءِ اختیار کے نتیجہ میں انحطاط کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اور حکمت الٰہی کا تقاضا تو یہ نہیں ہے کہ تمام انسان خواہ نخواہ ہدایت یافتہ ہوجائیں اگرچہ ان کے ارادہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

....

(۱) رجوع کریں۔سورۂ ہود۔آیت/ ۷۔سورۂ ملک۔آیت/ ۲۔سورۂ مائدہ۔آیت/ ٤٨ سورۂ انعام۔آیت/ ١٦٥۔

(۲) سورۂ انعام۔آیت/ ٣٥ ١٠٧ ١٣٨ ١٢٨۔سورۂ یونس۔آیت/ ٩٩۔سورۂ ہود۔آیت/ ١١٨۔سورۂ نحل۔آیت/ ٩٣٩۔سورۂ شوریٰ۔آیت/ ٨۔سورۂ شعرائ۔آیت/ ٤۔

سورۂ بقرہ۔آیت/ ۲۵۳.

کیوں انبیاء الٰہی صنعتی اور اقتصادی امتیازات سے سرفراز نہ تھے؟

حکمت الٰہی کے تقاضوں کے پیش نظر کہ تمام انسان بہ نحو احسن اپنے حقیقی کمال کو حاصل کرلیں، کیا بہتر یہ نہ تھا، کہ خدا وحی کے ذریعہ اس جہان کے اسرار لوگوں کے لئے فاش کر دیتا، تا کہ مختلف نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے ذریعہ انسان راہ تکامل میں اپنے سفر کو سرعت بخش دیتا! جیسا کہ اس دور میں طبیعی طاقتوں کے ظہور اور مختلف اسباب کے ایجادات سے بشری تمدن نے نمایاں ترقی حاصل کی ہے، جن کی وجہ سے حفظ سلامت، امراض سے مقابلہ ارتباطات میں سرعت، جیسے مطلوب عوامل اور آثار وجود میں آ گئے، اس وضاحت کی روشنی میں آشکار ہے کہ اگر انبیاء الٰہی جدید علوم وصنائع اور آسائش کے وسائل لوگوں کے لئے فراہم کرنے کے ذریعہ اپنی اجتماعی اور سیاسی قدرت کو افزائش دے سکتے تھے اور بڑی آسانی سے اپنے اہداف تک پہنچ سکتے تھے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وحی ونبوت کے ہونے کی اصلی ضرورت ان امور میں ہے کہ جن میں بشر عادی وسائل کے ذریعہ کشف نہ کرسکے، اور اس سے جاہل ہوتے ہوئے کمال حقیقی کی طرف جانے والے راستہ کو معین نہ کرسکے، ایک دوسری تعبیر کے مطابق انبیاء علیہم السلام کا اصلی وظیفہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کو صحیح زندگی اور کمال حقیقی کے حصول میں مدد کریں، تا کہ وہ ہر

حال میں اپنے وظیفہ کو پہچان سکیں، اور مطلوب کو حاصل کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کریں، انسان، خواہ دشت میں رہنے والا ہو، یا دریاؤں کی سیر کرنے والا ہو یا کوئی بھی ہو، وہ ہرصورت میں اپنی انسانی حیثیت کو پہچان لے تا کہ معلوم ہوجائے کہ خدا کی عبادت کے وظائف کیا ہیں؟ تمام مخلوقات اور سماج میں رہنے والوں کے ساتھ رہن سہن کے واجبات کیا ہیں تا کہ انھیں انجام دینے کے ذریعہ کمال حقیقی اور سعادت ابدی تک پہنچ جائے لیکن صلاحیتوں اور صنعتی وطبیعی امکانات کا اختلاف خواہ ایک زمانہ میں ہو یا مختلف زمانوں میں، ایک ایسا امر ہے کہ جو خاص اسباب وشرائط کے تحت وجود میں آتا ہے اس کے علاوہ تکامل (کمال) حقیقی میں اس کا کوئی نقش بھی نہیں ہے، جیسا کہ آج کی علمی اور صنعتی ترقیاں دنیوی لذتوں کی افزائش کا باعث تو بنیں، لیکن لوگوں کی روحی اور معنوی تکامل میں ایک معمولی کردار بھی ادا نہ کرسکیں، بلکہ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ ان سب کا اثر بالکل برعکس رہا ہے

نتیجہ: حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان مادی نعمتوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی دنیوی زندگی کو جاری رکھ سکے، اور عقل ووحی کی راہنمائی میں کمال حقیقی اور سعادت ابدی کی جانب قدم بڑھائے، لیکن روحی اور بدنی توانائیوں میں اختلاف، نیز طبیعی اور اجتماعی شرائط میں اختلاف، اسی طرح علوم وصنائع سے فائدہ حاصل کرنے میں اختلاف ایک خاص تکوینی اسباب وشرائط کے تابع ہے، جو نظام علّی ومعلولی کے تحت وجود میں آتے ہیں یہ اختلافات انسان کی ابدی تقدیر میں کسی بھی خاص کردار سے متصف نہیں ہیں، اس لئے کہ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ ایک فرد یا ایک جماعت اپنی سادہ زندگی اور حداقل مادی ودنیوی نعمتوں سے

سرفراز ہوتے ہوئے کمال وسعادت کے عظیم درجات پر فائز ہوئے ہیں، اور اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک فرد یا جماعت ترقی یافتہ علوم صنائع اور بہترین وسائل زندگی سے سرفراز ہوتے ہوئے، غرور وتکبر اور ظلم وستم کے نتیجہ میں شقاوت ابدی میں گرفتار ہو گئے ہیں۔

البتہ انبیاء الٰہی نے اصلی وظیفہ (حقیقی اور ابدی سعادت وکمال کی طرف ہدایت) کے علاوہ لوگوں کو صحیح زندگی گذارنے کے لئے مدد کی ہے اور جہاں حکمت الٰہی نے تقاضا کیا وہاں ناشناختہ حقائق اور اسرار طبیعت سے پردہ بھی اٹھا دیا، اور اس طرح تمدن بشر کو ترقی دینے میں مدد کی، جیسا کہ ایسی مثالیں جناب داؤد اور، جناب سلیمان اور جناب ذوالقرنین علیہم السلام (۱) کے حالات میں دیکھی جا سکتی ہیں، انھوں نے سماج کو کامیاب بنانے اور امور میں حسن تدبیر کے لئے نمایاں کام انجام دئے ہیں، جب جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے سر زمین مصر پر انجام دیا (۲) ایسے خدمات جو کچھ بھی انبیاء نے پیش کئے وہ ان کے اصلی وظیفہ سے جدا تھے۔

....

(۱) رجوع کریں۔ سورۂ انبیاء آیت/ ۸۲۷۸ سورۂ کہف۔ آیت/ ۹۷۸۳. سورۂ سبائ۔ آیت/ ۱۳۱۰۔ بعض روایتوں کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ذوالقرنین نبی نہیں بلکہ ولی خدا تھے.

(۲) رجوع کریں۔ سورۂ یوسف۔ آیت/ ۵۵.

لیکن یہ سوال کہ کیوں انبیائ※ نے اپنے اہداف کو کامیاب بنانے کے لئے صنعت واقتصاد

وغیرہ کا سہارا نہیں لیا؟ تو اس سوال کے جواب میں یہ کہنا بہتر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا ہدف جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے آزاد انتخاب کے لئے وسائل کا فراہم کرنا تھا، اور اگر وہ غیر عادی طاقتوں کے بل بوتے پر قیام کرتے، تو آزادانہ تکامل اور رشد معنوی انسانوں کو حاصل نہ ہوتا، بلکہ عوام ان کی قدرتوں کے ڈر سے اطاعت کرتی، نہ الٰہی فرمان اور آزاد انتخاب کے تحت۔

اسی سلسلہ میں امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں

اگر خداوند متعال اپنے انبیا کو مبعوث کرتے وقت سیم وزر کے گنجینہ، جواہرات اور قیمتی معادن اور باغات عطا کر دیتا، ہواؤں کے پرندے اور زمین کے چرندان کے لئے مطیع بنا دیتا تو اس صورت میں جزا وسزا اور امتحان کا موقع باقی نہ رہتا۔

اور اگر اپنے انبیاء کو بے مثال قدرت، شکست ناپذیر عزت اور عظیم سلطنت عطا کرتا کہ جس کی وجہ سے لوگ ڈر کر یا طمع میں تسلیم ہوتے ہوئے، ظلم وستم اور تکبر سے دست بردار ہو جاتے تو اس صورت میں اقدار مساوی ہو جاتے، لیکن خدا کا یہ ارادہ تھا کہ پیغمبروں کی اطاعت اُن کی کتابوں کی تصدیق اور اُن کے حضور فروتنی کسی بھی عیب سے پاک ہوتے ہوئے حق کے لئے ہو، لہذا جس قدر بلا اور امتحان عظیم ہوں گے ثواب الٰہی اتنے ہی کثیر ہوں گے۔ (۱)

البتہ جب لوگ اپنے ارادہ اور رغبت سے دین حق کو قبول کر لیں اور ایک الٰہی سماج کو تشکیل دیدیں، تو پھر اہداف الٰہی کو کامیاب بنانے کے لئے مختلف قدرتوں سے استفادہ کرنا درست ہوگا، جیسا کہ ایسے نمونے حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی میں ملتے ہیں۔ (۲)

....

(۱) نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ۔ سورۂ فرقان۔ آیت/ ۱۰۷۔ سورۂ زخرف۔ آیت/ ۳۵۳۱۔
(۲) سورۂ انبیاء۔ آیت/ ۸۲۸۱۔ سورۂ نمل۔ آیت/ ۱۵۴۴.

سوالات

۱۔ کیا تمام انبیاء کسی خاص سرزمین پر مبعوث ہوئے؟ دلیل کیا ہے؟
۲۔ کیوں انبیاء کی دعوتیں تمام انسانوں تک نہ پہنچ سکیں؟
۳۔ کیوں خدا نے ایسے اسباب فراہم نہیں کئے کہ جس کی وجہ سے فساد و خون ریزی کی روک تھام ہو؟
۴۔ کیوں انبیاء نے اسرار طبیعت کو فاش نہیں کیا تا کہ اُن کے ماننے والے مادی نعمتوں سے زیادہ مستفید ہوتے؟
۵۔ کیوں انبیاء نے اپنے اہداف کو کامیاب بنانے کے لئے صنعتی اور اقتصادی قدرتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا؟

چوبیسواں درس

عصمت انبیاء(ع)

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے

وحی کے محفوظ رہنے کی ضرورت

عصمت کی دوسری اقسام

انبیاء(ع) کی عصمت

وحی کے محفوظ رہنے کی ضرورت

حس وعقل کی کمیوں کو پورا کرنے اورضروری معارف کے حصول میں مدد کرنے والے عامل یعنی اب جب کہ ہم نے وحی کی ضرورت کو سمجھ لیا ہے اس کے بعد یہ مسئلہ سامنے آتا ہے! یہ مطلب ہر ایک کو معلوم ہے کہ عادی انسان بالواسطہ وحی سے استفادہ نہیں کرسکتے اور وحی کو دریافت کرنے کی لیاقت اور استعداد سے سرفراز نہیں ہوسکتے ، بلکہ چند خاص اجزا (انبیاء الٰہی) کے ذریعہ وحی کے پیغامات کو اُن تک پہچانا ہوگا،لیکن ان پیغامات کے صحیح ہونے کی ضمانت کیا ہے، اور کہاں سے یہ معلوم ہو کہ نبی خدا نے وحی کو دریافت کرکے صحیح وسالم لوگوں کے حوالہ کیا ہے؟ اور اگر خدا اور رسول کے درمیان رابطہ ہے بھی تو کیا اس نے اپنی رسالت انجام دے دی ہے؟ اس لئے کہ وحی اُسی وقت مفید واقع ہوسکتی ہے

جب مرحلہ صدور سے مرحلہ وصول تک عمدی یا سہوی تمام خطاؤں اوراضافات سے محفوظ رہی

ہو، وگرنہ واسطوں میں سہو ونسیان کے احتمال یا ان میں عمدی تصرفات کے احتمال کے ہوتے ہوئے لوگوں تک پہنچنے والے پیغام میں نادرست اور خطا ہونے کا باب کھل جائے گا، اور اس طرح اعتماد کے اٹھ جانے کا سبب ہوگا لہذا کیسے (۱) معلوم ہوسکتا ہے کہ وحی صحیح وسالم لوگوں تک پہنچی ہے؟

یہ بات روشن ہے کہ جب وحی کی حقیقت لوگوں کے لئے مجہول ہو اور اسے دریافت کی استعداد سے وہ سرفراز نہ ہوں تو اس صورت میں واسطوں میں کافی نظارت بھی نہیں رکھ سکتے، اورصرف اسی وقت وحی میں ہونے والے تصرفات سے آزاہی ممکن ہے کہ جب عقل ومنطق کے خلاف کوئی پیغام موجود ہو، جیسے کہ کوئی یہ دعوی کرے کہ خدا نے اُس پر وحی بھیجی ہے: کہ اجتماع نقیضین جائز یا واجب ہے یا العیاذ باللہ) ذات الٰہی میں تعدد یا زوال یا ترکیب کا ہونا امکان پذیر ہے، اِن مطالب کے جھوٹے ہونے کو عقل کے ذریعہ ثابت کیا جا سکتا ہے، لیکن وحی کی اصلی ضرورت اُن مسائل میں ہے کہ جس میں عقل نفی واثبات کے قابل نہیں ہے اور اس میں اتنی استعداد نہیں ہے کہ ان پیغامات کے صحیح یا باطل ہونے کو ثابت کر سکے، لہذا ایسے موارد میں کس طرح وحی کے پیغامات میں واسطوں کے عمدی یا سہوی تصرفات سے محفوظ رہنے کو ثابت کیا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح سے عقل، حکمت الٰہی کے پیش نظر، بائیسویں درس میں بیان کئے گئے برہان کے مطابق اس امر کو بخوبی درک کرتی ہے کہ وظائف اور حقیقتوں کا پتہ لگانے کے لئے کسی دوسرے راستہ کا ہونا ضروری ہے، اگر چہ اس کی اصلی حقیقت سے وہ بے

خبر ہے اور اس طرح یہ بھی درک کرتی ہے کہ حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے پیغامات صحیح وسالم حالت میں لوگوں تک پہنچیں، وگرنہ غیر صحیح وسالم ہونے کی صورت میں نقض غرض لازم آئے گی۔

ایک دوسری تعبیر کے مطابق جب یہ معلوم ہوگیا کہ الٰہی پیغامات ایک یا چند واسطوں سے لوگوں تک پہنچتے ہیں تا کہ انسان کے اختیاری تکامل کا راستہ ہموار رہے، اور بشر کی خلقت سے خدا کا ہدف پورا ہوجائے لہذا صفات کمالیۂ الٰہی سے یہ امر بخوبی روشن ہوجاتا ہے کہ اس کی طرف سے

....

(۱) قرآن کریم اس سلسلہ میں فرماتا ہے:
(وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطلِعَكُم عَلَى الغَيبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجتَبِى مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ)
سورۂ آل عمران۔آیت/ ۱۷۹.

آنے والے تمام پیغامات عمدی یا سہوی تصرفات سے محفوظ ہیں، اس لئے کہ اگر خدا یہ ارادہ کرلے کہ اس کے پیغامات بندوں تک سالم نہ پہنچیں، تو یہ حکمت کے خلاف ہوگا، جبکہ خدا کا حکیمانہ ارادہ اِس بات کی پوری طرح نفی کرتا ہے، اور اگر خدا اپنے بے کراں علم کے ہوتے ہوئے یہ سمجھ نہ سکے، کہ وہ کس طرح اور کن واسطوں سے اپنے پیغامات کو سالم لوگوں تک پہنچائے تو یہ اس کے لامتناہی علم سے سازگار نہیں ہے، اور اگر شائستہ واسطہ پیدا نہ کرسکے اور انھیں شیاطین کے ہجوم سے محفوظ نہ رکھ سکے تو یہ امر، اس کی لامحدود قدرت سے منافات رکھتا

ہے، لہذا چونکہ خدا ہر شی کے بارے میں جانتا ہے لہٰذا خدا کے لئے یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ جسے واسطہ بنا رہا ہے، اس کی خطا کاریوں سے بے خبر ہو(۱) اور اسی طرح یہ احتمال بھی باطل ہے کہ اس نے اپنی لامحدود قدرت کے ہوتے ہوئے بھی اپنے پیغامات کو شیاطین اور عمدی یا سہوی تصرفات سے محفوظ نہ رکھ سکا(۲) جس طرح سے کہ حکمت الٰہی کے پیش نظر یہ احتمال بھی باطل ہے، کہ اس نے اپنے پیغامات کو لوگوں تک صحیح و سالم نہ پہنچانے کا ارادہ کرلیا ہے(۳)، لہٰذا خدا کا علم، اس کی قدرت و حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے پیغامات کو سالم اور تصرفات سے محفوظ لوگوں تک پہنچائے اور اس طرح وحی کا محفوظ رہنا عقلی برہان کے ذریعہ ثابت ہوجاتا ہے۔(٤)

....

(۱) قرآن اس بارے میں فرماتا ہے

اَللّٰہُ اَعلَمُ حَیثُ یَجعَلُ رِسَالَتَہُ :سورۂ انعام ۔آیت/۱۲۴

(۲) قرآن اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

(عَلِمُ الغَیبِ فَلاَ یُظهِرُ عَلٰی غَیبِہِ اَحَدًا ٭ اِلَّا مَنِ ارتَضیٰ مِن رَّسُولٍ فَاِنَّہُ یَسلُکُ مِن بَینَ یَدَیہِ وَمِن خَلفِہِ رَصَداً ٭لِّیَعلَمَ اَن قَد اَبلَغُوا رِسٰلٰتِ رَبِّہِم وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَیہِم وَاَحصیٰ کُلَّ شَيءٍ عَدَدًا) سورۂ جن۔ آیت/ ۲۸۲۶.

(۳)(لِیَہلِکَ مَن ہَلَکَ عَن بَیِّنَۃٍ وَّ یَحیٰ مَن حَیَّ عَن بَیِّنَۃٍ) سورۂ انفال ۔آیت/ ۴۲

(٤) سورۂ شعراء۔آیت/ ۱۹۳۔سورۂ تکویر۔آیت/۲۱۔سورۂ اعراف۔آیت/ ٦٨۔سورۂ شعرائ۔آیت/ ۱۰۷ ۱۲۵ ۱٤۳ ۱٦۲ ۱۷۸۔سورۂ دخاء آیت/ ۱۸ سورۂ تکویر آیت/ ۲۰

سورۂ نجم آیت/ ٥۔سورۂ حاقہ آیت/ ٤٤۔سورۂ جن آیت/ ٢٨٢٦.

عصمت کی دوسری قسمیں۔

فرشتوں اورانبیاء(ع) کی وہ عصمت جو دلیل کی بناء پر ثابت ہوتی ہے وحی کے پیغام پر منحصر ہے لیکن عصمت کی دوسری قسمیں بھی ہیں جو اس دلیل کے ذریعہ قابل اثبات نہیں ہیں، جنھیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلی قسم فرشتوں سے متعلق ہے، دوسری قسم انبیاء(ع) کی عصمت ہے اور تیسری قسم بقیہ انسانوں، جیسے ائمہ(ع)، حضرت مریم، اور حضرت زھراء کی عصمت ہے

فرشتوں کی عصمت کے سلسلہ میں ابلاغ وحی کے علاوہ دو مسئلہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔

پہلا مسئلہ ان فرشتوں کی عصمت کا ہے، جو دریافت وحی اور اُسے رسول تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں دوسرا مسئلہ ان فرشتوں کی عصمت کا ہے، جنھیں وحی سے کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ وہ کتابت اعمال، رزق پہنچانے اور قبض اوراح وغیرہ کے ذمہ دار ہیں۔

اس طرح انبیاء(ع) کی عصمت ان چیزوں کے سلسلہ میں جو ان کی رسالت سے مربوط نہیں ہے اس میں بھی دو مسئلہ ہیں، پہلا مسئلہ یہ ہے کہ انبیاء(ع) کا عمدی گناہوں اور سرپیچیوں سے محفوظ و مصؤن رہنا دوسرا مسئلہ انبیاء(ع) کا سہو و نسیان سے معصوم ہونا ہے اور انھیں دو مسئلہ کو غیر انبیاء(ع) کی عصمتوں میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

لیکن فرشتوں کی عصمت وحی کے ابلاغ کے علاوہ دوسرے مسائل میں دلیل عقلی کے ذریعہ اسی وقت قابل حل ہے کہ جب ملائکہ کی ماہیت اوران کی حقیقت معلوم ہوجائے ،لیکن ملائکہ کی ماہیت کا سمجھنا نہ ہی آسان ہےاور نہ ہی اِس کتاب کے متناسب، اِسی وجہ سےفرشتوں کی عصمت کی دلیل میں قرآن سے دوآیتوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں، خداوند عالم قرآن کے سورۂ انبیاء کی ستائیسویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے : (بَل عِبَادمکَّرَمُونَ لَا یَسبِقُونَہُ بِالقَولِ وَہُم بِاَمرِ ہِ یَعمَلُون)

بلکہ فرشتے خدا کے معزز بندے ہیں وہ گفتگو میں اس سے سبقت نہیں کرسکتے اوروہ اس کے حکم پر چلتے ہیں۔

اوراسی طرح سورۂ تحریم کی چھٹی آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

(لَا یَعصُونَ اللّٰہ مَا اَمَرَھُم وَ یَفعَلُونَ مَا یُؤمَرُونَ)

خدا جس بات کا حکم دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم انھیں ملتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔

یہ دوآیتیں پوری صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ملائکہ منتخب مخلوق ہیں، جو فرمان الٰہی کے مطابق اعمال انجام دیتے ہیں اور کبھی بھی اس کے فرمان سے روگردانی نہیں کرتے ،اگرچہ ان آیتوں کی عمومیت تمام فرشتوں کی عصمت کوشامل ہے۔

لیکن انبیاء (ع) کی عصمت کے علاوہ بقیہ انسانوں کی عصمت کے سلسلہ میں بحث کرنا مباحث امامت سے سازگار ہے اسی وجہ سے اس حصہ میں انبیاء (ع) کی عصمت کے تحت

بحث کریں گے اگر چہ اُن میں سے بعض مسائل کو تنہا نقلی اور تعبدی مسائل کے ذریعہ حل کیا جا سکتا ہے اور اصولی اعتبار سے اسے کتاب وسنت کی حجیت ثابت ہونے کے بعد ذکر ہونا چاہیئے، لیکن موضوعات کی مناسبت سے اِسی مقام پر اس کے سلسلہ میں بحث کریں گے اور کتاب وسنت کی حجیت کی بحث کو اصل موضوع کے عنوان سے قبول کرتے ہوئے اُسے اِسی مقام پر ذکر کرتے ہیں۔

انبیاء (ع) کی عصمت۔

گروہ مسلمین میں اس مسئلہ کے تحت شدید اختلافات ہے کہ انبیاء (ع) گناہوں کے مقابلہ میں کس حد تک معصوم ہیں، اثنا عشری شیعوں کا عقیدہ ہے کہ انبیاء (ع) اپنے آغاز ولادت سے آخری لمحہ حیات تک تمام گناہوں سے پاک ہوتے ہیں، بلکہ بھولے سے بھی کوئی گناہ نہیں کرتے لیکن اہل سنت کی بعض جماعتوں نے عصمت انبیاء (ع) کو گناہان کبیرہ کے مقابلہ میں مانا ہے، بعض نے دوران بلوغ سے، اور بعض نے کہا کہ بعثت کے بعد سے معصوم ہوتے ہیں، بلکہ اہل سنت کے بعض فرقوں (حشویہ اور اہل حدیث) کے اعتقاد کے مطابق) انبیاء (ع) ہر قسم کی عصمت سے عاری ہیں، ان سے گناہان کبیرہ صادر ہوسکتا ہے بلکہ وہ نبی ہوتے ہوئے بھی عمداً گناہ کر سکتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی عصمت کو ثابت کرنے سے پہلے ہمیں چند نکات کی طرف اشارہ کرنا لازم ہے پہلا نکتہ یہ ہے کہ انبیاء (ع) اور غیر انبیاء میں سے بقیہ انسانوں کے معصوم ہونے کا

مطلب صرف گناہوں سے معصوم ہونا نہیں ہے بلکہ اس بات کا امکان ہے کہ ایک معمولی انسان خصوصاً کم عمر ہونے کی وجہ سے کوئی گناہ انجام نہ دے۔

بلکہ مطلب یہ ہے کہ نہایت طاقتور ملکہ نفسانی کے مالک ہیں، کہ جو سخت سے سخت شرائط و حالات میں اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں اور یہ ملکہ گناہوں کی آلودگیوں سے آگاہی، شکست ناپذیر ارادہ، اور نفسانی خواہشوں کو مہار کرنے کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے، اور چونکہ یہ ملکہ عنایت الٰہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے لہٰذا اس کی فاعلیت کو خدا کی جانب نسبت دی جاتی ہے، وگرنہ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ خدا معصوم انسان (انبیاء وآئمہ) کو زبردستی گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے

یا اس سے اختیار کو چھین لیتا ہے ان لوگوں کی عصمت جو منصب الٰہی، جیسے نبوت وامامت سے متصف ہیں مراد یہ ہے، کہ خدا نے گناہوں سے محفوظ رہنے کی ضمانت انھیں دے دی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کسی بھی شخص کی عصمت کا لازمہ یہ ہے کہ وہ تمام حرام اعمال کو ترک کردے، جیسے کہ وہ گناہ جو تمام شریعتوں میں حرام ہیں، یا وہ امور جو خود اسی کے زمانہ کی شریعت میں حرام ہوں، لہٰذا انبیاء (ع) کی عصمت ان اعمال کے ذریعہ خدشہ دار نہیں ہوتی جو اس کی شریعت یا خود اس کے لئے جائز ہوں یا وہی عمل گذشتہ شریعت میں حرام ہو یا بعد میں حرام کردیا جائے۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ گناہ سے مراد یہ ہے، کہ جس سے ایک معصوم محفوظ رہتا ہے ایک ایسا عمل ہے کہ جسے فقہ میں حرام کہا جاتا ہے اور اسی طرح اس عمل کو ترک کرنا کہ جسے فقہ میں واجب کہا

جاتا ہے۔

لیکن گناہ کے علاوہ دوسرے کلمات جیسے (عصیان) (ذنب) وغیرہ وسیع معنی میں استعمال ہوتے ہیں کہ جس میں ترک اولیٰ بھی شامل ہے اور ایسے گناہوں کا انجام دینا عصمت کے خلاف نہیں ہے۔

سوالات

١۔کس طرح وحی کو کسی بھی قسم کے خلل سے محفوظ رہنے کو ثابت کیا جاسکتا ہے؟

٢۔دریافتِ وحی اور ابلاغ میں محفوظ رہنے کے علاوہ کن مقامات پر عصمت ضروری ہے؟

٣۔فرشتوں کی عصمت کیسے ثابت کی جاسکتی ہے؟

٤۔انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے سلسلہ میں کتنے اقوال ہیں؟ اور اہل تشیع کا نظریہ کیا ہے؟

٥۔عصمت کی تعریف کریں اور اس کے لوازمات بیان کریں؟

پچیسواں درس

انبیاء(ع) کے معصوم ہونے کی دلیلیں

مقدمہ

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے

عصمت انبیاء(ع) پر عقلی دلائل

عصمت انبیاء(ع) پر نقلی دلائل

عصمت انبیاء(ع) کا راز

مقدمہ

شیعوں کے معروف اور قطعی عقائد میں سے انبیاء(ع) کا عمدی اور سہوی گناہوں سے معصوم ہونے کا عقیدہ ہے جس کی ائمہ علیہم السلام نے اپنے پیروکاروں کو تعلیم دی ہے اور اپنے مختلف بیانات کے ذریعہ دشمنوں کے اقوال کو باطل قرار دیا ہے ائمہ علیہم السلام کا عصمت انبیاء(ع) کے سلسلہ میں اپنے دشمنوں سے احتجاجات میں سے سب سے زیادہ مشہور امام رضا علیہ السلام کا احتجاج ہے جو کتب حدیث اور تاریخ میں درج ہے۔

لیکن مباح امور میں انبیاء علیہم السلام کا سہو ونسیان باعث اختلاف رہا ہے اور ائمہ علیہم السلام کی جانب سے وارد ہونے والی روایات، اختلاف سے خالی نہیں ہیں، جس کے سلسلہ میں تحقیق وجستجو اِس بحث کی وسعت سے خارج ہے، لیکن اتنا مسلم ہے کہ اِسے ضروری اعتقادات میں سے شمار نہیں کیا جا سکتا، اور وہ دلائل جو انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے تحت

بیان کئے گئے ہیں دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔

۱۔ عقلی دلائل۔
۲۔ نقلی دلائل۔

اگر چہ اس بحث میں زیادہ تر اعتماد نقلی دلائل پر کیا گیا ہے، ہم یہاں دو دلیلوں کے بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور اس کے بعد کچھ قرآنی دلائل کو ذکر کریں گے۔

عصمت انبیاء (ع) پر عقلی دلائل۔

انبیاء علیہم السلام کا گناہوں کے ارتکاب سے معصوم رہنے پر پہلی عقلی دلیل یہ ہے کہ ان کی بعثت کا پہلا ہدف انسانوں کو اُن حقائق اور وظائف کی طرف ہدایت کرنا ہے جسے خدا نے انسانوں کے لئے معین فرمایا ہے، درحقیقت یہ لوگ انسانوں کے درمیان خدا کے نمائندے ہیں، کہ جنھیں لوگوں کو راہ راست کی طرف ہدایت کرنا ہے، لہذا اگر ایسے نمائندے دستورات خدا کے پابند نہ ہوں اور اپنی رسالت کے برخلاف اعمال کے مرتکب ہوں تو لوگ اُن کے اعمال کو اُن کی گفتار سے جدا کہیں گے اور اِس طرح لوگوں کا اعتماد اُن کی گفتار پر ختم ہوجائے گا اور یوں اُن کی بعثت کا ہدف مکمل نہ ہوسکے گا، لہذا حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ انبیاء (ع) پاک اور تمام گناہوں سے دور ہوں بلکہ سہو ونسیان کی بنیاد پر کوئی ناشائستہ عمل بھی

انجام نہ دیں، تا کہ لوگوں کو یہ گمان ہونے لگے کہ انھوں نے سہو ونسیان کو گناہوں کے ارتکاب کے لئے بہانہ بنالیا ہے۔

عصمت انبیاء علیہم السلام پر دوسری عقلی دلیل یہ ہے کہ وہ وحی کو لوگوں تک پہنچانے اور انھیں راہ مستقیم کی طرف ہدایت کرنے کے علاوہ ان پر لوگوں کی تربیت اور تزکیہ کی بھب ذمہ داری ہے تا کہ وہ مستعد افراد کو کمال کے آخری منازل تک لے جائیں یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق تعلیم اور ہدایت کے وظیفہ کے علاوہ وظیفہ تربیت کے بھی ذمہ دار ہیں، اور وہ بھی ایسی تربیت جو سماج کے برجستہ اور عاقل حضرات کو بھی شامل ہوتی ہے۔

لہٰذا ایسے مقامات انھیں لوگوں کے لئے شائستہ ہیں کہ جو انسانی کمالات کے اعلیٰ مقامات پر فائز ہوں اور ملکہ نفسانی (ملکہ عصمت) کے عظیم درجہ پر فائز ہو۔

اس کے علاوہ مربی کا کردار افراد کی تربیت کرنے میں، اُس کی گفتار سے کہیں زیادہ موثر ہوتا ہے اور وہ افراد جو کردار کے اعتبار سے عیوب اور نقائص کے حامل ہوتے ہیں ان کی گفتار بھی مطلوب تاثیر سے برخوردار نہیں ہوسکتی، لہٰذا انبیاء علیہم السلام کی بعثت اس عنوان کے تحت کہ وہ سماج کے مربی ہیں اسی صورت میں قابل تحقق ہے کہ جب ان کا کردار اور ان کی گفتار ہر قسم کی خطا سے محفوظ ہو۔

عصمت انبیاء (ع) پر نقلی دلائل۔

۱۔قرآن کریم بعض انسانوں کو مخلص (۱) (جنھیں خدا کے لئے خالص کردیا گیا ہو) کے نام

سے یاد کرتا ہے یہاں تک کہ ابلیس بھی انھیں گمراہ کرنے کی طمع نہیں رکھتا جیسا کہ قرآن نے اُس کے قول کو نقل کیا ہے کہ وہ تمام انسانوں کو گمراہ کرے گا لیکن مخلصین اُس کی دسترس سے خارج ہیں۔ سورہ ص کی آیت نمبر (۸۳۸۲) میں ہے:

(قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۔ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ)

وہ بولا تیری ہی عزت وجلال کی قسم ان میں سے تیرے خالص بندوں کے سوا سب کو گمراہ کروں گا۔

اور بے شک ابلیس کا انھیں گمراہ نہ کرنے کی طمع اُس عصمت کی وجہ سے ہے جو انھیں گناہوں سے مقابلہ میں حاصل ہے، وگرنہ وہ تو اُن کا بھی دشمن ہے اگر اُسے موقع مل جائے تو اُنھیں بھی گمراہ کئے بغیر نہ چھوڑے۔

....

(۱) اس بات کی طرف توجہ ہے کہ مخلَص لام کے فتحہ کے ساتھ، مخلِص لام کے کسرہ کے ساتھ جدا ہے، مخلَص لام کے فتحہ کے ساتھ کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے شخص کو خالص بنادیا ہو ،اور مخلِص لام کے کسرہ کے ساتھ اس کا مطلب یہ ہے کہ شخص نے اپنے اعمال اخلاص کے ساتھ انجام دئے ہوں۔

لہٰذا عنوان (مخلَص) عنوان (معصوم) کے مساوی ہے، اگرچہ ہمارے پاس اس صفت کا انبیاء (ع) سے مخصوص ہونے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ صفت انبیاء (ع) کو بھی حاصل ہے جیسا کہ خود قرآن نے بعض انبیاء (ع) کو مخلصین میں

سے شمار کیا ہے سورۂ ص کی آیت (٤٥،٤٦) میں فرماتا ہے:

(وَاذکُر عِبٰدِنَا اِبرَاھِیمَ وَاِسحَاقَ وَیَعقُوبَ اُولِی الاَیدِ وَالاَبصَارِ ٭ اِنَّا اَخلَصنَا ھُم بِخَالِصَۃٍ ذِکرَیٰ الدَّارِ)

اے رسول! ہمارے بندوں میں ابراہیم اسحاق اور یعقوب (ع) کو یاد کرو جو قوت وبصیرت والے تھے ہم نے ان کو ایک خاص صفت کی یاد سے ممتاز کیا تھا۔

اور سورۂ مریم کی (٥١) آیت میں فرماتا ہے:

(وَاذکُر فِی الکِتَابِ مُوسیٰ اِنَّہُ کَانَ مُخلَصاً وَ کَانَ رَسُولاً نَّبِیاً)

اے رسول! قرآن میں موسیٰ کا تذکرہ کرو اس میں شک نہیں کہ وہ میرا برگزیدہ اور بھیجا ہوا صاحب شریعت نبی تھا۔

اس کے علاوہ قرآن نے یوسف علیہ السلام کا سخت ترین لحظات میں محفوظ رہنے کو اُن کے مخلص ہونے سے نسبت دے رہا ہے جیسا کہ سورۂ یوسف کی آیت (٢٤) میں فرماتا ہے:

(کَذَالِکَ لِنَصرِفَ عَنہُ السُّوءَ وَالفَحشَاءَ اِنَّہُ مِن عِبَادِنَا المُخلَصِینَ)

ہم نے اُس کو یوں بچایا تا کہ ہم اس سے برُائی اور بدکاری کو دور رکھیں بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔

٢۔قرآن انبیاء (ع) کی اطاعت کو مطلق قرار دے رہا ہے جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت (٦٤) میں فرماتا ہے:

(وَمَا اَرسَلنَا مِن رَّسُولٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذنِ اللّٰہِ)

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس واسطے کہ خدا کے حکم سے لوگ اس کی اطاعت کریں۔

اوران لوگوں کی مطلق اطاعت اُسی صورت میں صحیح ہے کہ جب ان کی اطاعت اطاعت خدا ہو، اوران کی پیروی کرنا اطاعت خدا کے خلاف نہ ہو وگرنہ ایک طرف خدا کی اطاعت کا حکم اور دوسری طرف اُن لوگوں کی اطاعت کا حکم جو خطاؤں سے محفوظ نہیں ہیں غرض کے خلاف ہوگا۔

۳۔قرآن نے الٰہی منصبوں کوانھیں لوگوں سے مخصوص جانا ہے، کہ جن کے ہاتھ ظلم سے آلودہ نہ ہوں، جیسا کہ قرآن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں فرماتا ہے، کہ جب انھوں نے منصب امامت کی اپنی اولاد کے لئے درخواست کی (لَا یَنَالُ عَہدِ الظَّالِمِینَ)(۱)

فرمایاہاں! مگر میرے اس عہد پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہوسکتا۔

اورہمیں بخوبی معلوم ہے کہ ہر گناہ نفس پر ایک ظلم ہے اورقرآن کی زبان میں ہر گنہگار ظالم ہے، پس انبیاء الٰہی جو منصب الٰہی کے ذمہ دار ہوتے ہیں، ہرقسم کے گناہ اور ظلم سے پاک ہوتے ہیں۔

عصمت انبیاء (ع) کا راز۔

اس درس کے اختتام پر بہتر ہے کہ ہم انبیاء (ع) کے معصوم ہونے کے اسرار کی طرف ایک مختصراشارہ کردیں، لہذاانبیاءعلیہم السلام کا وحی کوحاصل کرنے میں معصوم ہونے کا راز یہ ہے کہ اصولاً وحی کو درک کرنا خطا بردارادراکات سے ممکن نہیں ہے اور جو بھی اسے حاصل کر لینے کی صلاحیت سے سرفراز ہو، وہ ایک ایسے علم کی حقیقت کا مالک ہے جسے وہ اپنے سامنے حاضر

پاتا ہے، اور وحی سے اس کا رابطہ ہوتا ہے،خواہ وہ وحی لانے والا فرشتہ ہو یا کوئی اور ہو بخوبی اُسے مشاہدہ کرتا ہے(۲)اور اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ وحی حاصل کرنے والا شک میں مبتلا ہو جائے کہ اس پر وحی ہوئی ہے یا نہیں؟ یا کس نے اس پر نازل کی ہے؟ یا وحی کے مطالب کیا ہیں؟اور اگر بعض من گھڑت

....

(۱)سورۂ بقرہ۔آیت ۱۲۴.

(۲)قرآن اس سلسلہ میں فرماتا ہے:(مَا کَذَبَ الفُؤَادُ مَا رَأیٰ)سورۂ نجم۔آیت ۱۱

تو جو کچھ انہوں نے دیکھا ان کے دل نے جھوٹ نہ جانا۔

داستانوں میں آیا ہے کہ مثلاً کسی نبی نے اپنی نبوت میں شک کیا، یا وحی کے مطلب کو بھلا دیا ، یا وحی نازل کرنے والے کو پہچان نہ سکا، یہ سب کچھ صاف بہتان ہے اور ایسے بہتان بالکل اسی طرح ہیں کہ کوئی اپنے وجود یا کسی حضوری اور وجدانی امر کے تحت شک کرے!!

لیکن انجام وظائف (لوگوں تک پیغام الٰہی کے پہچانے) میں انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے راز کو بیان کرنے کے لئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کے اختیاری افعال اس صورت میں انجام پاتے ہیں، کہ جب انسانوں کے باطن میں اُس کے انجام دینے میں رجحان ہو، جو مختلف اسباب وعوامل کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور ایک شخص علم اور مختلف ادراکات کے ذریعہ مطلب تک پہنچنے والے راستہ کو معین کرتا ہے۔

اور اِسی کے مطابق امور کو انجام دیتا ہے لیکن جب اس میں متضاد رجحان ہوں تو اس صورت

میں وہ بہترین کو انتخاب کرنے کی کوشش میں رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی علوم کی کمزوری بہترین کو معین کرنے میں خطا سے دوچار ہونے کا سبب بن جاتی ہے یا بہترین سے غفلت یا پست ترین شی سے انس اشتباہ کا سبب بن جاتا ہے صحیح فکر اور صحیح انتخاب کا موقع نہیں مل پاتا۔

لہذا انسان جس قدر حقائق سے آشنا ہو، اور حقائق کے تحت زیادہ سے زیادہ توجہ سے سرفراز ہو، نیز اس کے علاوہ باطنی ہیجانات اور ہنگاموں کو مہار کرنے میں عظیم قدرت سے سرفراز ہو تو وہ اتنا ہی حسن انتخاب میں کامیاب ہوگا، اور خطاؤں سے اُسی اندازے کے مطابق محفوظ رہے گا۔

یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو مستعد، وراستہ، عقل وبینش سے سرفراز ہونے کے علاوہ صحیح تربیت میں پلے، بڑھے ہیں وہ فضیلت وکمال کے درجات حاصل کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ اس راہ میں مرتبہ عصمت تک بھی پہنچ جاتے ہیں، اور ان کے ذہنوں میں گناہ کا خیال تک نہیں آتا، جیسا کہ کوئی بھی عاقل شخص اپنے ذہن میں زہر کو پینے یا غلاظتوں کے کھانے کی فکر کو نہیں لاتا، اسی طرح یہ لوگ بھی گناہوں کے ارتکاب کی فکر اپنے ذہن میں نہیں لاتے۔

اب اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ایک شخص کی استعداد حقائق کو سمجھنے میں بے نہایت اور روح کی طہارت و پاکیزگی کے اعتبار سے عظیم مقامات پر فائز ہے اور قرآن کی تعبیر کے مطابق وہ روغن زیتون کی طرح زلال نیز خالص اور شعلہ ور ہونے کے نزدیک ہو بغیر اس کے کہ وہ کسی شعلہ سے ارتباط برقرار کرے (یکاد زیتہا یضیئ ولولم تمسہ نار) اور اُسی قوی استعداد اور روح کی پاکیزگی کی وجہ سے خدا کی تربیت میں پروان چڑھے اور خدا اس کی روح القدس کے

ذریعہ مدد کرے، ایسا شخص غیر قابل وصف کمالات کے مدارج کو طے کرتا ہے بلکہ ہزاروں سال طولانی راستہ کوایک شب میں طے کر لیتا ہے، دوران طفولیت بلکہ شکم مادر میں، ہر ایک پر، اُسے برتری حاصل ہوگی، ایسے شخص کی نگاہ میں گناہوں کی حقیقت اسی طرح آشکار ہے جس طرح دوسروں کے لئے زہر پینے اور غلاظتوں کو کھانے کی حقیقت۔

اور جس طرح عادی و معمولی افراد کا ایسے کاموں سے پرہیز جبری نہیں ہے اسی طرح معصوم کا گناہوں سے بچنا کسی بھی صورت میں ان کے اختیار کے خلاف نہ ہوگا۔

سوالات

۱۔انبیاء علیہم السلام کی عصمت کو عقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کریں؟
۲۔قرآن کی کون سی آیات انبیاء(ع) کی عصمت پر دلالت کرتی ہیں؟
۳۔وحی کو بیان کرنے میں انبیاء(ع) کے معصوم ہونے کا راز کیا ہے؟
٤۔انبیاء(ع) کا گناہوں سے بچنا کیسے ان کے اختیار سے سازگار ہے؟

چھبیسواں درس

چند شبہات کا حل

معصوم جزاء کا کیونکر مستحق ہے؟

کیوں معصومین گناہ کا اقرار کرتے تھے؟

شیطان کا انبیاء (ع) کے اعمال میں تصرف کرنا ان کے معصوم ہونے کے ساتھ کیسے سازگار ہے؟

حضرت آدم کی طرف نسیان اور عصیان کی نسبت۔

بعض انبیاء (ع) کی طرف جھوٹ کی نسبت۔

حضرت موسیٰ کے ذریعہ قبطی کا قتل۔

رسول اکرم کو اپنی رسالت میں شک کرنے سے نہی۔

چند شبہات کا حل۔

انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے سلسلہ میں چند شبہات پیش کئے گئے ہیں کہ جن کے جوابات ہم اسی درس میں بیان کریں گے۔

پہلا شبہ یہ ہے

کہ اگر خدا نے انبیاء علیہم السلام کو گناہوں کے ارتکاب سے روک رکھا ہے جس کا لازمہ

وظائف کو انجام دینا بھی ہے تو پھر اس صورت میں انبیاء علیہم السلام کے لئے اختیاری امتیاز باقی نہیں رہتا، اور گناہوں سے بچنے کی جزا اور وظائف کو انجام دینے کی صورت میں کسی بھی پاداش کے مستحق نہیں رہ جاتے، اس لئے کہ اگر خدا انبیاء کے علاوہ کسی اور کو معصوم قرار دیتا تو وہ بھی انھیں کی طرح ہوتے۔

اسی شبہ کا جواب

گذشتہ بیانات کی روشنی میں آشکار ہے جس کا ملازمہ یہ ہے کہ معصوم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وظائف کو انجام دینے کے لئے اور گناہوں سے پرہیز کرنے کے لئے ان پر جبر کیا گیا ہو جیسا کہ گذشتہ درس میں یہ مطلب روشن ہو چکا ہے، اور خدا کا انھیں معصوم رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے اختیاری افعال کی نسبت چھین لی جائے اگر چہ تمام موجودات نہایتاً خدا کے ارادۂ تکوینی کے دائرے میں ہیں، چنانچہ جب خدا کی جانب سے کوئی خاص وضاحت ہو تو امور کو اس کی طرف نسبت دینا ایک جدا صورت ہے، لیکن خدا کا ارادہ، ارادہ انسان کے طول میں ہے نہ کہ اُس کے عرض میں (یعنی انسان کا ارادہ وہی خدا کا ارادہ ہے نہ یہ کہ خدا کا ارادہ اور انسان کا ارادہ دو مستقل امر ہوں) اور نہ ہی انسان کا رادہ خدا کے ارادہ کا جانشین ہے۔

اور معصومین کی یہ نسبت خدا کی خاص عنایت ہے تو جس طرح خاص اسباب وشرائط سنگین ذمہ داریوں کا سبب بنتے ہیں، اسی طرح یہ خاص توجہ بھی سنگین ذمہ داریوں کا سبب ہے، جس طرح وظائف کو انجام دینے کی جزا زیادہ ہوگی اسی طرح اس کی مخالفت کی سزا بھی زیادہ

ہوگی، اسی طرح جزا وسزا کے درمیان اعتدال برقرار ہوجاتا ہے، اگرچہ ایک معصوم کبھی بھی اپنے اختیار سے کسی سزا کا مستحق نہیں ہوسکتا اور ایسے اعتدال کی مثالیں اُن تمام لوگوں میں دیکھی جاسکتی ہیں کہ جو خاص نعمتوں سے سرفراز ہیں جیسا کہ علماء اور خاندان رسالت (۱) سے وابستہ حضرات کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں لہٰذا جزا یا سزا بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی (۲) اسی وجہ سے جو جتنا بلند ہوتا ہے اس کے سقوط کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔

دوسرا شبہ یہ ہے

کہ معصومین اور انبیاء علیہم السلام کی طرف سے جو دعاؤں میں وارد ہوئے ہیں ان میں ان حضرات نے اپنے آپ کو گنہگار کہا ہے اور اپنے گناہوں سے استغفار کرتے تھے پس ایسے اعترافات کے ہوتے ہوئے کیسے ان کے معصوم ہونے کو تسلیم کیا جاسکتا ہے؟

....

(۱) قرآن کریم اس سلسلہ میں فرماتا ہے:

(یَا نِسَاءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ)

سورۂ احزاب۔آیت/ ۳۲۳۰.

(۲) جیسا کہ روایت میں وارد ہوا ہے

یَغفَرُ لِلجَاھِلِ سَبعُونَ ذَنباً قَبلَ اَن یُغفَرَ لِلعالِمِ ذَنب وَاحِد.

اس شبہ کا جواب یہ ہے

کہ حضرات معصومین علیہم السلام جو درجات کے اختلاف کے ساتھ کمال وقرب کے عظیم مقامات پر فائز تھے اپنے لئے دوسروں کے وظائف سے کہیں عظیم وظائف کے قائل تھے بلکہ معبود کے علاوہ کسی غیر کی طرف معمولی توجہ کو بھی عظیم گناہ شمار کرتے تھے اسی وجہ سے ہمیشہ استغفار کیا کرتے تھے اور جیسا کہ یہاں ذکر کیا جاچکا ہے کہ انبیاء (ع) کی عصمت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حضرات ان امور کے ارتکاب سے محفوظ ہیں جنھیں گناہ کا نام دیا جاتا ہے بلکہ ان کے معصوم ہونے کا مطلب واجبی تکالیف کی مخالفت اور محرمات فقہی کے مرتکب ہونے سے محفوظ رہنے کا نام ہے۔

تیسرا شبہ یہ ہے

کہ انبیاء (ع) کی عصمت پر قرآنی دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ وہ مخلصین میں سے ہیں اور شیطان کو انھیں گمراہ کرنے کی بھی کوئی طمع نہیں ہے، حالانکہ خود قرآن سے بعض مقامات پر انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں شیطان کی طرف سے کئے گئے تصرفات کو بیان کیا گیا ہے:

(یَابَنِی آدَمَ لَا یَفتِنَنَّکُمُ الشَّیطَانُ کَمَا اَخرَجَ اَبَوَیکُم مِنَ الجَنَّةِ) (۱)

اس آیت میں شیطان کا آدم وحوا علیہما السلام کو دھوکا دینا اور ان کا بہشت سے نکل جانے کو قرآن شیطان کی طرف نسبت دے رہا ہے، اور سورۂ ص کی آیت (۴۱) میں جناب ایوب

علیہ السلام کی زبانی نقل فرماتا ہے:

(اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ)

جب ایوب علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے فریاد کی کہ مجھے شیطان نے بہت تکلیف و اذیت پہنچا رکھی ہے۔

اس کے علاوہ سورۂ حج کی آیت (۵۲) میں شیطان کی طرف انبیاء علیہم السلام پر القائات کو ثابت کرتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

(وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِىْۤ اُمْنِيَّتِهٖ)

....

(۱) سورہ اعراف۔آیت/ ۲۷

اور اے رسول ہم نے تو آپ سے پہلے جب کبھی کوئی رسول اور نبی بھیجا تو یہ ہوا، جس وقت اس نے تبلیغ دین کی آرزو کی تو شیطان نے ان کی آرزو میں خلل ڈالا، اور لوگوں کو گمراہ کیا۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے

کہ ان تمام آیات میں شیطان کے تصرف کے نتیجہ میں انبیاء (ع) کا واجبی تکالیف سے مخالفت کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے اور سورۂ اعراف کی (۲۷) آیت میں شجرہ منہیہ کے سلسلہ میں جس وسوسہ کی طرف اشارہ ہوا ہے، اس میں اس درخت سے نہ کھانے کی کوئی تحریم نہیں تھی، بلکہ جناب آدم وحوا سے اتنا کہہ دیا گیا تھا کہ اگر اس درخت سے، کھاؤ گے تو جنت

سے نکال کر زمین کی طرف بھیج دئے جاؤ گے، اور شیطانی وسوسہ اس امر سے مخالفت کا سبب بنا، اس کے علاوہ وہ جس عالم میں تھے وہ عام تکلیف (ارشادی) تھی وہاں کوئی شریعت نہیں تھی کہ جس کے وہ پابند ہوتے، اور سورۂ ص کی (٤١) آیت میں ان مصیبتوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو شیطان کی وجہ سے جناب ایوب پر نازل ہوئی تھیں، اور آپ کے متعلق کسی بھی امر کے مخالفت کی طرف کوئی معمولی اشارہ بھی نہیں ہے، اور سورۂ حج کی (٥٢) آیت میں ان رکاوٹوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو انبیاء علیہم السلام کے اہداف میں شیطان ایجاد کرتا تھا، اور ان کی تکلیف کا باعث بنتا تھا، یہاں تک کہ خدا اس کے مکر کو باطل کر دیتا ہے اور اپنے دین کو قائم کر دیتا ہے۔

چوتھا شبہ یہ ہے

کہ قرآن کے سورۂ طہٰ کی (١٢١) آیت میں نسبت عصیان اور اسی طرح اسی سورۂ کی آیت (١١٥) میں نسیان کی نسبت جناب آدم کی طرف دی جا رہی ہے، لہٰذا ایسی نسبتیں ان کی عصمت سے کیسے سازگار رہیں؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے

کہ گذشتہ بیان سے واضح ہے کہ یہ عصیان اور نسیان واجبی تکالیف میں سے نہیں تھے کہ گناہ

حساب کئے جائے۔

پانچواں شبہ یہ ہے

کہ قرآن کے بعض مقامات پر جھوٹ کی نسبت انبیاء علیہم السلام کی طرف دی گئی ہے جیسا کہ سورۂ صافات کی آیت (۸۹) میں جناب ابراہیم علیہ السلام کی زبانی فرماتا ہے: (فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْم) انھوں نے کہا کہ میں بیمار ہوں۔

حالانکہ جب جناب ابراہیم نے یہ جملہ کہا مریض نہ تھے اور اسی طرح آپ ہی کی زبانی سورۂ انبیاء کی آیت (٦٣) میں فرماتا ہے:

(قَالَ بَل فَعَلَهُ كَبِيرُهُم)

بلکہ ان بتوں کو اُن کے بڑے خدا نے توڑا ہے۔

حالانکہ خود جناب ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو منہدم کیا تھا، اور اسی طرح سورۂ یوسف کی آیت (۷۰) میں فرماتا ہے:

(ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّن اَیَّتُهَا العِیرُ اِنَّکُم لَسَارِقُونَ)

پھر ایک منادی للکار کے بولا کہ اے قافلہ والو یقیناً تم ہی لوگ چور ہو۔

ان شبہات کا جواب یہ ہے

کہ بعض روایتوں کے مطابق یہ سب توریہ سے ہے اہم ترین مصلحتوں کے لئے بولا جاتا ہے

اوراس مطلب کوخود قرآن کی آیتوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ جناب یوسف کی داستان میں فرماتا ہے:

(کذلك کدنا لیوسف)

بہرحال ایسے جھوٹ عصیان اور گناہ حساب نہیں کئے جاتے۔

چھٹا شبہ یہ ہے

کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان میں آیا ہے کہ جناب موسیٰ نے اُس قبطی کو مار ڈالا جو ایک بنی اسرائیل کے ساتھ جھگڑ رہا تھا، اسی وجہ سے آپ مصر سے فرار کر گئے ،اور جب خدا نے آپ کوفرعون کی جانب مبعوث کیاتو آپ نے بارگاہ خدا میں عرض کی:

(وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنبٌ فَأَخَافُ أَن یَّقْتُلُون)(۱)

اس کےعلاوہ ان کے لئے میری گردن پر ایک جرم ہے مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے قصاصاً قتل نہ کردیں۔

....

(۱) سورۂ شعرائ۔آیت/ ۱٤

اورجب فرعون نے اس قتل کی نسبت آپ کی طرف دی تو فرمایا:

(قَالَ فَعَلْتُهَا إِذًا وَّ أَنَا مِنَ الضَّالِینَ)(۱)

ہاں میں نے اس کام کوانجام دیا جب میں حالت غفلت میں تھا۔

یہ داستان کس طرح انبیاء علیہم السلام کی عصمت بلکہ بعثت سے پہلے معصوم ہونے سے سازگار

ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ

ہے کہ قبطی کا قتل عمدی نہیں تھا بلکہ ایک مشتی کی وجہ سے تھا کہ جسے صرف دور کرنے کے لئے مارا تھا، اس کے علاوہ

(ولهم عَلَّ ذَنب)

کا جملہ فرعونیوں کے گمان کے مطابق ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھے گنہگار سمجھتے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھے قصاص میں قتل نہ کر ڈالیں اور

(وانا من الضّالین)

کا جملہ فرعون سے ہم کلامی کے دوران کہا ہے کہ میں اس بعثت سے پہلے ایسے براہین سے بے خبر تھا اور اب دلیل قاطع کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں یا ضلال کا مطلب یہ ہے، کہ میں اس عمل کے انجام سے بے خبر تھا، بہر حال کسی بھی صورت میں جناب موسیٰ کا واجبی تکالیف سے مخالفت، ان جملوں سے ثابت نہیں ہوتی۔

ساتواں شبہ یہ ہے

کہ سورۂ یونس کی آیت (۹٤) میں خدا اپنے رسول کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: (فَاِن کُنتَ فِی شَکٍّ مِّمَّا اَنزَلنَا اِلَیکَ فَسئَلِ الَّذِینَ یَقرَءُونَ الکِتَابَ مِن قَبلِکَ لَقَد جَائَکَ الحَق

مِن رَبِّکَ فلَاَ تکُونَنَّ مِنَ الُمُمتَرِ ینَ)

پس جو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اگر اس کے بارے میں تم کو کچھ شک ہو تو جو لوگ تم سے پہلے کتاب خدا پڑھا کرتے ہیں ان سے پوچھ کر دیکھو تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے کتاب آچکی ہے تم ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔

اسی طرح سورۂ بقرہ کی آیت (۱٤۷)،سورۂ آل عمران کی آیت (٦۰) سورۂ انعام کی آیت /۱۱٤،سورۂ ہود کی آیت (۱۷) اور سورۂ سجدہ کی آیت (۲۳) میں آنحضرت کو شک و تردید سے منع فرماتا ہے،پس کس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ وحی کو درک کرنا غیر قابل شک ہے۔

....

(۱) سورۂ شعراء آیت ۲۰.

اس شبہ کا جواب یہ ہے

کہ یہ آیات اس بات پر دلالت نہیں کرتیں کہ آپ نے کوئی شک کیا ہو بلکہ صرف اس مطلب کو بیان کرتی ہیں کہ آنحضرت کی رسالت اور قرآن کریم کی حقانیت میں کوئی شک و تردید نہیں ہے،دراصل ایسے بیانات ایاک اُعنی واسعَیِ یا جارۃ میں سے ہے۔

آٹھواں شبہ یہ ہے

کہ قرآن میں آنحضرت کی طرف بعض گناہوں کی نسبت دی گئی ہے جنھیں خدا نے بخش دیا جیسا کہ فرماتا ہے:

(لِّيَغفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ)(۱)
تا کہ خدا تمہاری اُمت کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کردے

اس شبہ کا جواب یہ ہے

کہ ان آیتوں میں (ذنب) سے مراد وہ گناہ ہیں جنھیں مکہ کے مشرکین ہجرت سے پہلے اور اس کے بعد قائل تھے کہ آپ نے اُن کے خداؤں کی توہین کی ہے اور مغفرت سے مراد، اُن آثار کو دفع کرنا ہے کہ جن کے مترتب ہونے کا امکان تھا، اور اس مطلب پر دلیل، فتح مکہ کو معاف کردینے کی علت شمار کی ہے جیسا کہ فرماتا ہے:
(اِنَّا فَتَحنَا لَكَ فَتحًا مُّبِيناً)(۲)
اے رسول! یہ حدیبیہ کی صلح نہیں بلکہ ہم نے حقیقتاً تم کو کھلم کھلا فتح عطا کی۔
اب یہ امر واضح ہوگیا ہے کہ اگر اس گناہ سے مراد اصطلاحی گناہ ہوتا تو بخشش کی علت میں فتح مکہ کو بیان کرنے کوئی وجہ نہ تھی۔

نواں شبہ یہ ہے

کہ قرآن کریم: جناب زید کی مطلّقہ سے آنحضرت کے شادی کرنے کی داستان کی طرف

اشارہ کررہاہے، جب کہ زید پیغمبر کے منہ بولے فرزند تھے۔

....

(۱) سورۂ فتح۔آیت/۲

(۲) سورہ فتح۔آیت/۱.

(وَ تَخشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ أَن تَخشَاہُ)(۱)

اورتم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا کا زیادہ حق تھا کہ تم اُس سے ڈرو۔ایسی تعبیر مقام عصمت سے کیسے سازگار ہے

اس شبہ کا جواب یہ ہے

کہ آنحضرت کوصرف اورصرف اس بات کا ڈرتھا، کہ کہیں خدا کے اس دستور پر عمل کرنے اور جاہلیت کی رسومات میں سے ایک (گود لئے بچوں کو حقیقی بچوں جیسا سمجھنا) رسم توڑنے کی وجہ سے تھا کہ کہیں مسلمان ضعف ایمان کی وجہ سے اُس عمل کو نفسانی خواہشات کا نتیجہ نہ سمجھ بیٹھیں اوراُن کے دین سے نکل جانے کا باعث نہ بنے خدا اِس آیت میں اپنے رسول کو باخبر کرتا ہے کہ ارادہ الٰھی کے ساتھ اُس سنت شکنی کی مصلحت یعنی ایسی رسومات سے ڈٹ کر مقابلہ کرنا اس طرح کے غلط تصور سے زیادہ سزاوار ہے لہذا اس آیت میں آنحضرت کو کسی بھی قسم کی کوئی سرزنش نہیں کی گئی ہے۔

دسواں شبہ یہ ہے

کہ قرآن نے دومقام پر آنحضرت پر عتاب (ملامت وسرزنش) کی ہے، ان میں سے پہلا مقام یہ ہے کہ جب رسول ﷺ نے بعض افراد کو جنگ میں شرکت نہ کرنے کی اجازت دی تو خدا نے فرمایا:

(عَفَا اللّٰہُ عَنكَ لِمَ اَذِنتَ لَهُم)(۲)

اے رسول! خدا تم سے درگذر فرمائے تم نے اُنھیں پیچھے رہ جانے کی اجازت ہی کیوں دی

اور بعض حلال امور میں اپنی بعض ازواج کی جلب رضایت کے لئے فرمایا:

(یَآ اَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَكَ تَبتَغِ مَرضَاتَ اَزوَاجِكَ)(۳)

اے رسول! جو چیز خدا نے تمہارے لئے حلال کی ہے تم اس سے اپنی بیویوں کی خوشنودی کے لئے کیوں کنارہ کشی کرتے ہو ایسے عتاب آپ کی عصمت سے کیسے سازگار ہیں؟

....

(۱) سورۂ احزاب۔ آیت ۳۷

(۲) سورہ توبہ۔ آیت/ ۴۳

(۳) سورۂ تحریم۔ آیت/ ۱

اس شبہ کا جواب یہ ہے

کہ ایسے بیانات دراصل عتاب کی شکل میں پیغمبر کی مدح میں ہیں جو آنحضرت کی بے نہایت عطوفت اور مہربانی پر دلالت کرتے ہیں یہاں تک کہ آپ نے منافقوں کو بھی ناامید

نہیں کیا، اوران کے اسرار کو فاش نہیں کیا نیز اپنی ازواج کی خواہشوں کو اپنی خواہش پر مقدم رکھا، اور ایک مباح فعل کو قسم کے ذریعہ اپنے او پر حرام کرلیا تھا اور پیغمبر کا ایسا کرنا (معاذ اللہ) اس لئے نہیں تھا کہ حکم خدا کو بدل دیں، اور لوگوں کے لئے حلال کو حرام کردیں۔

دراصل یہ آیات ان آیات سے نہایت مشابہ ہیں کہ جس میں منافقوں کی ہدایت کے لئے آپ کی دلسوزی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

(لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤمِنِينَ)(۱)

اے رسول شاید اس فکر میں تم اپنی جان ہلاک کرڈالو گے کہ یہ کفار، مومن کیوں نہیں ہوجاتے

۔

یا ان آیات سے مشابہ ہیں کہ جو عبادت کی خاطر زحمتوں کے تحمل کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہیں

(طٰہٰ۔ مَا أَنزَلنَا عَلَيكَ القُرآنَ لِتَشقىٰ)(۲)

اے رسول ہم نے تم پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا، کہ تم اس قدر مشقت اٹھاؤ و بہرحال یہ مقامات عصمت کے خلاف نہیں ہیں۔

....

(۱) سورۂ شعرائ۔ آیت/ ۳

(۲) سورۂ طہ۔ آیت/ ۱،۲

سوالات

۱۔ایک معصوم کو دوسروں پر کیسے امتیازی اختیارات حاصل ہیں؟ وہ اعمال جو عصمت الٰہی کی بنا پرانجام دیئے جائیں اور کس جزا کے مستحق ہیں؟

۲۔کیوں انبیاء اور اولیاء (ع) اپنے آپ کو گنہگار سمجھتے اور استغفار کرتے تھے؟

۳۔انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ میں شیطان کے تصرفات ان کی عصمت سے کیسے سازگار ہیں؟

٤۔قرآن میں حضرت آدم علیہ السلام کی طرف جس نسیان اور عصیان کی نسبت دی گئی ہے وہ آپ کی عصمت سے کیسے سازگار ہے؟

٥۔اگر سارے انبیاء (ع) معصوم ہیں تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور جناب یوسف علیہ السلام نے کیوں جھوٹ بولے؟

٦۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں موجودہ شبہ اور اس کے جواب کو ذکر کریں؟

٧۔اگر وحی کے ادراک میں کوئی خطا واقع نہیں ہوسکتی تو پھر کیوں خدا بار بار اپنے رسول کو آپ کی رسالت میں شک وتردید سے منع کر دیا ہے؟

٨۔سورۂ فتح میں آنحضرت کی طرف جس گناہ کی نسبت دی گئی ہے وہ کیونکر آپ کی عصمت سے سازگار ہے؟

٩۔جناب زید کی داستان کے متعلق شبہات اور جوابات بیان کریں؟

١٠۔حضرت رسول کی بہ نسبت قرآن میں جو عتاب وارد ہوا ہے وہ کیا ہے؟ اور اس کا جواب کیا ہے؟

ستائیسواں درس

معجزہ

نبوت کو ثابت کرنے کے راستے۔

نبوت کے بنیادی مسائل میں سے ایک تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ سچے پیغمبروں کے دعوے کی صداقت اور جھوٹے نبیوں کے دعوے کا بطلان کیسے ثابت ہو؟

اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر کوئی فرد گناہوں میں آلودہ ہو، کہ جس کی قباحت کو عقل بھی بخوبی درک کرتی ہے، ایسا شخص کسی بھی صورت میں قابل اعتماد نہیں ہوسکتا، خصوصاً اُس وقت یہ اعتماد محال ہوجاتا ہے، کہ جب وہ عقل کے خلاف کسی امر کی طرف دعوت دنے یا اُس کی باتوں میں تناقض واختلاف پایا جاتا ہو۔

اس کے علاوہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ اس شخص کے گذشتہ حالات ایسے ہوں کہ بے غرض افراد اس کی باتوں پر اعتماد کرلیں، خصوصاً جب عقل بھی اُس کی باتوں کی تصدیق کررہی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک فرد کی پیغمبری کسی دوسرے رسول کی پیشینگوئی کے ذریعہ ثابت ہوجائے اور وہ بھی اس طرح ثابت ہوجائے کہ حقیقت کے طلبگاروں کے لئے شک وتردید کا مقام

باقی نہ رہ جائے۔

لیکن جب لوگوں کے پاس اطمینان بخش قرائن نہ ہوں، نیز اُن کے پاس کسی نبی کی بشارت یا تائید بھی موجود نہ ہو، تو انھیں نبوت کے اثبات کے لئے دوسرے راستے اختیار کرنے پڑیں گے ، لہٰذا خدا نے اِس مشکل کو حل کرتے ہوئے اپنے رسولوں کو معجزے عطا کئے تا کہ یہ معجزے اُن کے دعوے کو ثابت کرنے میں اُن کی مدد کریں اِسی وجہ سے اُنھیں آیات کے(۱) نام سے یاد کیا گیا ہے۔

نتیجہ۔کسی نبی کے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے تین راستے ہیں۔

۱۔اطمینان بخش قرائن کے ذریعہ،لیکن یہ صرف ان نبیوں کے متعلق صحیح ہے جنہوں نے لوگوں کے درمیان سالہا سال زندگی گذاری ہو، اور ایک عظیم شخصیت کے مالک ہوں لیکن اگر کوئی نبی ایام جوانی یا اپنی شخصیت کی پہچان سے پہلے وہ مبعوث بہ رسالت ہوجائے تو اُس نبی کے دعوے کو اس راہ کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔گذشتہ نبی نے، آنے والے نبی کی خبر دی ہو، یہ راستہ بھی انھیں لوگوں سے مخصوص ہے کہ جنھوں نے اُس سے پہلے کسی نبی کی معرفت حاصل کرلی ہو اور اس کی جانب سے آنے والے نبی کی تائید یا بشارت سنی ہو۔

۳۔معجزہ، یہ راستہ نہایت مفید اور تمام مقامات پر مفید ہے، لہٰذا اس کے بارے میں مزید وضاحت پیش کرتے ہیں۔

معجزہ کی تعریف۔

معجزہ یعنی ایک ایسا غیر عادی عمل، جو ارادہ خداوند کے مطابق نبوت کا دعوی کرنے والے شخص کی جانب سے صادر ہو اور اُس کے دعوے کو ثابت کرے۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ یہ تعریف تین مطالب پر مشتمل ہے۔

الف: غیر عادی امور کا وجود، جو عادی اسباب کے ذریعہ وجود میں نہیں آتے۔

ب: غیر عادی امور میں سے بعض ارادۂ الٰہی اور اُس کی اجازت سے واقع ہوتے ہیں۔

....

(۱) کلمہ آیات مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے جیسے علم وقدرت، حکمت، موجودات خواہ وہ عادی ہوں یا غیر عادی۔

ج: ایسے غیر عادی امور کسی پیغمبر کے دعوے کی صداقت کی علامت بن سکتے ہیں اسی وجہ سے اصطلاح میں اس کو معجزہ کہا جاتا ہے۔

خارق عادت امور۔

جو موجودات بھی اس کائنات میں وجود میں آتے ہیں عموماً وہ سب کے سب کسی نہ کسی اسباب وعلل کا نتیجہ ہوتے ہیں جنھیں آزمائشات کے ذریعہ پہچانا جا سکتا ہے جیسے کہ فیزیک، بیالوجی، کیمسٹری اور روحی علوم میں ترکیبات کے نتیجہ میں وجود میں آنے والے موجودات کی

جزئیات کا علم ہو جاتا ہے لیکن بعض نادر مواقع میں وجود میں آنے والے بعض موجودات کا وجود میں آنا، بالکل متفاوت ہوتا ہے، جس کے تمام اسباب وعلل کو حسی آزمائشات کے ذریعہ معلوم نہیں کیا جاسکتا، بلکہ صرف کچھ ایسے شواہد مل جاتے ہیں کہ جو اس بات کی خبر دیتے ہیں کہ اس طرح کے موجودات کے پائے جانے میں کوئی دوسری علت کارفرما ہے، جیسے کہ مرتاضوں (کے دریافت کرنے والوں) کے حیرت انگیز کام مختلف علوم کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ایسے امور مادی اور تجربی قوانین کے تحت وجود میں نہیں آتے، لہٰذا اسے وہ خارق عادت کا نام دیتے ہیں۔

الٰہی خارق عادت امور۔

غیر عادی امور کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے خارق عادت امور کی ایک قسم، ایسے اسباب و علل پر مشتمل ہوتی ہے جو عادی تو نہیں لیکن بشر کے اختیار میں ضرور ہیں، جسے تعلیم اور تمرین کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے جیسے کہ مرتاضوں کے غیر عادی امور، خارق عادت امور کی دوسری قسم: صرف اذن پروردگار سے واقع ہوتی ہے کہ جس کے اختیارات کبھی بھی اُن لوگوں کے سپرد نہیں کئے جاتے جو اِس سے مربوط نہ ہوں، اِسی وجہ اس کی دو خصوصیات پیش کی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ، یہ اس قابل نہیں کہ اس کو سیکھا اور سکھایا جاسکے، دوسرے یہ کہ کسی طاقت و قوت سے مرغوب نہیں ہوتے، ایسے غیر عادی امور اُس کے خاص بندوں سے مخصوص ہیں، جسے کبھی بھی ہوس باز اور گمراہ افراد کے سپرد نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ صرف انبیاء (ع) سے

مخصوص نہیں ہے، بلکہ اولیاء الٰہی بھی اس سے سرفراز ہوتے ہیں، اِسی وجہ سے علم کلام میں تمام خارق عادت امور کو معجزہ نہیں کہا جاتا، لھذا وہ خارق عادت امور جو انبیاء (ع) کے علاوہ اولیاء کرام سے صادر ہوتے ہیں انھیں کرامت کہا جاتا ہے، اِسی طرح غیر عادی علوم بھی وحی نبوت سے مخصوص نہیں ہیں، لہٰذا جب ایسے علوم انبیاء (ع) کے علاوہ دوسروں کو عطا کئے جاتے ہیں تو اُسے الہام یا تحدیث یا انہیں جیسا دوسرا نام دیا جاتا ہے۔

اس بحث کے ضمن میں خارق عادت امور (الٰہی اور غیر الٰہی) دونوعیت سے جانے جا سکتے ہیں ،یعنی اگر خارق عادت امور کو انجام دینا قابل تعلیم و تعلم ہوتا، یا کسی دوسرے میں اتنی طاقت ہوتی کہ اِن کے درمیان موانع یا خلل ایجاد کر دے یا اِس کے اثر کو باطل کر دے تو کسی بھی صورت میں یہ خدا کی جانب سے خارق العادہ امور کے حامل نہیں ہو سکتے تھے، جب کہ کسی شخص کی بداخلاقی اور تباہ کاری کو خدا سے رابطہ نہ ہونے کی دلیل اور اُس کے امور کے نفسانی یا شیطانی ہونے کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اس مقام پر مناسب ہے کہ ایک دوسرے نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا جائے کہ خارق العادہ امور کا فاعل، خدا کو قرار دیا جا سکتا ہے (اگر چہ تمام مخلوقات منجملہ عادی موجودات کی فاعلیت کی نسبت بھی اُسی کی طرف ہے) اس اعتبار سے اس کا محقق ہونا خدا کے اذن خاص پر موقوف ہے(۱) اور اُنھیں واسطوں سے فرشتہ یا انبیاء (ع) کی طرف نسبت دی جا سکتی ہے اِس لحاظ سے اس کی حثیت یا واسطہ یا فاعل قریب کی ہے،جس طرح سے کہ قرآن میں مردوں کو زندہ کرنا، بیماروں کو شفاء دینا اور پرندوں کے خلق کرنے کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی

طرف نسبت دی گئی ہے،(۲) لہٰذا اِن دونوں نسبتوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اس لئے کہ خدا کی فاعلیت بندوں کی فاعلیت کے طول میں ہے۔

....

(۱) سورۂ رعد۔آیت/ ۳۷ .سورۂ غافر۔آیت/ ۷۸

(۲) سورۂ آل عمران۔آیت/ ٤۹ .سورۂ مائدہ۔آیت/ ۱۱۰

انبیاء (ع) کے معجزات کی خصوصیات۔

معجزہ کی تعریف میں جس تیسرے مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء (ع) کے معجزے ان کے دعوے کے صحیح ہونے کی علامت ہیں، اِسی وجہ سے جب کسی خارق عادت امر کہ جسے علم کلام میں معجزہ کہا جاتا ہے خدا کی اجازت پر منحصر ہونے کے علاوہ پیغمبرں کی پیغمبری کی دلیل ہوتے ہوئے اُس کے مفہوم میں معمولی تبدیلی کے ساتھ اُن خارق عادت امور کو بھی شامل ہو جاتا ہے جسے امامت کو ثابت کرنے کے لئے انجام دیا جاتا ہے، اور اِس طرح کرامت کی اصطلاح اُن خارق عادت امور سے مخصوص ہو جاتی ہے جو اوصیاءِ الٰہی سے صادر ہوتے ہیں، جو ایسے غیر عادی امور کے مقابلہ میں ہے جس کا انحصار نفس اور شیطان پر ہو جیسے سحر، کہانت اور مرتاضوں کے افعال، یہ قسم قابل

تعلیم و تعلم ہے اور طاقتور عوامل کے مقابلہ میں مغلوب بھی ہو سکتے ہے اور اُس کا خدا کی جانب

سے نہ ہونے کے سبب اُن کے انجام دینے والوں کو گنہگار اور فاسد عقیدے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس مقام پر جس نکتہ کی طرف توجہ لازم ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء (ع) کے معجزات جس چیز کو براہ راست ثابت کرتے ہیں، وہ انبیاء (ع) کی نبوت کا دعوی ہے، لیکن رسالت کے پیغامات کا صحیح ہونا اور اُن کے احکامات کی پیروی کرنا بھی براہ راست اس سے ثابت ہوجاتا ہے، یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق انبیاء علیہم السلام کی نبوت عقلی دلیل اور اُن کے پیغامات تعبدی دلائل کے ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔(۱)

....

(۱) اسی کتاب کے چوتھے اور چوبیسویں درس کی طرف رجوع کیا جائے.

سوالات

۱۔ سچے پیغمبروں کو کن راستوں سے پہچانا جا سکتا ہے اور ان راستوں میں کیا فرق ہے؟

۲۔ جھوٹے نبیوں کی پہچان کیا ہے؟

۳۔معجزہ کی تعریف کریں؟

٤ ۔خارق لعادت امور کیا ہیں۔؟

٥ ۔الٰہی خارق العادہ اموراور غیر الٰہی خارق العادہ امور میں کیا فرق ہے؟

٦ ۔الٰہی خارق عادت امور کو کن راہوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے؟

۷۔الٰہی خارق عادت امور کے درمیان انبیاء(ع) کے معجزات کی خصوصیات کیا ہیں؟

۸۔معجزہ اور کرامت کی اصطلاح کو بیان کریں؟

۹۔معجزہ خدا کا کام ہے یا رسول کا؟

۱۰۔معجزہ پیغمبروں کے سچے ہونے کی دلیل ہے یا اُن کے پیغامات کے صحیح ہونے کی؟

اٹھائیسواں درس

چند شبہات کا حل

کیا اعجاز اصل علیت کے لئے ناقض نہیں ہے؟

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے۔

کیا خارق عادت امور سنت الٰہی میں تغیر ایجاد کرنے کے مترادف نہیں ہیں؟

کیوں رسول اکرم معجزات پیش کرنے سے خودداری فرماتے تھے؟

کیا معجزات برہان عقلی ہیں یا دلیل اقناعی؟

چند شبہات کا حل۔

مسئلہ اعجاز کے سلسلہ میں چند شبہات ہیں کہ جن کے جوابات اِس درس میں دیئے جائیں گے۔

پہلا شبہ یہ ہے

کہ ہمیشہ مادی موجودات کا وجود میں آنا، کسی خاص علت کی بنیاد پر ہوتا ہے کہ جنھیں علمی آزمائشات کے ذریعہ معلوم کیا جاسکتا ہے، اور کسی موجود کی علتوں کا نا شناختہ رہ جانا، اس موجود کے لئے علت نہ ہونے پر دلیل نہیں ہے، لہٰذا خارق عادت امور کو اِس عنوان سے قبول کیا جاسکتا ہے، کہ وہ ناشناختہ علل وعوامل کے ذریعہ وجود میں آئے ہیں، اور جب تک ان امور کے علل واسباب ناشناختہ ہیں اس وقت تک انھیں حیرت انگیز امور میں شمار کیا جاسکتا ہے، لیکن قابل شناخت علتوں کا انکار علمی آزمائشوں کے ذریعہ اصل علیت کے نقض کے معنی

میں ہے اور غیر قابل قبول ہے۔

اِس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اصل علیت کا صرف تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی وابستہ موجود، یا معلول کے لئے علت کا ہونا ضروری ہے، لیکن تمام علتوں کا آزمائشوں کے ذریعہ قابل شناخت ہونا کسی بھی صورت میں اصل علیت کا لازمہ نہیں ہے اور اس لازمہ کے لئے کوئی دلیل بھی نہیں ہے اس لئے کہ علمی آزمائش امور طبیعی میں محدود ہیں، اور کسی بھی صورت میں ماوراء طبعیت امور کے وجود، یا عدم یا اُس کی اثر گذاری کو آزمائش وسیلہ کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن اعجاز کی تفسیر ناشناختہ علتوں سے آگاہی کے معنی میں صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اگر یہ آگاہی عادی علتوں کے ذریعہ حاصل ہوئی ہوتو اِس میں اور بقیہ عادی موجودات میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے اور کسی بھی صورت میں اُسے خارق عادت امر نہیں کہا جا سکتا، اور اگر آگاہی غیر عادی طریقہ سے حاصل ہوئی ہوتو اُسے خارق عادت امور میں سے شمار کیا جائے، لیکن جب وہ اذن الٰہی پر منحصر اور نبوت کی دلیل ہوتو معجزہ کی قسموں میں شامل ہے، جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لوگوں کے ذخائر اور خوراک سے آگاہی آپ کے معجزات میں سے تھا(۱) لیکن معجزہ کو صرف اِسی ایک قسم میں منحصر نہیں کیا جاسکتا، اس اعتبار سے کہ بقیہ اقسام کی نفی کر دی جائے لیکن پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ ایسے امور اور بقیہ خارق عادت امور میں اصل علیت کے اعتبار سے فرق کیا ہے؟

دوسرا شبہ یہ ہے

کہ خدا کی ہمیشہ یہ سنت رہی ہے کہ وہ کسی بھی موجود کو کسی خاص علت کے سہارے وجود میں لاتا ہے، اورقرآن کی آیتوں کے مطابق سنت الٰہی قابل تغیرنہیں ہے۔(۲)

لہٰذا خارق عادت امورسنت الٰہی میں تغیر وتبدل کا سبب بنیں، مذکورہ آیتوں کی بنیاد پر یہ بات غیر قابل قبول ہے؟

یہ شبہ بھی گذشتہ شبہ سے مشابہ ہے بس فرق اتنا ہے کہ گذشتہ شبہ میں عقلی دلائل استعمال ہوئے تھے اوراس شبہ میں قرآنی آیت کا سہارالیا گیا ہے اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ موجودات کے علل واسباب کو عادی علل واسباب میں منحصر سمجھنے کوتغیر ناپذیر سنت الٰہی کا جز سمجھنا بے بنیاد بات ہے، اس کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ علت حرارت کا آگ میں منحصر ہونا خدا کی تغیر ناپذیر، سنتوں میں سے ہے، اِیسے دعووں کے مقابلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مختلف معلولات کے لئے مختلف

....

(۱) سورۂ آل عمران۔آیت/ ٤٩ .

(۲) سورۂ بنی اسرائیل۔، آیت/ ٧٧ ، .سورۂ احزاب۔آیت/ ٦٢ .سورۂ فاطر۔آیت/ ٤٣ سورۂ فتح۔آیت/ ٢٣ .

علتوں اوراسباب عادی کے لئے غیر عادی اسباب کا جمع ہونا ایک ایسا امر ہے جو ہمیشہ دیکھا گیا ہے

اوراس وجہ سے اُسے سنت الٰہی کا جزء شمار کرنا چاہیے اوراسباب کے عادی اسباب میں منحصر

ہونے کو

اُس کے لئے ایک قسم کا تغیر سمجھنا چاہیے کہ کی قرآن نے نفی کی ہے۔

بہر حال ان آیتوں کی تفسیر کرنا جو سنت الٰہی کے تغیر ناپذیر ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اس صورت میں کہ عادی اسباب کا جانشین قبول نہ کرنا اس عنوان کے تحت ہے کہ وہ خدا کی تغیر ناپذیر سنتوں میں ہے ایک بے بنیاد تفسیر ہے، بلکہ بہت سی وہ آیات جو معجزات اور خارق عادت امور کے ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اس تفسیر کے باطل ہونے کے لئے ایک محکم دلیل ، بلکہ اُن آیتوں کی صحیح تفسیر کو تفسیر کی کتابوں میں تلاش کرنا ہوگا اور ہم اس مقام پر صرف ایک اجمالی اشارہ کریں گے کہ یہ آیات ،معلول کی اپنی علت سے مخالفت نہ کرے پر دلالت کرتی ہیں نہ یہ کہ علتوں کا متعدد ہونا یا علت عادی کی جگہ علت غیر عادی کے آجانے کی نفی کرتی ہیں بلکہ شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ تا حد یقین اسباب کی تاثیر اور غیر عادی علل ان آیتوں کے موارد میں سے ہیں۔

تیسرا شبہ یہ ہے

کہ قرآن کے مطابق لوگ بار بار رسول اکرم سے معجزہ کی درخواست کرتے تھے اور آنحضرت ایسی خواہشوں کے جواب سے خودداری فرماتے تھے(۱) لہذا اگر معجزہ نبوت کو ثابت کرنے کا وسیلہ ہے تو پھر کیوں آنحضرت اس وسیلہ کے استعمال سے خودداری فرماتے تھے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ایسی آیتیں ان درخواستوں سے مربوط ہیں جو اتمام حجت اور (صحیح

قرائن صدق، گذشتہ انبیاء (ع) کی بشارتیں، اور معجزات کے ذریعہ آپ کی نبوت کے اثبات کے بعد) ضد اور عناد کی وجہ سے کی جاتی تھیں (۲) اور حکمت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ ایسی خواہشوں کا جواب نہ دیا جائے۔

....

(۱) سورۂ انعام۔ آیت/ ۳۷ سورۂ یونس۔ آیت/ ۲۰ سورۂ رعد۔ آیت/ ۷ سورۂ انبیا۔ آیت/ ۵

(۲) سورۂ انعام۔ آیت/ ۱۲۴ ۳۵ سورۂ طہ۔ آیت/ ۱۳۳ سورۂ صافات۔ آیت/ ۱۴ سورۂ قمر۔ آیت/ ۲ سورۂ شعراء۔ آیت/ ۴۳ ۱۹۷ سورۂ اسرائ۔ آیت/ ۵۹ سورۂ روم۔ آیت/ ۵۸

مزید وضاحت:

معجزہ اِس جہان میں موجودہ نظام کے درمیان ایک علیحدہ مسئلہ ہے جسے لوگوں کی خواہشوں کو پورا کرے (جیسے ناقۂ حضرت صالح) اور کبھی بطور ابتدائی (جیسے حضرت عیسی کے معجزات) انجام دیا جاتا تھا، لیکن اس کا ہدف خدا کے انبیاء (ع) کو پہچنوانا اور لوگوں پر حجت کو تمام کرنا تھا، لہٰذا معجزہ کا پیش کرنا رسولوں کی دعوتوں کو جبراً قبول کرنے اور اُن کے احکامات کے سامنے مجبوراً تسلیم ہوجانے کے لئے نہیں تھا اور نہ ہی وقت گذارنے کے لئے ایک کھیل اور عادی اسباب و مسببات میں ہنگامہ ایجاد کرنے کے لئے تھا، اور ایسے ہدف کے ہوتے ہوئے ایسی

خواہشوں کا جواب کبھی نہیں دیا جا سکتا، بلکہ ایسی خواہشوں کا جواب دینا حکمت کے خلاف ہوگا، یہ خواہشیں ان درخواستوں سے مشابہ ہیں کہ جو ایسے امور سے مربوط تھیں کہ جس کی وجہ سے راہ اختیار ختم ہوجاتا، اور لوگوں کو انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا، یا ان درخواستوں کی طرح ہیں کہ جنھیں عناد اور دشمنی یا حقیقت طلبی کے علاوہ کسی دوسرے اغراض کے تحت پیش کئے کرتے تھے، اس لئے کہ ایسی درخواستوں کا جواب دینے کی وجہ سے معجزات کھلونا بن جاتے اور عوام اُسے اپنے لئے وقت گزارنے کا بہترین وسیلہ تصور کرلیتی، یا اپنے شخصی منافع حاصل کرنے کے لئے رسول کے پاس جمع ہوجاتی، اور دوسری طرف آزادانہ اختیار، وانتخاب کا راستہ بند ہوجاتا، اس کے علاوہ لوگ مجبور ہوکر انبیاء علیہم السلام کی اطاعت قبول کرتے، اور یہ دونوں صورتیں معجزات کے پیش کرنے کی حکمت کے خلاف ہیں، لیکن ان مقامات کے علاوہ جہاں حکمت الٰہی کا تقاضا ہو، وہاں ان کی خواہشوں کا جواب دے دیا جاتا تھا جیسا کہ رسول اکرم کے بے شمار معجزات قطعی سند کے ساتھ ثابت ہیں، جن میں ہر ایک سے واضح اور جاودانی قرآن کریم ہے کہ جس کی وضاحت انشاء اللہ آئندہ آئے گی۔

چوتھا شبہ یہ ہے

کہ معجزہ چونکہ اذن الٰہی پر منحصر ہے جو اس بات کی علامت ہوسکتا ہے کہ خدا اور معجزہ دکھانے والے کے درمیان خاص ارتباط پایا جاتا ہے اس لئے کہ اُسے خدا نے یہ خاص اجازت عنایت کی ہے، یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق اس نبی نے اپنی خواہش اور عمل کو اُس کے

ارادہ کے ذریعہ تحقق بخشا ہے، لیکن ایسے ارتباطات کا عقلی لازمہ یہ نہیں ہے کہ اُس میں اور خدا کے درمیان اُس ارتباط کے علاوہ دوسرے ارتباطات بھی پائے جاتے ہوں لہذا معجزہ کو دعوی نبوت کے صحیح ہونے پر دلیل عقلی نہیں مانا جاسکتا، بلکہ اُسے صرف ایک ظنی اور قانع کردینے والی دلیل کا نام دیا جاسکتا ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ خارق عادت امور اگر چہ الٰہی کیوں نہ ہوں، خودبخود رابطہ وحی کے ہونے پر دلالت نہیں کرتے اِسی وجہ سے اولیاءعلیہم السلام کی کرامت کواُن کے نبی ہونے کی دلیل نہیں مانی جاسکتی لیکن یہاں بحث اس شخص کے سلسلہ میں ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور اپنے دعویٰ کوثابت کرنے کے لئے معجزہ دکھایا ہے اب اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا ہے(۱)، جوعظیم اور بدترین گناہوں میں سے ہونے کے علاوہ دنیا وآخرت میں تباہی کا موجب بھی ہے، اُس میں ہرگز خداُ سے ایسے ارتباط کے برقرار ہونے کی صلاحیت نہیں ہوسکتی، اور خدا کبھی بھی ایسے فرد کو معجزہ کی قدرت عطا نہیں کرسکتا کہ جس کی وجہ سے لوگ گمراہ اور بدبخت ہوجائیں(۲)

نتیجہ:

عقل بخوبی درک کرتی ہے کہ صرف وہی شخص خدا سے خاص ارتباط برقرار کرنے اور معجزہ کی قدرت سے سرفراز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ جو اپنے مولا سے خیانت نہ کرے اور اسکے بندوں کی گمراہی اور بدبختی کا موجب نہ بنے، للہذا معجزہ کا پیش کرنا دعوای نبوت کے صحیح ہونے

پر ایک قاطعِ دلیل عقلی ہے۔

....

(۱) سورۂ انعام۔ آیت/ ۲۱ ۹۳ ۱٤٤ سورۂ یونس۔ آیت/ ۱۷ سورۂ ہود۔ آیت/ ۱۸ سورۂ کہف۔ آیت/ ۱۵ سورۂ عنکبوت۔ آیت/ ٦۸ سورۂ شوریٰ۔ آیت/ ۲٤

(۲) سورۂ الحاقہ۔ آیت/ ٤٤ ٤٦

سوالات

۱۔ اصل علیت کا مطلب کیا ہے؟ اور اسکا لازمہ کیا ہے؟

۲۔ کیوں اصل علیت کو مان لینا اعجاز کو قبول کرنے کے خلاف نہیں ہے؟

۳۔ کیوں اعجاز کی تفسیر ناشناختہ علتوں سے آگاہی کے معنی میں صحیح نہیں ہے؟

٤۔ کیا اعجاز کو قبول کر لینا تغیر ناپذیر سنت الٰہی کے خلاف نہیں ہے؟ کیوں؟

۵۔ کیا انبیاء علیہم السلام ابتداء امر میں معجزات پیش کرتے تھے یا جب لوگوں کی طرف سے درخواست ہوئی تو اس وقت اپنا معجزہ پیش کرتے تھے؟

٦۔ کیوں انبیاء علیہم السلام معجزہ کے حوالے سے بعض خواہشوں کا جواب نہیں دیتے تھے؟

۷۔ اس امر کی وضاحت کریں کہ معجزہ ایک دلیل ظنی اور اقناعی نہیں ہے بلکہ ادعاء نبوت کے سچے ہونے پر ایک عقلی دلیل ہے؟

انتیسواں درس

انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے

انبیاء علیہم السلام کی کثرت

انبیاء علیہم السلام کی تعداد

نبوت ورسالت

اولوالعزم انبیاء علیہم السلام

چند نکات

انبیاء علیہم السلام کی کثرت۔

اب تک ہم نے مسائل نبوت میں سے تین مسئلہ کے تحت بحث کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دنیا وآخرت کی سعادت حاصل کرنے میں اُن معلومات کا بنیادی نقش ہے کہ جنھیں معلوم کرنے میں علوم بشری ناکافی ہیں، اس مشکل کے تحت حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری رکھے اور انھیں ضروری حقائق کی تعلیم دے تا کہ وہ انھیں صحیح وسالم تمام انسانوں تک پہنچا دیں، اس کے علاوہ اسے لوگوں کے سامنے اس طرح بیان کرے کہ اُن پر

حجت تمام ہو جائے اس مقصد تک پہنچنے کے لئے سب سے عمومی راستہ معجزہ ہے۔

ہم نے اِن مطالب کو عقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا،لیکن یہ دلائل انبیاء علیہم السلام کے متعدد ہونے اور آسمانی کتابوں کے متعدد ہونے کو ثابت نہیں کر سکتے ،اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ بشری زندگی اس طرح ہوتی کہ ایک ہی رسول اُس کی ضرورتوں کو کائنات کے ختم ہونے تک اِس طرح پورا کردیتا کہ ہرفرد اور گروہ اُسی ایک رسول کے ذریعہ پیام اسلام کو اخذ کرتا تو یہ امر اُن دلائل کے تقاضے کے خلاف نہ ہوتا۔

لیکن ہمیں معلوم ہے کہ پہلے یہ کہ، ہر انسان کی عمر خواہ نبی ہو یا غیر نبی محدود ہے لہٰذا حکمت الٰہی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ایک ہی رسول جہان کے ختم ہونے تک زندہ رہے اور خود ہی تمام انسانوں کی ہدایت کا فریضہ انجام دے۔

دوسرے یہ کہ: بشر کی زندگی مختلف حالات اور ادوار میں کبھی بھی ایک جیسی نہیں رہتی لہٰذا شرائط کا مختلف اور متغیر ہوتے رہنا خصوصاً روابط اجتماعی کا پیچیدہ ہونا احکام اور اجتماعی قوانین کے درمیان میں اثر انداز ہے، بلکہ بعض حالات میں جدید قوانین کی ضرورت ہوتی ہے،لہٰذا اگر یہ قوانین اسی رسول کے ذریعہ بیان ہوتے جو ہزاروں سال پہلے مبعوث ہوئے تھے تو یہ ایک غیر مفید امر ہوتا اور انھیں ان کے مقامات پر جاری کرنا اور ہی زیادہ سخت ہوتا۔

تیسرے یہ کہ: اکثر زمانوں میں مبعوث ہونے والے رسولوں کو اپنی تبلیغ کے لئے حالات اور شرائط ایسے نہیں تھے جو اپنے پیغام کو تمام انسانوں تک پہنچا سکتے۔

چوتھے یہ کہ: جب بھی ایک رسول کسی قوم کی جانب مبعوث ہوتا تھا تو اس کی تعلیمات کو زمانہ

کے گذرنے کے ساتھ بدل دیا جاتا اور اُس میں تحریف کردی جاتی تھی(۱)اورآہستہ آہستہ ایک رسول کالا یا ہوادین انحراف کا شکار ہوجاتا تھا،جس طرح کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جس دین کی طرف لوگوں کودعوت دی تھی وہی دین ان کے بعد انحراف سے دو چار ہوگیا اور تثلیث جیسے عقائد اُس دین کے جز بن گئے۔

ان نکات کے پیش نظر انبیاء علیہم السلام کا متعدد ہونا اور شریعتوں کا بدلتے رہنا اور بعض احکامات میں اختلافات کا راز سمجھ میں آجاتا ہے،(۲) لیکن ان سب شریعتوں میں اصول عقائد اور

....

(۱) ایسے نمونہ سے آگاہی کے لئے علامہ شیخ محمد جواد بلاغی کی کتاب الھدایٰ الی دین المصطفیٰ کی طرف رجوع کیا جائے.

(۲) سورۂ بقرۃ۔آیت/۱۳۱۔۱۳۷۔۲۸۵،سورۂ آل عمران۔آیت/۱۹۔۲۰.

مبانی اخلاقی کے اعتبار سے فردی واجتماعی احکامات میں ھماھنگی تھی مثلاً نماز تمام شریعتوں میں تھی اگر چہ ان نمازوں کی کیفیت متفاوت اور ان کے قبلہ مختلف تھے یا زکوٰۃ اور صدقہ دینا تمام شریعتوں میں تھا اگر چہ اس کی مقدار میں اختلاف تھا۔

بہر حال تمام رسولوں پر ایمان لانا اور نبوت کی تصدیق کے ساتھ اُن میں کسی فرق کے قائل نہ ہونا نیز اُن پر نازل ہونے والے تمام پیغامات اور معارف کو قبول کرنا نیز اس علاوہ ان میں یکسانیت کا قائل ہونا ہر انسان پر لازم ہے،(۱) ایک نبی کا انکار تمام انبیاء علیہم السلام کے

انکار کے برابر اور کسی ایک حکم کا منکر ہونا تمام احکامات الٰہیہ کے منکر ہونے کے مساوی ہے(۲) البتہ کسی بھی اُمت کے لئے کسی بھی زمانہ میں اسی دور کے نبی کے احکامات کے مطابق وظائف معین ہوتے رہے ہیں۔

جس نکتہ کی طرف یہاں پر اشارہ کرنا لازم ہے وہ یہ ہے کہ اگر چہ عقل، مذکورہ نکات کے کے تحت انبیاء علیہم السلام اور شریعتوں کے متعدد ہونے کے راز کو معلوم کر سکتی ہے لیکن اصل راز کا پتہ نہیں لگا سکتی، کہ کیوں؟ کب؟ کیسے؟ کسی دوسرے نبی کی بعثت یا کسی جدید شریعت کی ضرورت ہے، فقط اس حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب بھی بشر کی زندگی اس طرح ہو، کہ ایک نبی کے پیغامات تمام انسانوں تک پہنچ سکیں اور اس کے پیغامات آنے والوں کے لئے محفوظ رہ جائیں، نیز اجتماعی شرائط اس طرح متغیر نہ ہوں، کہ کسی جدید شریعت یا احکامات کلی میں تبدیلی کی ضرورت پڑے، تو ان حالات میں کسی جدید نبی کی بعثت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

....

(۱) سورۂ شوریٰ۔آیت/ ۱۳، سورۂ نساء۔آیت/ ۱۵۲۱۳۶، سورۂ آل عمران۔آیت/ ۸۴ ۸۵

(۲) سورۂ نسائ۔آیت/ ۱۵۰، سورۂ بقرہ۔آیت/ ۸۵

انبیاء علیہم السلام کی تعداد۔

جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کردیا ہے کہ ہماری عقل انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کی تعداد کا اندازہ نہیں لگا سکتی، بلکہ اُسے صرف نقلی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا جا سکتا ہے اور قرآن کریم میں اگر چہ یہ خبر موجود ہے کہ ہر اُمت کے لئے ایک نبی ضرور مبعوث ہوا ہے(۱) لیکن اِس کے باوجود قرآن نے اُن کی تعداد کو معین نہیں کیا ہے بلکہ اُن میں سے صرف ۲٤ رسولوں کا نام آیا ہے اور اُن میں سے بھی بعض رسولوں کی داستانوں کی طرف فقط اشارہ کیا گیا ہے اِس کے علاوہ اُن میں بھی بعض

نبیوں کے اسماء ذکر نہیں کئے گئے،(۲) لیکن معصومین علیہم السلام کی طرف سے منقول روایتوں کے مطابق خدا نے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں کو مبعوث کیا ہے(۳) جن کا سلسلہ حضرت آدم ابوالبشر علیہ السلام سے شروع اور حضرت محمد پر ختم ہوتا ہے۔

خدا کی طرف سے بھیجے گئے رسول، نبی ہونے کے علاوہ نذیر، منذر، بشیر، مبشر(٤) جیسے صفات کے بھی حامل تھے نیز صالحین ومخلصین میں اُن کا شمار ہوتا تھا، اور ان میں سے بعض منصب رسالت پر بھی فائز تھے بلکہ بعض روایتوں کے مطابق منصب رسالت پر فائز نبیوں کی تعداد (تین سو تیرہ) ذکر کی گئی ہے۔(۵) اسی وجہ سے اس مقام پر مفہوم نبوت وامامت اور نبی ورسول کے درمیان فرق کو بیان کر رہے ہیں۔

....

(۱) سورۂ فاطر۔آیت/ ۲٤، سورۂ نحل۔آیت/ ۳٦

(۲) سورۂ بقرہ۔آیت/ ۲٥٦۲٤٦.

(۳) رجوع کیا جائے رسالۂ اعتقادت صدوق اور بحار الانوار (طبع جدید) ج ۱۱ ص ۲۸، ۲۳۔۲۳ ٤.

(٤) سورۂ بقرۃ۔ آیت/ ۲۱۳، سورۂ نسائ۔ آیت/ ١٦٥

(٥) بحارالانوار۔ ج ۱۱ ص ۲۸، ۳۲

نبوت اور رسالت۔

کلمہ رسول پیغام لانے والے کے معنی میں ہے اور کلمۂ نبی اگر مادۂ نباء سے ہے تو اہم خبر کے مالک، اور اگر مادہ نبو،، سے ہے تو بلند و بالا مقام والے کے ہیں۔

بعض لوگوں کا گمان ہے کہ کلمہ نبی کلمہ رسول سے اعم ہے یعنی نبی وہ ہے کہ جس کی طرف خدا کی جانب سے وحی کا نزول ہوا اور اُسے لوگوں تک پہنچانے میں وہ مختار ہے لیکن رسول ※ وہ ہے کہ جس پر وحی کو لوگوں تک پہنچانا ضروری ہے۔

لیکن یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ قرآن میں بعض مقامات پر نبی کی صفت رسول کی صفت کے بعد مذکور ہے (۱) حالانکہ قاعدہ کے مطابق جو چیز عام ہو اسے خاص سے پہلے ذکر ہونا چاہیے اس کے علاوہ رسول کے لئے ابلاغ وحی کے لئے وجوب پر کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔

بعض روایتوں میں وارد ہوا ہے کہ مقام نبوت کا تقاضا یہ ہے کہ نبی فرشتہ وحی کو خواب میں مشاہدہ کرتا ہے اور بیداری میں صرف اس کی آواز سنتا ہے جبکہ مقام رسالت کا حامل شخص

بیداری میں فرشتہ وحی کو مشاہدہ کرتا ہے۔(۲)
لیکن اس فرق کو مفہوم لفظ کو مد نظر رکھتے ہوئے قبول نہیں کیا جا سکتا، بہر حال جس مطلب کو قبول کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ نبی مصداق کی رو سے (نہ مفہوم کے لحاظ سے) رسول، سے عام ہے، یعنی تمام رسول مقام نبوت سے سرفراز تھے لیکن مقام رسالت صرف کچھ خاص انبیاء علیہم السلام سے مخصوص تھا جن کی تعداد (۳۱۳) ہے، بس رسولوں کا مقام نبیوں کے مقابلہ میں بلند ہے جیسا کہ خود، تمام رسول فضیلت کے اعتبار سے ایک جیسے نہیں تھے(۳) بلکہ ان میں سے بعض مقام امامت سے بھی سزاوار تھے۔(٤)

....

(۱) بحارالانوار ج۱۱ ص۳۲ (۲) اصول کافی ج۱ ص۱۷٦ (۳) سورۂ بقرہ۔آیت/ ۲۵۳ سورۂ بنی اسرائیل۔آیت/ ۵۵ (٤) سورہ بقرہ۔آیت/ ۱۲٤ سورۂ انبیاء۔آیت/ ۷۳، سورۂ سجدہ۔آیت/ ۲٤.

اولوالعزم انبیاء علیہم السلام۔

قرآن کریم نے بعض رسولوں کو اولوالعزم کے نام سے یاد کیا ہے لیکن اُن حضرات کی خصوصیات کو بیان نہیں کیا ہے: روایتوں کے مطابق اولوالعزم پیغمبروں کی تعداد پانچ ہے(۱) حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ

علیہ السلام، اور حضرت محمد مصطفیٰ (۲) قرآن کے بیان کے مطابق اِن حضرات کی خصوصیات صبر و استقامت میں ممتاز ہونے کے علاوہ اُن میں سے ہر ایک مستقل کتاب اور شریعت کے مالک تھے نیز ہم عصر اور متأخر انبیاء علیہم السلام، اُن کی شریعتوں کی اتباع کرتے تھے مگر یہ کہ، کوئی دوسرا اولوالعزم رسول مبعوث ہو اور گذشتہ شریعت منسوخ ہو جائے اِسی ضمن میں یہ امر بھی روشن ہو گیا کہ ایک زمانہ میں دو، پیغمبر اکٹھا ہو سکتے ہیں جیسا کہ حضرت لوط علیہ السلام جناب ابراہیم علیہ السلام کے ہم عصر، اور حضرت ہارون جناب موسیٰ علیہ السلام، کے ہم عصر اور حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہم وقت، ہم زمان تھے۔

چند نکات۔

اس درس کے آخر میں مسئلہ نبوت کے تحت فہرست وار چند نکات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

الف: ہر نبی دوسرے نبی کی تصدیق اور اُس کے آنے کی پیشنگوئی کرتا تھا (۳) لہذا اگر کسی نبوت کا دعویٰ اور ہم عصر نبیوں یا گزشتہ رسولوں کی تکذیب کرے تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

....

(۱) سورۂ احقاف۔ آیت ۳۵.

(۲) بحارالانوار ج۱۱ ص ۴۲ اور معالم النبوۃ آیت/ ۱۱۳.

(۳) سورۂ آل عمران۔ آیت/ ۸۱

ب: انبیاءعلیہم السلام اپنی تبلیغ کی وجہ سے لوگوں سے اجر طلب نہیں کرتے تھے (۱) فقط رسول اکرم نے اجر رسالت کے عنوان سے اہل بیت علیہم السلام کی مودّت کی وصیت فرمائی تھی (۲) جس کی منفعت خود اُمت کے حق میں ہے (۳)۔

ج: بعض انبیاءعلیہم السلام منصب الٰہی کے مالک ہونے کے علاوہ قضاوت اور حکومت کے حق سے بھی سرفراز تھے جن میں سے حضرت داود، اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا نام لیا جا سکتا ہے سورہ نساء کی ٦٥ آیت سے استدلال ہوتا ہے کہ ہر رسول کی اطاعت مطلقاً واجب ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام رسول س مقام کے مالک تھے۔

د: جن، جو مکلف اور مختار مخلوقات میں سے ہیں اور عادی حالات میں انسان کے لئے قابل دید نہیں ہیں، بعض انبیاءعلیہم السلام کی دعوتوں سے باخبر ہوتے تھے اور اُن میں صالح افراد اُن کی دعوتوں پر ایمان بھی لائے تھے، اُن لوگوں کے درمیان حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت رسول اکرم کے پیرو موجود ہیں (٤) اور ان میں سے بعض ابلیس کی پیروی کرتے ہوئے انبیاءعلیہم السلام کی تکذیب بھی کرتے ہیں۔(٥)

....

(۱) سورۂ انعام۔ آیت/ ۹۰ سورۂ یس ۔آیت/۲۱، سورۂ قلم۔ آیت/ ٤۲، سورۂ یونس۔ آیت/ ۷۲، سورۂ ہود۔ آیت/ ۲۹ ٥۱، سورۂ فرقان ۔آیت/ ۷٥، سورۂ شعرائ۔ آیت /۱۰۹،۱۲۷،۱٤٥،۱٦٤،۱۸۰،سورۂ یوسف۔آیت/ ۱۰٤

(۲) سورۂ شوریٰ۔آیت/ ۲۳

(٣) سورۂ سبا۔ آیت/ ٤٧

(٤) سورۂ احقاف۔ آیت/ ٢٩، ٣٢

(٥) سورۂ جن۔ آیت/ ١، ١٤

سوالات

١۔ انبیاء علیہم السلام کے متعدد ہونے کی حکمت بیان کریں؟

٢۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوتیں اور ان کے احکامات ے مقابل میں لوگوں کا وظیفہ کیا ہے؟

۳۔ کس صورت میں جدید نبی کومبعوث کرنے کی ضرورت نہیں ہے؟

٤۔ انبیاء اور رسولوں کی تعداد بیان کریں؟

٥۔ نبی اور رسول میں کیا فرق ہے اور مفہوم ومصداق کے اعتبار سے ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

٦۔ انبیاء علیہم السلام کومنصب الٰہی کی رو سے ایک دوسرے پر کیسے برتری حاصل ہے؟

۷۔ اولوالعزم رسول کون ہیں؟ اوران کی خصوصیات کیا ہیں؟

۸۔ کیا زمانِ واحد میں پیغمبروں کا متعدد ہونا ممکن ہے؟ اور ممکن ہونے کی صورت میں کسی ایک نمونہ کو بیان کریں؟

۹۔ انبیاء علیہم السلام کے اوصاف میں سے آپ کو مذکورہ اوصاف کے علاوہ اگر یاد ہوں تو ذکر کریں؟

۱۰۔ جنات کا طرز عمل، ایمان اور کفر کے لحاظ سے انبیاء علیہم السلام کی بہ نسبت کیسا ہیں؟

تیسواں درس

انبیاءعلیہم السلام اورعوام

مقدمہ

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے۔

انبیاءعلیہم السلام کے مقابلہ میں لوگوں کا کردار

انبیاءعلیہم السلام سے مخالفت کے اسباب

انبیاءعلیہم السلام سے ملنے کا طریقہ

انسانی معاشروں کی تدبیر میں بعض سنت الٰہی

مقدمہ

قرآن مجید جہاں گذشتہ انبیاءعلیہم السلام کی داستانوں کو ذکر کرتا ہے اوران کی درخشاں زندگی کے ہرہر گوشہ کی تفصیل بیان کرتا ہے اوراُن کی تاریخ میں موجود تحریفات کے پردے فاش کرتا ہے وہیں انبیاءعلیہم السلام کی تبلیغات کے مقابلہ میں لوگوں کے ردّعمل کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے ایک طرف انبیاء الٰہی علیہم السلام کے مقابلہ میں لوگوں کی مخالفتوں نیز ان کی مخالفت کے اسباب وعلل کو بیان کرتا ہے اوردوسری طرف انبیاءعلیہم السلام کا لوگوں کو ہدایت اورتربیت کرنے کے علاوہ کفروشرک جیسے عوامل سے برسرپیکار ہونے کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے نیز انسانی معاشروں میں جاری سنت الٰہی خصوصا انبیاءعلیہم السلام اورلوگوں کے درمیان ارتباط کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ جس میں عبرت آموز نکات پوشیدہ ہیں۔

یہ مباحث اگر چہ براہ راست اعتقادی مسائل سے مربوط نہیں ہوتی لیکن چونکہ مسائل نبوت سے مربوط بہت سارے روشن پہلو ،مختلفا بہامات سے پردہ ہٹانے کے علاوہ تاریخ کے وادثات سے عبرت حاصل کرنے اور انسانی زندگی کو سنوارنے میں نہایت اہم رول ادا کرتے ہیں اسی وجہ سے اس درس میں جو مہم نکات ہیں ان کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے مقابل میں لوگوں کا کردار۔

جب بھی انبیاء الٰہی علیہم السلام قیام کرتے اور لوگوں کو خدئے اواحد(۱)اوراس کے احکامات کی اطاعت کرنے نیز باطل خداؤں کی پرستش سے بیزاری، شیاطین اور طاغوت سے کنارہ کشی ،ظلم وفساد، گناہ اور معصیت سے پرہیز کرنے کے لئے دعوت دیتے تھے تو انہیں عموماً لوگوں کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا(۲)مخصوصاً معاشرہ کے وہ افراد جو حاکم اور مالدار ہونے کی وجہ سے اپنے عیش ونوش(۳)میں مست،علم ودانش(٤)مال وثروت کی فراوانی پر مغرور تھے، وہ شدت سے مقابلہ کرتے تھے فقیر طبقات کی ایک بڑی جماعت کو اپنا حامی بنا کر لوگوں کو راہ حق کی پیروی سے روکتے تھے(٥)اور اس طرح صرف وہی لوگ ایمان لاتے تھے جو معاشرہ کے پچھڑے ہوئے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے(٦)اور بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ ایک سماج صحیح وسالم عقائد اور عدل کی بنیادوں پر قائم ہونے کے ساتھ احکامات الٰہیہ کا مطیع ہوتا جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں ایسا سماج دیکھنے میں آیا، اگر چہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا ایک حصہ آہستہ آہستہ ضرور سماج میں نفوذ کر جاتا تھا، یا کبھی حاکمان

وقت کی طرف ان کی جھوٹی عظمتوں کو بتانے کے لئے پیش کیا جاتا تھا، جیسا کہ آج زیادہ تر حقوقی نظام آسمانی شریعتوں کے اقتباس کا نتیجہ ہیں جنھیں منبع و ماخذ کے بغیر اپنے افکار کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔

....

(۱) سورۂ نحل۔ آیت/ ۳٦، سورہ انبیاء۔ آیت/ ۲٥، سورۂ فصلت۔ آیت/ ١٤، سورۂ احقاف۔ آیت/ ۲١

(۲) سورۂ ابراہیم۔ آیت/ ۹، سورۂ مومنون۔ آیت/ ٤٤

(۳) سورۂ سبا۔ آیت/ ۳٤،

(٤) سورۂ غافر۔ آیت/ ۸۳، سورۂ قصص۔ آیت/ ۷۸، سورہ زمر۔ آیت/ ٤۹

(٥) سورہ احزاب۔ آیت/ ٦۷، سورہ سبا۔ آیت/ ۳١/ ۳۳

(٦) سورۂ ہود۔ آیت/ ٤/ ۲۷/ ۳١

انبیاء علیہم السلام سے مخالفت کے اسباب۔

انبیاء علیہم السلام سے مخالفت کے اسباب میں سے خواہشات نفسانی اور فحشا سے لگاؤ (١) کے علاوہ خودخواہی، غرور، اور استکبار، جیسے عوامل ہیں کہ جو زیادہ تر سماج کے مالدوں اور اثر ونفوذ رکھنے والوں کے درمیان پائے جاتے ہیں (۲) نیز گذشتہ آباواجداد کی سنتوں کی پیروی بھی

مہم عوامل میں سے تھی (۳) ۔اسی طرح دانشمندوں ،حکمرانوں ،اور مالداروں کی مخالفت کے اسباب میں سے سماجی مقام اور اقتصادی منابع کو اپنے لئے محفوظ رکھنا تھا(٤)اور دوسری طرف لوگوں کا جہالت اور نادانی کی وجہ سے کفر کے سربراہوں کے دھوکے میں آجانا اور اُن کی پیروی کرنا سبب بنتا تھا کہ وہ کیسے اوہام اور باطل عقائد پر ایمان رکھنے سے دست بردار ہوں اور اس ایمان کو قبول کرنے سے پرہیز کریں جسے صرف چند محروم افراد نے قبول کیا ہے جبکہ یہ لوگ معاشرے کے مالداروں اور شرفا کی جانب سے مطرود و مردود بھی کر دیئے جاتے تھے اس کے علاوہ سماج پر حاکم فضا کے اثرات کو بے اثر نہیں سمجھا جا سکتا ۔(٥)

....

(۱) سورۂ مائدہ ۔آیت/ ۷۰

(۲) سورۂ غافر آیت/ ٥ ،سورۂ اعراف آیت/ ۷٦

(۳) سورۂ بقر آیت/ ۱۷۰ ، سورۂ مائدہ آیت/ ۱۰٤ ، سورہ یونس آیت/ ۷۸ ، سورہ انبیاء آیت/ ٥۳ ،سورۂ شعراءآیت ۷٤ ،سورۂ لقمان/ آیت ۲۱ ،

سورۂ زخرف آیت/ ۲۲ ، ۲۳ .

(٤) سورۂ ہود آیت/ ۸٤ ، ۸٦ ،سورۂ قصص آیت/ ۷٦ ، ۷۹ ،سورہ توبہ آیت/ ۳٤ .

(٥) سورہ ابراہیم /آیت ۲۱ ، سورۂ فاطر آیت/ ٤۷ ، سورۂ ہود آیت/ ۲۷ ، سورۂ شعراء آیت/ ۳٤ .

انبیاء علیہم السلام سے ملنے کا طریقہ۔

مخالفین، انبیاء علیہم السلام کی تبلیغات کو نا کام بنانے کے لئے مختلف طریقے اپناتے تھے۔

الف: تحقیر و استہزاء:

وہ لوگ پہلے مرحلہ میں پیغمبروں کی شخصیت کی تحقیر کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے(۱) تا کہ لوگ ان سے بدظن ہو جائیں۔

ب: ناروا بہتان:

اور پھر ان پر بہتان باندھتے تھے نیز ان کی طرف ناروا نسبتیں دیتے تھے جیسے سفیہ و احمق اور مجنون کے نام سے پکارتے تھے(۲) اور جب کوئی معجزہ پیش کرتے تو جادو گر کا نام دیتے تھے(۳) اسی طرح الٰہی پیغامات کو اساطیر الاولین کہتے تھے۔(٤)

ج: مجادلہ اور مغالطہ:

اور جب انبیاء الٰہی علیہم السلام حکمت اور دلائل کے ذریعہ استدلال پیش کرتے یا جدال احسن کی صورت میں ان لوگوں سے مجادلہ کرتے یا لوگوں کو نصیحت کرتے، اور کفر و شرک کے ناگوار نتائج سے آگاہ کرتے نیز خدا پرستی کے نیک انجام کے سلسلہ میں خبر دیتے، اور مومنین کو دنیا و

آخرت میں سعادت کی خوشخبری دیتے،تو کفر کے سر براہ،لوگوں کو ایسی باتوں کے سننے سے منع کرتے اور پھر اپنی ضعیف منطق کے ذریعہ اُن کا جواب دیتے،اس کے علاوہ اس امر میں اپنی پوری کوشش صرف کرتے تھے تا کہ لوگوں کو اُن کی باتوں کے سننے سے روک دیں(٥) وہ لوگ اپنی منطق میں اپنے آباء واجداد اور بزرگان ملت کے دین اور ان کے رسم ورواج کا سہارا لیتے (٦)اس کے

....

(١)سورۂ حجر۔آیت ١١،یس آیت ٣٠،زخرف آیت ٧، مطففین آیت ٢٩، ٣٢.

(٢)سورۂ اعراف آیت ٦٦،سورۂ بقرہ آیت ١٣،سورۂ مومنون آیت ٢٥.

(٣)سورۂ ذاریات آیت ٣٩،٥٢، ٥٣.

(٤)سورۂ انعام آیت ٢٥،انفال آیتٍ ٣١،سورۂ نحل آیت ٢٤،مومنون ٨٣، نمل ٦٨،قلم ١٥، مطففین ١٣.

(٥)سورۂ نوح ٧،سورۂ فصلت ٢،انعام ١١٢، ١٢١،سورۂ غافر ٥ ،٣٥،اعراف ٧٠، ٧١، کہف ٥٦.

(٦)سورۂ بقرہ ١٧٠،مائدہ ١٠٤،اعراف ٢٨،انبیائ ٥٣،یونس ٧٨ لقمان ٢١.

علاوہ اپنی مادی ثروت کی چمک دمک،دکھلاتے اور باایمان لوگوں کے ضعف اور ناداری کو ان کے عقائد کے باطل ہونے کو دلیل بناتے (١)اور اپنے لئے یہ بہانہ بنا لیتے کہ کیوں خدا نے اپنے رسول کو فرشتوں میں سے انتخاب نہیں کیا؟ یا اُن لوگوں کے ساتھ کیوں کسی فرشتہ کو نہ

بھیجا؟ یا کیوں انھیں مالدار نہیں بنایا؟(۲) اور کبھی ان کی لجاجت اس حد تک بڑھ جاتی کہ کہتے کہ ہم اسی صورت میں ایمان لائیں گے کہ جب ہم پر بھی وحی نازل ہو یا پھر خدا کو ہم دیکھ لیں اور اس کی آواز بلاواسطہ سنیں۔(۳)

د۔ دھمکی دینا اور طمع دلانا: ایک دوسرا طریقہ جو انبیاء علیہم السلام کی داستانوں میں مشاہدہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ انبیاء علیہم السلام، اور اُن کے اطاعت گذاروں کو مختلف اذیتوں، شکنجوں، شہر بدر کرنے، سنگ سار کرنے، اور قتل کرنے کی دھمکی دیتے تھے،(٤) اس کے علاوہ مختلف چیزوں کی لالچ دلاتے تھے خصوصاً کثیر دولت کے ذریعہ لوگوں کو انبیاء علیہم السلام کی اطاعت سے روکتے تھے۔(٥)

ھ۔ خشونت اور قتل: لیکن جب وہ لوگ انبیاء علیہم السلامی کا صبر و استقامت، اور صلاہت ومتانت کو مشاہدہ کرتے (٦) اور دوسری طرف اُن کے چاہنے والوں کے اخلاص کو دیکھتے تو اپنی تبلیغات کے ناکام ہونے اور استعمال کئے گئے ہتھکنڈوں کے ناکارہ ہونے کی صورت میں اپنی دھمکیوں کو عملی کر دیتے اور آزاز واذیت شروع کر دیتے جیسا کہ اسی طرح انھوں نے بہت سے انبیاء الٰہی کو قتل کر ڈالا (۷ اور انسانی معاشرہ کو عظیم نعمتوں اور قوم اور سماج کو صالح رہبروں سے محروم کر دیا۔

....

(۱) سورۂ یونس آیت/ ۸۸، سباء آیت/ ۳۵، قلم آیت/ ١٤، مریم آیت/ ۷۷، مدثر آیت/ ۱۲، مزمل آیت/ ۱۱، احقاف آیت ۱۱

(۲)سورۂ انعام آیت/ ۷، ۹،اسرائ/ ۹۰، ۹۵،فرقان/ ۸٤

(۳)سورۂ بقرہ آیت/ ۱۱۸،انعام آیت/ ۱۲٤،نساء آیت/ ۱۵۳

(٤)سورۂ ابراہیم آیت/۱۳، ہود آیت/۹۱، مریم آیت/ ٤٦، یس آیت / ۱۸، غافر آیت/۲٦

(٥)انفال آ)یت/ ۳٦

(٦)سورۂ ابراہیم آیت/ ۱۲

(۷)سورۂ بقرہ آیت/٦۱، ۸۷، ۹۱، آل عمران آیت/ ۲۱۱، ۱۱۲، ۱۸۱، مائدہ آیت/ ۷۰، نساء آیت/ ۱۵۵

انسانی معاشروں کی تدبیر میں بعض سنت الٰہی۔

اگر چہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصلی ہدف یہ تھا کہ لوگ دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کرنے میں ضروری تعلیمات سے آشنا ہو جائیں اور اُن کی عقل و تجربہ کا ضعف وحی کے ذریعہ ختم ہو جائے یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق اُن کے لئے حجت تمام ہو جائے (۱) لیکن خدا نے انبیاء کی بعثت کے دوران اپنی حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اُن کی دعوتوں کو قبول کرنے کے لئے فضا کو ہموار بنایا، تا کہ اس طرح انسانوں کے تکامل کے لئے راستہ آسان ہو جائے اور چونکہ خدا اور اسکے رسول سے روگردانی کے عظیم عوامل میں سے لوگوں کی نہایت مشکلات

کے ہوتے ہوئے ان سے غفلت اور بے نیازی تھی (۲) لہٰذا خدا فضاء کو اس طرح ہموار کرتا تھا کہ لوگ ان ضرورت مندں کی طرف متوجہ ہوجائیں اور غرور وتکبر کی سواری سے اُتر جائیں اِسی وجہ سے بلاؤں کو نازل کرتا اور انھیں سختیوں سے دو چار کردیتا تا کہ مجبور ہوکر اپنی ناتوانی کا احساس کرلیں اور خدا کی طرف متوجہ ہوجائیں۔(۳)

لیکن اس عامل کا اثر ہر ایک پر مؤثر نہ تھا خصوصاً وہ لوگ جو دولت میں سرمست اور سالہا سال لوگوں پر ظلم وستم کے ذریعہ کثیر مال ودولت جمع کرلی تھی قرآن کی تعبیر کے مطابق ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہوچکے تھے وہ ان سب کے باوجود بھی وہ متوجہ نہیں ہوتے (٤) اسی طرح خواب غفلت میں گرفتار رہتے ، اور اپنی باطل راہ پر قائم رہتے اُن پر انبیاء علیہم السلام کے مواعظ ، عذاب کی دھمکیاں ، اور ان کی نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا ، اور جب خدا اُن سے بلاؤ ں کوٹال دیتا ، اور انھیں نعمتوں سے نواز دیتا ، تو یہ کہتے کہ نعمتوں اور بلاوں کا آنا جانا زندگی کا ایک لازمہ ہے اور ایسا تو ہوتا

---

(۱) سورۂ نساء آیت/ ٦٥ ، طہٰ آیت/ ١٣٤

(۲) سورۂ علق آیت/ ٦

(۳) سورۂ انعام آیت/ ٤٢ ، اعراف آیت/ ٩٤

(٤) سورۂ انعام آیت/ ٤٣ ، سورۂ مومنون آیت/ ٧٦

رہتا ہے نیز ایسا تو گذشتہ لوگوں کے ساتھ بھی ہوا ہے (۱) اور حسب سابق مال کو جمع کرنے اور

ظلم وستم میں مشغول ہوجاتے، حالانکہ غافل تھے کہ نعمتوں کی افزائش دنیا وآخرت میں بدبخت ہونے کے لئے ان کے واسطے ایک حیلہ ہے(۲)۔

بہرحال جب بھی انبیاء الٰہی علیہم السلام کے پیروکار تعداد کے اعتبار سے اس حد تک ہوجاتے کہ وہ ایک مستقل جامعہ تشکیل دے سکتے اوراُن میں دفاع کی قوت آجاتی تو انھیں دشمنان خدا سے جہاد کے لئے حکم دے دیا جاتا تھا(۳) اوران کے ہاتھوں جماعت کفار پر عذاب الٰہی نازل ہوتا تھا(٤) وگرنہ مومنین انبیاء علیہم السلام کے حکم سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے اور پھراُن پر بازگشت اورایمان لانے کی ناامیدی کے بعد عذاب نازل ہوجاتا تھا(٥) یہ ہے وہ سنت الٰہی جو کبھی بھی نہیں بدلتی۔(٦)

....

(۱) سورۂ اعراف آیت/ ۱۸۳،۹٥

(۲) سورۂ اعراف آیت/ ۱۹۳،۱۸۲، آل عمران آیت/ ۱۷۸، توبہ آیت/ ٥٥،٥٨، مومنون آیت/ ٥٤،٥٦

(۳) سورۂ آل عمران آیت/ ١٤٦

(٤) سورۂ عنکبوت آیت/ ٤١٠. اور بہت سے دوسرے مقامات پر قرآن میں ذکر ہوا ہے

(٥) سورۂ آل عمران آیت/ ١٤٦

(٦) سورۂ فاطر آیت/ ٤٣، غافر آیت/ ٨٥، اسراء آیت/ ٧٧

سوالات

۱۔انبیاءعلیہم السلام کی دعوت کے مقابل میں لوگوں کا ردعمل کیا تھا؟

۲۔انبیاءعلیہم السام سے مخالفت کے اسباب کیا ہیں؟

۳۔انبیاءعلیہم السلام کے مخالفین کیسے کیسے طریقے اپناتے تھے؟

٤۔انبیاءعلیہم السلام کی بعثت اوران کے مقابل میں لوگوں کی مخالفت کی صورت میں سنتِ الٰہی کیا ہوتی تھی؟

اکتیسواں درس

پیغمبر اسلام

مقدمہ
پیغمبر اسلام کی رسالت کا اثبات

مقدمہ

ہزاروں انبیاء علیہم السلام، مختلف ادوار میں اور مختلف سرزمینوں پر مبعوث ہوئے اور انسانوں کی تربیت و ہدایت میں اپنا ممتاز کردار پیش کیا، انسانی معاشروں میں درخشاں آثار چھوڑے ،اوران میں سے ہر ایک نے انسانوں کی ایک جماعت کی تربیت کی، اور بقیہ انساوں پر غیر مستقیم اثر چھوڑا، بلکہ اُن میں سے بعض توحیدی اور ایک عادلانہ سماج قائم کرنے اور اُس کی رہبری کرنے میں کامیاب بھی ہوئے۔

انبیاء الٰہی کے درمیان حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت عیسی علیہ السلام، اور حضرت موسی علیہ السلام نے خدا کی جانب سے زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے اخلاقی وظائف اور فردی و اجتماعی احکام وقوانین پر مشتمل کتاب، بشر کی دسترس میں قرار دی، لیکن یہ کتابیں یا تو زمانہ کے گذرنے کے ساتھ بالکل محو ہوگئیں یا اُن میں لفظی اور معنوی تحریفیں کی گئیں، اوراس طرح آسمانی شریعتیں مسخ ہوگئیں جب کہ جناب موسی علیہ السلام کی کتاب توریت میں بے شمار تحریفیں ہوئیں اور اب حضرت عیسی علیہ السلام کی انجیل کے نام سے کوئی کتاب باقی نہیں رہی، بلکہ آج جو کچھ ہے وہ حضرت عیسی علیہ السلام کے بعد اُن کے حواریوں کے نوشتہ جات ہیں، جنھیں کتاب مقدس کا نام دیا گیا ہے۔

اگر کوئی منصف انسان کتاب توریت اور انجیل کا مطالعہ کرے تو اُسے بخوبی معلوم ہو جائے گا، کہ یہ کتابیں حضرت موسی علیہ السلام اور جناب عیسی علیہ السلام کی نہیں ہیں توریت کا حال تو یہ ہے کہ وہ خدا کو ایک انسان کی شکل میں بیان کرنے کے علاوہ خدا اور اس کے رسولوں کی طرف شرمناک نسبتیں دیتی ہے، کہ خدا بہت سے امور سے بے خبر ہے(۱) اور بارہا جس عمل کو انجام دیتا ہے اس سے پشیمان ہوجاتا ہے(۲) وہ اپنے بندوں میں سے ایک بندہ (حضرت یعقوب علیہ السلام) سے کشتی لڑتا ہے لیکن اُسے مغلوب نہیں کر پاتا اور جب تھک جاتا ہے تو اُس سے التماس کرتا ہے کہ اُسے چھوڑ دے، تاکہ اس کی مخلوقات اپنے خدا کو اِس حال میں مشاہدہ نہ کرے، (۳) اسی کتاب میں جناب داؤد علیہ السلام کی طرف زنا محصنہ کی نسبت دی ہے(٤) اور جناب لوط علیہ السلام کی طرف شراب نوشی اور محارم سے زنا کی نسبت بھی دی گئی ہے، (٥) اس کے علاوہ کتاب توریت کے لانیوالے حضرت موسیٰ کی موت کی شرح بھی بیان کرتی ہے کہ وہ کیسے اور کہاں انتقال کر گئے (٦)

کیا صرف یہی نکات ہمارے سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہیں کہ یہ توریت حضرت موسی علیہ السلام کی توریت نہیں ہے؟ لیکن انجیل کا حال تو توریت سے بھی بُرا ہے اس لئے کہ اولاً جو کتاب حضرت عیسی علیہ السلام پر نازل ہوئی یہ وہی انجیل نہیں ہے اور خود مسیحیوں نے بھی کوئی ایسا دعویٰ نہیں کیا ہے،

....

(۱) توریت سفر پیدائش۔ تیسرا باب شمارہ ۸۔۱۲

(۲) توریت، سفر پیدائش۔ چھٹا باب شمارہ ٦۔

(۳) توریت، سفر پیدائش۔٠ ۳ ۲ باب شمارہ ٢٤ ۔ ۲ ۳ .

(٤) عہد قدیم، سموئیل کی دوسری کتاب گیارہواں باب۔

(٥) توریت سفر پیدائش انیسواں باب شمارہ٠ ۳ ۔ ۳۸۔

(٦) تورات سفر تشنیہ۔ باب ٤ ۳

بلکہ آج جو کچھ بھی اُن کے حواریوں کے نوشتہ جات ہیں یہ کتاب شراب نوشی کی تجویز کے علاوہ اُسے بنانے کو حضرت عیسی علیہ السلام کے معجزات میں شمار کرتی ہے(۱) خلاصہ یہ ہے کہ ان دو اولوالعزم رسولوں پر جو کچھ بھی نازل ہوا تحریف کا شکار ہو گیا، اور اب اس میں لوگوں کی ہدایت کی صلاحیت باقی نہیں رہی، لیکن یہ تحریفیں کیسے ہوئیں اس کی بڑی مفصل داستان ہے جسے یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔(۲)

ہاں! حضرت عیسی علیہ السلام کی بعثت کے چھ سو سال بعد جب جہل اور ظلم و بربریت نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو تاریک بنا رکھا تھا، اور ہدایت کے چراغ خاموش ہو چکے تھے، تو خداوند متعال نے اس دور کے پست ترین اور تاریک ترین سرزمین پر اپنے آخری رسول کو مبعوث کیا، تا کہ ہمیشہ کے لئے چراغ وحی کو فروزاں بنا دے، اور نسخ و تحریف سے محفوظ جاودانی کتاب کو بشر کے ہاتھوں میں تھا دے اور اس طرح لوگوں کو حقیقی معارف، آسمانی حکمتیں اور الٰہی قوانین کی تعلیم سے آراستہ کر دے نیز دنیا و آخرت میں سعادت کی راہ کی طرف گامزن کر دے (۳)۔

امیر المؤمنین امام علی علیہ السلام آنحضرت کی بعثت کے دور کی توصیف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: خدانے اپنے رسول کو اس وقت مبعوث کیا جب گذشتہ انبیاء علیہ السلام کی بعثوں سے کافی فاصلہ واقع ہو چکا تھا، لوگ گہرے خواب میں پڑے سو رہے تھے، دنیا کے گوشہ گوشہ میں فتون کے شعلے بھڑک رہے تھے، امور پراکندہ تھے، جنگ کے شعلہ بھڑک رہے تھے، گناہ اور جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، دھوکہ دھڑی اور حیلہ گری آشکار تھی، حیات بشر کا تناور درخت مرجھایا ہوا تھا اور اس کے سرسبز ہونے کی کوئی اُمید بھی نہ تھی، پانی کی قلت، مشعل ہدایت خاموش، گمراہی کے

....

(۱) انجیل، یوحنا باب سوم.

(۲) اظہار الحق، مصنف رحمۃ اللہ ہندی، الہدیٰ الی دین المصطفیٰ مصنف علامہ بلاغی، راہ سعات، مصنف علامہ شعرانی.

(۳) سورۂ جمعہ ۲ ۳.

پرچم لہرا رہے تھے، بشر کو بدبختیوں نے گھیر رکھا تھا، اور اپنا کریہہ چہرہ نمایاں کر دیا تھا، ایسی گمراہی و جہالت اور بداخلاقی کی وجہ سے فتنہ کے سر اٹھانے کا ہر دم خطرہ تھا، لوگوں پر ناامیدی، ڈر، اور ناامنی کے تاریک بادل چھائے ہوئے تھے، اور اپنے لئے شمشیر کے علاوہ کسی اور چیز کو پناہگاہ نہیں سمجھتے تھے۔(۱)

آنحضرت کے ظہور کے بعد بشر کے لئے خدا شناسی، حقیقت جوئی، نبوت کے سلسلہ میں جستجو

تحقیق، اور دین اسلام کی حقانیت جیسے اہم موضوعات تصور کئے جاتے رہے ہیں، ان موضوعات کے اثبات کے ساتھ نسخ وتحریف سے محفوظ قرآن کریم کی حقانیت اور اس کا کتاب الٰھی و آسمانی ہونا نیز تا قیامت بشر کے لئے ضمانت شدہ راستہ، تمام صحیح عقائد کے اثبات اور تمام احکامات کا تعارف رہتی دنیا تک کے لئے کی گئی ہے، جس کے ذریعہ تمام معارف ہستی کے مسائل کوحل کیا جا سکتا ہے۔

پیغمبر اسلام کی رسالت کا اثبات۔

جیسا کہ ہم نے ستائسیویں درس میں بیان کیا کہ کسی بھی نبی کی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے تین راستے ہیں

۔١۔ پہلا راستہ، اس نبی کی گذشتہ زندگی سے آشنائی اور حالات وقرائن سے مدد لینا۔

٢۔ دوسرا راستہ، گذشتہ نبی کی پیشینگوئی۔

٣۔ تیسرا راستہ، انبیاء علیہم السلام کا معجزہ دکھانا ہے۔

آنحضرت کی نبوت کے اثبات کے لئے یہ تینوں راستہ موجود تھے مکہ والوں نے آپ کی چالیس سالہ زندگی کو نزدیک سے مشاہدہ کیا تھا اور بخوبی اُنھیں معلوم تھا کہ آپ کی زندگی میں کوئی ضعیف پہلو نہیں ہے اور اِس حد تک آپ کو سچا اور امانتدار سمجھتے تھے، کہ آپ کو امین کے لقب سے یاد کرتے تھے، لہٰذا ایسے شخص کی طرف جھوٹ بولنے اور جھوٹے دعویٰ کرنے کی

....

(۱) نہج البلاغہ۔خطبہ ۱۸۷

نسبت نہیں دی جاتی تھی ،اس کے علاوہ گذشتہ نبیوں نے آپ کے ظہور کی بشارت دی تھی (۱) اوراہل کتاب کاایک گروہ واضح نشانیوں اور علامات کے ساتھ انتظار میں تھا۔(۲) یہاں تک کہ یہ لوگ مشرکین عرب سے کہا کرتے تھے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ایک رسول مبعوث ہونے والا ہے کہ جس کی خبر گذشتہ انبیاء علیہم السلام نے دی ہے اور وہ ادیان توحیدی کی تصدیق بھی کرے گا۔(۳) اسی وجہ سے یہودو نصاریٰ کے بعض علماء اِنھیں علامتوں کے پیش نظر آپ پر ایمان لائے (٤) اگر چہ ان میں سے بعض نے نفسانی اور شیطانی خواہشات کی وجہ سے اسلام کو قبول کرنے سے روگردانی کرلی ،قرآن کریم اس سلسلے میں فرماتا ہے:

(اَوَلَم یَکُن لَّھُم آیَۃً اَن یَعلَمَہُ عُلَمَاءُ بَنِ اِسرَائِیلَ)(۵)

کیا اُن کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ آپ کو علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں۔

جس طرح علماء بنی اسرائیل کی طرف سے آنحضرت کے سلسلہ میں خبر دینا،اور گذشتہ نبیوں کی پیشینگوئیاں، آنحضرت کی رسالت پر اہل کتاب کے لئے روشن گواہیاں تھیں اسی طرح دوسروں کے لئے گذشتہ نبیوں کی حقانیت نیز خود آنحضرت کی حقانیت پر حجت تھی،اس لئے کہ وہ لوگ ان پیشنگوئیوں کی صداقت اور علامتوں کو بخوبی مشاہدہ کرتے تھے اور اپنی عقل کی

بنیاد پر اچھی طرح تشخیص بھی دیتے تھے۔

....

(۱) سورۂ صف آیت/ ٦

(۲) سورۂ اعراف۔ آیت/ ۱۵۷، بقرہ آیت/ ۱٤٦، سورہ انعام آیت/ ۲۰

(۳) سورۂ بقرہ۔ آیت/ ۸۹

(٤) سورۂ مائدہ آیت/ ۸۳، احقاف آیت/ ۱۰

(٥) سورہ شعراء۔ آیت/ ۱۹۷

اورسب سے عجیب بات تو یہ ہے کہ آج کی توریت وانجیل میں ایسی بشارتوں کوتحریف اورمحو کردینے کی تمام سعی وکوشش کے باوجود اس میں ایسے نکات اب بھی موجود ہیں جوحق کے طلبگاروں پر حجت تمام کردیتے ہیں، جیسا کہ علما یہود ونصاریٰ میں سے ایک کثیر تعداد، انھیں نکات کے پیش نظر حق طلبی کی وجہ سے دین اسلام پر ایمان لا چکی ہے۔(۱)

اسی طرح آنحضرت نے بے شمار معجزے پیش کئے جو احادیث کی صحیح کتابوں میں تواتر کے ساتھ نیز تاریخ کے دامن میں آج محفوظ ہیں،(۲) لیکن آخری رسول اور جاودانی دین کو پہچنوانے میں عنایت الٰہی کا تقاضا یہ تھا، کہ ان معجزات کے علاوہ جو اتمام حجت کردیتے ہیں، آنحضرت کو ایک ایسا ابدی معجزہ عطا کرے کہ جو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے حجت رہے، ہاں وہ قرآن ہے، اسی وجہ سے آئندہ درس میں ہم اس کتاب کی اعجازی شان

بیان کریں گے۔

....

(۱)ان علماء میں مرزا محمد رضا (جنکا شمار تہران کے عظیم یہودی دانشمندوں میں ہوتا ہے)اور اقامۃ الشہود فی رد الیہود کے مصنف بھی ہیں، یزد کے علماء یہود میں سے حاج بابا قزوینی صاحب کتاب محضر الشہود فی رد الیہود بھی ہیں۔مسیحیوں کے مطابق اسقف پروفیسر عبد الاحد داؤد صاحب کتاب محمد در تورىت وانجیل ہیں۔

(۲)بحار الانوار ج ۲۷ ص ۲۲۵ اتک ۱۸، اور تمام حدیث و تاریخ کی کتابیں ملاحظہ فرمائیں

سوالات

۱۔سابق رسولوں کی کتابوں کا حال بیان کریں؟

۲۔توریت میں موجود تحریفوں میں سے چند تحریفوں کو ذکر کریں؟

۳۔موجودہ انجیل کے غیر معتبر ہونے کی وضاحت کریں؟

٤۔آنحضرت کی رسالت کی اہمیت کو بیان کریں؟

٥۔آنحضرت کی رسالت کو ثابت کرنے والے راستہ کو بیان کریں؟

بتیسواں درس

اعجاز قرآن

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے

قرآن کا معجزہ ہونا

اعجاز قرآن کی صورتیں

فصاحت و بلاغت

صاحب قرآن کا اُمیّ ہونا

اتفاق نظر اور عدم اختلاف

قرآن کا معجزہ ہونا۔

قرآن تنہا ایک ایسی آسمانی کتاب ہے کہ جس نے پورے دعویٰ کے ساتھ اعلان کر دیا ہے کہ کسی میں بھی اس کی مثل لانے کی طاقت نہیں ہے یہاں تک کہ تمام جن و انس اکٹھا ہو جائیں، پھر بھی وہ اس کتاب کی نظیر لانے سے ناتواں ہیں (۱) بلکہ وہ اِس جیسی کتاب تو کیا، اِس کے دس سورہ (۲) بلکہ ایک ہی سورہ یہاں تک کہ تنہا ایک سطر کا جواب لانے سے، حد درجہ ناتواں ہیں۔(۳)

اس کے علاوہ نہایت تاکید کے ساتھ تمام انسانوں کو چیلنج کرتا ہے اور اِس کتاب کے جواب نہ لانے کی قدرت کو اِس کتاب اور اس کتاب کے لانے رسول کا خدائی ہونے کی دلیل قرار دیتا ہے۔(٤)

....

(۱) سورۂ بنی اسرائیل آیت/ ۸۸

(۲) سورۂ ہود آیت/ ۱۳

(۳) سورۂ یونس/ ۳۸

(٤) سورۂ بقرہ آیت/ ۲٤۲۳

لہذا اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ خود اس کتاب نے اپنے معجزہ ہونے کی خبر دی ہے اور اسے لانے والے رسول نے اِس کتاب کے ابدی ہونے اور اپنی رسالت کی حقانیت پر جاودانی معجزہ قرار دیا ہے، بلکہ آج بھی چودہ صدیاں گذر جانے کے باوجود مختلف وسائل کے ذریعہ دوست و دشمن کے کانوں تک اس کے پیغامات پہنچ رہے ہیں اور اس طرح انسانوں پر حجت تمام ہو رہی ہے۔

اور ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ جب رسول اکرم نے اپنی رسالت کا آغاز کیا تو سب سے پہلے آپ کو اپنے سخت ترین دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا کہ جنھوں نے اُس دین کو نابود کرنے کے لئے اپنی کسی بھی کوشش سے دریغ نہیں کیا، اور جب آپ کے دشمن اپنی دھمکیوں اور طمع دلانے وغیرہ سے مایوس ہو گئے تو آپ کے قتل کے لئے کمر ہمت باندھ لی، لیکن یہ بھی خدا کی جانب سے وحی کے مطابق مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کے ذریعہ باطل ہو گیا، اور آپ نے اپنی بقیہ عمر مکہ مشرکین اور دھوکے باز یہودیوں سے جنگ میں گذار دی، اور آپ کے چراغ حیات کے گل ہوتے ہوئے آج تک داخلی اور خارجی منافقین اس نورِ الٰہی کو خاموش کرنے کے درپے ہیں جنھوں نے اُسے خاموش کرنے کے لئے اپنی کسی بھی کوشش سے دریغ نہیں کیا اور اگر قرآن جیسی کتاب لانا، ان کے بس میں ہوتا، تو وہ ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہ کرتے۔

آج جب دنیا کی ظالم طاقتوں نے اپنے جبری تسلّط کی راہ میں اسلام کوسب سے بڑے دشمن کےعنوان سے پہچان لیا ہےاوراس سے مقابلہ کے لئے اپنی پوری توانائی کے ساتھ جد و جہد شروع کردی ہے،تمام مالی، سیاسی،تبلیغاتی،علمی، امکانات کو اکٹھا کرلیا ہے اگر ان لوگوں میں اتنی بساط ہوتی کہ قرآن کی صرف ایک سطر کے ماند کوئی عبارت بنالیتے تو اپنے وسائل اور تبلیغات کے ذریعہ دنیا کے چپہ چپہ میں اُس کا اعلان کردیتے،اِس لئے کہ اسلام سے مقابلہ کے لئے یہ آسان ترین راستہ ہے۔

لہٰذا اگر انسان سمجھداراور باشعور ہوتوایسے قرائن اور حالات کو دیکھتے ہوئے مان لے گا کہ قرآن ایک لاثانی اورجاودانی کتاب ہے بلکہ کوئی فرد، یا جماعت تعلیم وتدریس، یاتمرین کے ذریعہ اس جیسی کتاب نہیں لاسکتا،یعنی یہ کتاب ایک معجزہ کی تمام خصوصیات کا (خارق عادت ہونا) الٰہی اورغیر قابل تقلید ہونا، نبوت کے دعویٰ کی حقانیت کی دلیل بننے کی مالک ہے اسی وجہ سے آنحضرت کی دعوت اور دین اسلام کی حقانیت پر دلیل قاطع ہے، اور بشر کے لئے سب سے عظیم نعمت اورکیا ہوسکتی ہے کہ اُس نے اِس کتاب کو اِس طرح نازل کیا ہے کہ تاابد معجزہ بنی رہے، نیز اپنی صداقت کی دلیل سے سرفراز رہے وہ بھی ایسی دلیل کہ جس کی دلالت کو سمجھنے کے لئےتحصیل اورت مہارت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے لئے قابل فہم ہے۔

اعجاز قرآن کی صورتیں۔

اب تک ہمیں یہ اجمالاً معلوم ہوگیا ہے کہ قرآن خدا کا کلام اور معجزہ ہے لہٰذا اِس کے بعد اُس

کے معجزہ ہونے کی صورتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

الف۔قرآن کی فصاحت و بلاغت۔

قرآن کے اعجاز کی پہلی صورت اس کی فصاحت و بلاغت ہے یعنی خداوند متعال نے اپنے مقصود کو بیان کرنے کے لئے خوبصورت اور پُرمعنی ترین الفاظ کے ذریعہ منظم اور بہترین ترکیب کے ساتھ پیش کیا ہے تاکہ معنی مقصود کو آسان اور بنحو اَحسن اپنے مخاطبین کو سمجھا سکے، لہٰذا ایسے الفاظ کا انتخاب اور انھیں بلند معانی کے لئے مناسب جملوں کی خوبصورت لڑیوں کی ترکیب صرف اُسی ذات کے بساط میں ہے کہ جو پوری طرح الفاظ کی خصوصیات، معانی کے دقائق، اور ان دونوں میں موجود رابطوں پر تسلط ہو، نیز معانی کی بلندیاں اور مقام ومحل کی رعایت کرتے ہوئے بہترین الفاظ اور عبارتوں کا انتخاب کرنے اور ایسا وسیع احاطہ، وحی اور الہام الٰہی کے بغیر کسی بھی انسان کے لئے میسر نہیں ہے۔

قرآن کا ملکوتی طرز سخن اور لاجواب لحن نیز الفاظ ومعانی کی وسعت و گہرائی، عربی زبان سے آشنا نیز فن فصاحت و بلاغت کے ماہرین کے لئے قابل درک ہے، لیکن فصاحت و بلاغت کے معجزہ ہونے کی تشخیص اُنھیں لوگوں کے بس میں ہے جو مختلف فنون میں یدطولی سے سرفراز ہوں، قرآن کے مقابلہ میں دوسری فصیح وبلیغ عبارتوں کے علاوہ اپنی توانائیوں اور مہارتوں کو آزما چکے ہوں، اور یہ کام صرف عرب کے ماہر اور زبردست شعرا کر سکتے تھے، اِس لئے کہ عربوں کے لئے سب سے بڑا ہنر شعر گوئی تھی جو آنحضرت کی بعثت کے دوران اپنے عروج پر

پہنچ چکی تھی،شعرا اپنے بہترین اشعار کو ادبی تنقیدوں کے بعد اُسے بہترین ہنر کے عنوان سے پیش کرتے تھے۔

بنیادی اعتبار سے حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ کسی بھی نبی کا معجزہ اُس زمانہ کے علم و ہنر کے تناسب و تقاضے کے مطابق ہو،تا کہ اُس زمانہ کے لوگ اُس معجزہ کے اعجاز کو علوم بشری کے مقابلہ میں درک کرسکیں،جیسا کہ امام ہادی علیہ السلام سے جب ابن سکیت ،نے سوال کیا کہ کیوں خدا نے حضرت موسی علیہ السلام کا معجزہ،ید بیضاء،اور عصا کو اژدھا میں تبدیل کر دینا، اور اِسی طرح حضرت عیسی علیہ السلام کا معجزہ،بیماروں کو شفا دینا،اور حضرت رسول اکرم کا معجزہ،قرآن کو قرار دیا؟تو آپ (علیہ السلام) نے جواب میں فرمایا،حضرت موسی علیہ السلام کے زمانہ میں رائج ہنر،سحر اور جادو تھا،اِسی وجہ سے خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ،جادو سے مشابہ قرارادیا،تا کہ وہ لوگ معجزہ جیسے عمل کی ناتوانی کو درک کرسکیں،اور حضرت عیسی علیہ السلام کے دور میں طبابت اپنے عروج پر تھی لھذا خدا نے حضرت عیسی علیہ السلام کا معجزہ لا علاج بیماروں کو شفا دینا قرار دیا،تا کہ لوگ اِس معجزہ کے اعجاز کو بخوبی درک کرسکیں، لیکن آنحضرت کے دور میں رائج ہنر سخن سرائی اور شعر گوئی تھی،لہٰذا خدا نے قرآن کو بہترین اسلوب کے ساتھ نازل کیا،تا کہ قرآن کے اعجاز کی برتری کو بخوبی درک کیا جاسکے۔(١)

....

(١)اصول کافی،ج۔١ص٢٤.

ہاں اُس دور کے زبردست ادباء جیسے، ولید بن مغیرہ مخزومی، عقبہ بن ربیعہ، اور طفیل بن عمرو، نے قرآن کی فصاحت و بلاغت اور بشر کے بہترین کلاموں پر اُس کی برتری کا اقرار اکیا(۱) یہاں تک کہ ایک صدی کے بعد ابن ابی العوجائ، ابن مقفع، ابوشاکر دیصانی، اور عبدالملک بصری، جیسے افراد نے قرآن کے مقابلہ میں زور آزمائی کرنے کی کوشش کی اور مسلسل ایک سال تک اس کا جواب لانے میں سعی وکوشش کرتے رہے لیکن وہ جواب میں ایک حرف بھی پیش نہ کرسکے، یہاں تک کہ مجبور ہوکر قرآن کی عظمت کے مقابلہ میں گھٹنے ٹیک دئے، اور جب وہ لوگ مسجد الحرام میں اپنی ایک سال کی زحمتوں کا نتیجہ جمع کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے تو اسی ہنگام امام صادق علیہ السلام ان لوگوں کے پاس سے گذرے اور اس آیت کی تلاوت فرمائی:

(قُل لَئِنِ اجتَمَعَتِ الاِ نسُ وَ الجِنُّ عَلی اَن یَتُوا بِمِثلِ هَذَا القُرآنِ لا یَتُونَ بِمِثلِهِ وَلَو کَانَ بَعضُهُم لِبَعضٍ ظَهِیراً)(۲)

اے رسول! اِن سے کہدو کہ اگر دنیا کے سارے جن وانس اس بات پر اکٹھے ہوجائے کہ اِس قرآن کا مثل لے آئیں تو اِس کا مثل نہیں لاسکتے اگر چہ اس بابت ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔

ب۔ قرآن لانے والے کا اُمیّ ہونا۔

قرآن اپنے معمولی حجم کے باوجود فردی واجتماعی احکام وقوانین نیز اسلامی معارف کا سمندر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، جنھیں جمع کرنے اور اس سلسلہ میں تحقیق کے لئے علوم وفنون میں

ماہر افراد کی ایک جماعت کی ضرورت ہے جو سالہا سال اس مسئلہ کے تحت جستجو و تحقیق کریں اورآہستہ آہستہ اِس میں موجوداسرارہ سے پردہ گشائی کریں اگرچہ اس کے تمامحقائق اوراسرار سے پردہ

....

(۱)اعلام الوریٰ ص ۲۸۲۷ سیرہ ابن ہشام ج۱ ص ۴۱۰ .

(۲)سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸۸۔ تفسیر نورالثقلین اِسی آیت کے ضمن میں رجوع کریں.

کشائی فقط انھیں لوگوں کے بساط میں ہے کہ جوعلم الٰہی کے مالک اورخدا کی جانب سے تائید شدہ ہوں قرآن میں موجود بلند معارف کے مجموعے، اخلباقی دستورات کے باارزش خزانے، عادلانہ اورمنظم قوانین، عبادتوں کے باب میں فردی واجتماعی احکامات کا حکمت کی بنیاد پر استوار ہونا، مفید ترین نصیحتیں، عبرتوں سے بھرپورداستانیں، تعلیم وتربیت کے طورطریقے، یاایک جملہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ قرآن اُن تمام اصول وقوانین پر مشتمل ہے جو انسان کی دنیوی وآخروی سعادتوں کے لئےضروری ہیں، جسے بہترین اسلوب کےساتھ اس طرح جمع کردیا ہے کہ جس سے ایک سماج کے مختلف افرادا پنی استعداد کےمطابق سمجھ سکیں۔ حقائق ومعارف کے ایسے مجموعہ کوجمع کرنا عادی انسانوں کی بساط کے باہر ہے لیکن جو چیز آنکھوں کوخیرہ کردیتی ہے وہ یہ کہ ایسی باعظمت کتاب ایک ایسے شخص کے ہاتھوں پیش کی گئی ہے جس نے نہ مکتب دیکھا، نہ قلم کو ہاتھ لگایا، بلکہ ایسے سماج میں تربیت پائی جوتمدن سے کوسوں دورتھا،اوراس سے بھی عجیب غریب بات یہ ہے کہ بعثت سے پہلے چالیس سال تک

ایسا کوئی کلام بھی اُس ذات سے سننے میں نہیں آیا، اور رسالت کے دوران جو کچھ بھی وحی کے عنوان سے پیش کیا، ایک ایسے مخصوص اسلوب وترکیب پر مشتمل تھا جو اسے دوسرے کلاموں کے درمیان ممتاز کردیتا تھا یہاں تک کہ خود وحی اور آنحضرت کے ذاتی کلام میں فرق واضح و روشن رہتا تھا۔

قرآن اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوے فرماتا ہے:

(وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَٰبٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ)(۱)

اے رسول! قرآن سے پہلے نہ توتم کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے تم لکھا کرتے تھے ایسا ہوتا تو یہ جھوٹے ضرور تمہاری نبوت میں شک کرتے۔

....

(۱) سورۂ عنکبوت۔ آیت ٤٨

اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

(قُل لَّو شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوتُهُ عَلَيكُم وَلَا أَدرَيكُم بِهِ فَقَد لَبِثتُ فِيكُم عُمُراً مِّن قَبلِهِ أَفَلَا تَعقِلُونَ)(۱)

اگر خدا چاہتا تو میں یہ کتاب تمہارے سامنے پیش نہ کرتا اور اس سے آگاہ نہ کرتا جیسا کہ اس سے پہلے تمہارے درمیان زندگی گذاری کیا تم لوگ کچھ سمجھ سکے؟

شاید قرآن میں سورہ بقرہ کی آیت (۲۳)

فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثلِهِ اسی

اعجاز کی طرف اشارہ ہو یعنی احتمال یہ ہے کہ (مثلہ) کی ضمیر (عبدنا) کی طرف پلٹ رہی ہو۔

اگر فرض محال کو ممکن مان لیا جائے کہ ہزاروں دانشمند افراد ایک دوسرے کی مدد سے ایسی کتاب کے جواب لانے میں کامیاب ہوجائیں لیکن کسی بھی صورت میں ایک مکتب میں جانے والے اوردرس نہ پڑھنے والے شخص سے ایسی کتاب کا جواب لانا غیر ممکن ہے۔

لہٰذا ایک اُمّی شخص کے ذریعہ ایسی بے نظیر خصوصیات پر مشتمل کتاب کا ظاہر ہونا قرآن کے اعجاز کے دوسرے پہلوں کی طرف ایک اشارہ ہے۔

ج۔اتفاق نظر اور عدم اختلاف۔

قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو (۲۳) سال کی مدت میں تلخ وشیریں حوادث ،نشیب و فراز سے بھر پور حالات کے باوجود اُس کے مطالب میں روانی اور اعجاز کے پہلو برقرار ہیں۔لہٰذ ظاہر و باطن، الفاظ ومعانی میں روانی قرآن کے اعجاز کی ایک دوسری صورت ہے خود قرآن میں اسی نکتہ کی طرف ایک اشارہ موجود ہے: (اَفَلَا یَتَدَبَّرُونَ القُرآنَ وَلَو کَانَ مِن عِندِ غَیرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوافِیہِ اختِلَافاً کَثِیراً) (۲) توکیا یہ لوگ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے اور یہ خیال نہیں کرتے کہ اگر خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے آیا ہوتا تو ضرور اس میں اختلاف پاتے۔

....

(۱) سورۂ یونس آیت ۱۶

(۲) سورۂ نسائ۔آیت ۸۲

وضاحت:

ہر انسان ہمیشہ دو قسم کی حالتوں سے دو چار ہوتا ہے،

پہلے یہ کہ برابر اس کی معلومات اور مہارتوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور یہ افزائش اُس کے کلام میں پوری طرح اثر انداز بھی ہوتی ہے اور طبیعی اعتبار سے بیس سال کے اندر نمایاں فرق آجاتا ہے۔

دوم: یہ کہ زندگی کے مختلف حوادث اور مختلف حالات جیسے یاس و امید، خوشی و غم اور اضطراب و آرام، احساسات و خیالات کی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں، لہٰذا اُس کے حالات کا اسطرح سے متغیر ہوتے رہنا اُس کے کلام میں شدید اختلاف اور ضد و نقیضن کا سبب بنتا ہے، دراصل رفتار و گفتار میں تبدیلی روحی حالات کے متغیر ہونے کا سبب ہوتے ہیں کہ جو خود طبیعی اور اجتماعی اوضاع و احوال کے تابع ہیں۔

اب اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ قرآن کریم آنحضرت کی اپنی لکھی ہوئی کتاب ہے تو آپ کی زندگی کے حوادث، تلخ و شیریں حالات کی وجہ سے یہ کتاب بے شمار اختلافات اور ضد و نقیضن سے پرُ ہونی چاہیے تھی لیکن ہم ایسے اختلاف کا مشاہدہ نہیں کررہے ہیں۔

لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن کے مضامین میں عدمِ اختلاف اور اتحاد کا ہونا، اُس کی فصاحت و بلاغت کا معجزہ ہے نیز اس بات کی دلیل ہے کہ اس کتاب کا سرچشمہ خداوند متعال کی ذات ہے جو بدلتے ہوئے حالات پر مسلط اور طبیعت پر حاکم ہے۔

سوالات

۱۔قرآن کس طرح اپنے معجزہ ہونے کا دعویٰ کرر ہا ہے وضاحت فرمائیں؟

۲۔اعجاز قرآن پر اجمالی دلیل کیا ہے؟

۳۔کیا یہ احتمال دیا جاسکتا ہے کہ اب تک کسی نے بھی اس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا، یا اس کا جواب لائے ہوں اور ہم اس سے بے خبر ہوں؟ کیوں؟

٤۔قرآن کی حیرت انگیز بلاغت کی تشریح کریں؟

٥۔اعجاز قرآن اور آنحضرت کے اُمّی ہونے میں کیا کوئی ربط برقرار ہے؟

٦۔قرآن میں اختلاف کا نہ ہونا کیونکر اس کے معجزہ ہونے پر دلالت کرتا ہے؟

تیتیسواں درس

قرآن کا تحریف سے محفوظ رہنا

مقدمہ

قرآن میں کسی چیز کا اضافہ نہ ہونا

قرآن سے کسی چیز کا کم نہ ہون

مقدمہ

جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کر دیا ہے کہ ضرورتِ نبوت کی دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ الٰہی پیغامات صحیح و سالم انسانوں تک پہنچیں، تا کہ اس پر عمل کرتے ہوئے انسان اپنی دنیا و آخرت کی سعادتوں تک رسائی حاصل کر سکے۔

لہٰذا قرآن کا لوگوں تک پہنچنے تک محفوظ رہنا دوسری آسمانی کتابوں کی طرح محتاج بحث نہیں ہے لیکن ہمیں یہ کہاں سے معلوم کہ دوسری آسمانی کتابیں بشر کے اختیار میں آنے کے بعد تحریفات کا شکار ہوئیں یا ایک مدت گذرنے کے بعد طاق نسیاں کا شکار ہوگئیں، جیسا کہ آج ہمارے درمیان حضرت ابراہیم و حضرت نوح علیہما السلام کی کتابوں کا کوئی اثر موجود نہیں ہے۔ اور حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی کتابیں اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں ہیں۔ لہٰذا اِن مطالب کے پیش نظر یہ سوال اُٹھتا ہے کہ آج ہمارے پاس جو آسمانی کتاب کے عنوان سے قرآن موجود ہے کیا یہ وہی کتاب ہے جو آنحضرت پر نازل ہوئی اس میں کسی بھی قسم کی کوئی تحریف، کمی و زیادتی نہیں ہوئی ہے؟

البتہ وہ لوگ کہ جنھیں اسلام اور مسلمین کی تاریخ کا تھوڑا، بہت بھی علم ہے، وہ جانتے ہیں کہ رسول اللہ اور آپ کے جانشین ائمہ علیہم السلام نے قرآن کی کتابت اور اُس کی آیات کے حفظ کرنے میں کیا اہتمام کیا ہے، یہاں تک کہ تاریخ کے مطابق تنہا ایک جنگ میں قرآن

کے حافظین میں سے ستر افراد شہید کر دئے گئے، چودہ صدیوں سے قرآن کو تواتر سے نقل کرنے اور اُس کی آیات وکلمات اور حروف کی تعداد کو شمار کرنے میں مصروف ہیں وہ اس بات سے باخبر ہیں ایسے لوگ کبھی بھی قرآن میں معمولی تحریف کا امکان بھی نہیں دے سکتے، لیکن اگر تاریخ کے ایسے قطعی قرائن سے صرف نظر کرلیا جائے تو عقلی ونقلی دلائل کے ذریعہ قرآن کے سالم رہنے کو ثابت کیا جاسکتا ہے، یعنی پہلے مرحلہ میں دلیل عقلی کی بنیاد پر قرآن میں کسی بھی چیز کے زیادہ ہونے کو ثابت کرنے کے بعد خود قرآن کی آیات کے سہارے اُس میں سے کسی بھی چیز کے کم نہ ہونے کو ثابت کیا جاسکتا ہے۔

اسی وجہ سے قرآن کے سالم رہنے کی بحث کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

قرآن میں کسی چیز کا اضافہ نہ ہونا۔

قرآن میں کسی بھی چیز کے زیادہ نہ ہونے کا مسئلہ تمام مسلمین بلکہ جہان کے تمام باخبر افراد کے نزدیک قبول شدہ ہے، بلکہ کوئی ایسا حادثہ بھی رونما نہیں ہوا کہ جس کی وجہ سے قرآن میں کسی بھی چیز کے زیادہ ہونے کا احتمال دیا جاسکے، اور اِسی اضافہ کے لئے کسی سند کا کوئی بھی وجود نہیں ہے، بلکہ عقلی دلیل کی بنیاد پر اس مسئلہ کو اس طرح باطل کیا جاسکتا ہے کہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ قرآن کے معانی میں کسی کامل معنیٰ کا اضافہ ہوا ہے تو اُس کا مطلب یہ ہوگا قرآن کا مثل یا نظیر لانا ممکن ہے، حالانکہ اعجاز قرآن اور بشر کی ناتوانی کے پیش نظر یہ امر باطل ہے، اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ تنہا ایک کلمہ یا ایک چھوٹی آیت کا صرف اضافہ ہوا ہے تو اسکا

لازمہ یہ ہے کہ نظم سخن میں خلل وارد ہوا ہے اور قرآن اپنی اعجاز آمیز شکل وصورت سے خارج ہو گیا ہے، اور اس صورت میں قابلِ تقلید اور اُس کے مثل لانے کا امکان پیدا ہو جائے گا، اس لئے کہ قرآن، آیتوں کے اعجاز آمیز نظم، کلمات وحروف کے انتخاب پر منحصر ہے، لہٰذا اُن میں خلل اور تغیر کے وارد ہوتے ہی وہ اپنی اصلی حالت سے خارج ہو جائے گا۔

لہذا جس دلیل کے ذریعہ قرآن کا اعجاز ثابت ہے اُسی دلیل کے ذریعہ قرآن کا اضافات سے محفوظ رہنا ثابت ہے، نیز اُسی دلیل کے ذریعہ کسی کلمہ یا جملہ کا کم ہونا اس کے کم ہوتے ہی حالت اعجاز کے ختم ہو جانے کی نفی کرتا ہے، لیکن قرآن سے کسی کامل سورہ کے کم نہ ہونے یا قرآن سے ایک کامل مطلب کا اس طرح سے خارج ہو جانا کہ اُس کے اعجاز میں خلل وارد نہ ہو، اس کے نہ ہونے کو ثابت کرنے کے لئے دوسرے دلائل کی ضرورت ہے۔

قرآن سے کسی چیز کا کم نہ ہونا۔

آج تک علماء اسلام خواہ سنی ہوں یا شیعہ برابر اس امر کی تاکید کرتے رہے ہیں کہ جس طرح قرآن میں کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوا اسی طرح اُس سے کچھ کم بھی نہیں ہوا ہے انھوں نے اپنے اِس مطلب کے لئے بے شمار دلیلیں پیش کی ہیں، لیکن احادیث کی کتابوں میں بعض من گھڑت حدیثوں کو نقل کرنے کی وجہ سے بعض معتبر روایتوں (۱) سے غلط مفہوم کو حاصل کرتے ہوئے بعض نے اِس مطلب کا احتمال اور بعض نے قرآن سے بعض آیات کے کم ہونے کی تائید بھی کی ہے۔

قرآن کا کسی بھی قسم کی تحریف خواہ اضافہ کے معنی میں ہو یا کم ہونے کے معنی میں۔
اس سلسلہ میں تاریخ کے قطعی قرائن ہونے کے علاوہ قرآن سے ایسے مطالب کا حذف ہوجانا جواُس کے اعجاز کوختم کردے، دلیلِ اعجاز کے ذریعہ باطل ہے بلکہ قرآن کی ایک سورہ یا ایک آیت کے حذف ہونے سے محفوظ رہنے کوخودقرآن کریم کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے۔
یعنی جب یہ امرواضح ہوگیا کہ تمام قرآن خدا کا کلام ہےاوراُس میں ایک حرف کا بھی نہیں ہوا ہے لہذا اُس کی آیات کے مفاہیم نقلی وتعبدی دلائل کے عنوان سے حجت ہیں، لہٰذا قرآن کی آیت

....

(۱) جیسے کہ وہ روایات جو آیتوں کی تفسیر یا اس کے بیان کرنے یا غلط تفسیروں اور معنوی تحریفوں کو باطل کرنے والی ہیں، جن سے یہ سمجھا گیا ہے کہ وہ قرآن کے کلمات کے حذف ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔
سے حاصل ہونے والے مفاہیم میں سے ایک مفہوم قرآن کا خدا کی جانب سے ہر قسم کی تحریف سے محفوظ رہنے کی ضمانت لینا ہے، جبکہ دوسری آسمانی کتابوں کی حفاظت خود اُسی اُمت کے حوالہ تھی (۱) یہی مفہوم سورۂ حجر کی آیت نمبر (۹) میں موجود ہے (اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِکرَ وَ اِنَّا لَہُ لَحَافِظُونَ) یہ آیت دو جملوں پر مشتمل ہے، پہلا جملہ (اِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذّکرَ) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کوخدا نے نازل کیا ہےاورنزول کے دوران اِس میں کسی بھی قسم کا کوئی تصرف بھی نہیں ہوا ہےاوردوسرا جملہ (وَ اِنَّا لَہُ لَحَافِظُونَ) اس جملہ میں نہایت تاکید

ہوئی ہے جو اِس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خدا نے اِس میں کسی بھی قسم کی تحریف نہ ہونے کی ضمانت لے رکھی ہے

یہ آیت اگر چہ قرآن میں کسی بھی قسم کے اضافہ کی نفی کر رہی ہے لیکن ایسی تحریف کے نہ ہونے پر اِس آیت سے بھی استدلال نہیں کیا جا سکتا ہے اِس لئے کہ قرآن میں کسی بھی آیت کے اضافہ کے فرض میں وہ آیت خود بھی شامل ہے، لہٰذا اِس آیت کے ذریعہ اِس فرض کو باطل کرنا صحیح نہیں ہے، اِسی وجہ سے ہم نے قرآن کے معجزہ ہونے کے ذریعہ اس فرضیہ کو باطل کیا ہے اور پھر اِسی آیت کے ذریعہ کسی آیت یا سورہ کا اس طرح سے حذف ہونا جو قرآن کے اعجاز آمیز نظم میں خلل وارد نہ کرے اس قسم کے حذف سے قرآن کے محفوظ رہنے کو بھی ثابت کر دیا ہے، پس اسطرح قرآن کا تحریف (خواہ اضافہ کے ساتھ ہو یا حذف ہونے کے ساتھ) سے محفوظ رہنا عقلی اور نقلی دلائل کی ترکیب سے ثابت ہو جاتا ہے۔

اِس بحث کے آخر میں اِس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا لازم سمجھتے ہیں کہ قرآن کا تحریف سے محفوظ رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرآن جہاں بھی ہو کتابت یا قرائت کے اعتبار سے محفوظ یا غلط تفسیر اور تحریفِ معنوی سے پوری طرح پاک ہو، یا نزول کے مطابق اس کے سورہ اور آیتیں منظم ہوں

....

(۱) جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیت نمبر (٤٤) میں علماء یہود و نصاریٰ کے سلسلہ میں فرماتا ہے۔

...بما استحفظوا من كتاب الله وكانوا عليه شهداء

، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن جس مقدار میں نازل ہوا ہے اسی طرح انسانوں کے درمیان کم و زیادتی کے بغیر موجود ہے تا کہ طالبان حقیقت اپنا مقصود حاصل کرسکیں، لہٰذا قرآن کے بعض نسخوں کا ناقص یا کتابت کے اعتبار سے غلط ہونا قرائتوں کے اختلاف یا نزول قرآن کے مطابق آیات اورسورں کا منظم نہ ہونا مختلف تفسیریں اور معنوی تحریفوں کا ہونا قرآن کا تحریف سے محفوظ رہنے کے خلاف نہیں ہے۔

سوالات

١۔قرآن کا تحریف سے محفوظ رہنے کے مسئلہ کو بیان کریں؟

٢۔تاریخی اعتبار سے قرآن کے تحریف سے محفوظ رہنے پر دلائل کیا ہیں؟

٣۔قرآن کا محفوظ رہنا کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے؟

٤۔قرآن میں زیادتی کے نہ ہونے کو ثابت کریں؟

٥۔کس دلیل کی بنیاد پر قرآن سے کچھ بھی کم نہیں ہوا ہے؟

٦۔کیا انھیں دلیلوں کے ذریعہ قرآن میں اضافہ نہ ہونے کو ثابت کیا جا سکتا ہے؟ کیوں اور کیسے؟

٧۔اس امر کی وضاحت کریں کہ قرآن کا قرائت یا کتابت کے اعتبار سے ناقص ہونا معنوی تحریفوں اور مختلف تفسیروں کا ہونا کیونکر قرآن کا کسی بھی قسم کی تحریف سے محفوظ رہنے کے مسئلہ کے خلاف نہیں ہے۔؟

چونتیسواں درس

اسلام کا جہانی اور جاودانی ہونا

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے

مقدمہ

اسلام کا جہانی ہونا

اسلام کے جہانی ہونے پر قرآن کے دلائل

اسلام کا جاودانی ہونا

چند شبہات کا حل

مقدمہ

ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا اور اُن کے پیغامات پر یقین کرنا لازم ہے، لہٰذا انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی کا انکار یا اُن کے پیغامات میں سے کسی پیغام کا منکر ہونا ربوبیت تشریعی کے انکار اور شیطان کے کفر کے مانند ہے۔

لہٰذا آنحضرت کی رسالت کے ثابت ہو جانے کے بعد آپ پر اور اُن سبھی احکام پر ایمان لانا کہ جو خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں ضروری اور واجب ہے، لیکن کسی بھی نبی اور اُس کی کتاب پر ایمان لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُس کی شریعت پر عمل کرنا بھی ضروری ہو، جیسا کہ مسلمین تمام انبیاء علیہم السلام اور اُن کی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ گذشتہ شریعتوں پر عمل نہیں کر سکتے، جس طرح سے کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا کہ ہر اُمت پر اُسی دور کے نبی کی شریعت پر عمل کرنا واجب ہے(۱) لہذا آنحضرت کی شریعت پر عمل کرنا تمام انسانوں پر اُسی وقت واجب ہوگا

کہ جب آپ کی رسالت کسی خاص قوم سے مخصوص نہ ہو اور آپ کے بعد کسی دوسرے نبی کی

بعثت نہ

....

(۱)اسی کتاب کے اتنیسویں درس کی کی طرف رجوع کیا جائے.

ہوئی ہو کہ جسکی وجہ سے شریعت اسلام کے منسوخ ہونے کا سوال پیدا ہو۔

اِسی وجہ سے اس مسئلہ پر بحث کرنا ضروری ہے، کہ کیا آنحضرت کی رسالت جہانی اور جاودانی ہے یا پھر کسی خاص قوم اور زمانے سے مخصوص ہے؟

اِس مسئلہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اِسے صرف عقلی بنیاد پر حل نہیں کیا جا سکتا، بلکہ نقلی علوم اور تاریخ میں تحقیق و جستجو کرنی ہوگی یعنی اس کو حل کرنے کے لئے معتبر اسناد کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

اور جس کے لئے قرآن کریم کی حقانیت اور آنحضرت کی نبوت و عصمت آشکار ہو چکی ہو اُس کے لئے کتاب و سنت سے زیادہ معتبر مدرک کچھ اور قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسلام کا جہانی ہونا۔

اسلام کا جہانی ہونا اور کسی خاص قوم سے مخصوص نہ ہونا اس دین کی ضروریات میں سے ہے، یہاں تک کہ وہ لوگ جو اسلام کو نہیں مانتے اُن لوگوں کو بھی بخوبی معلوم ہے کہ اسلام جہانی ہے اور کسی خاص سرزمین سے مخصوص نہیں ہے۔

اس کے علاوہ تاریخی شواہد بے شمار ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں، کہ آنحضرت نے

قیصر روم، بادشاہ ایران، مصر وحبشہ کے حاکم ،اور شامات کے فرمانروا، نیز عرب کے قبیلوں کے رئیسوں کے نام، خاص خطوط تحریر فرمائے ،اور اُنھیں اسلام کی طرف دعوت دیتے ہوئے ،اُسے قبول نہ کرنے کی صورت میں عذاب سے ڈرایا،(۱) لہذا اگر دعوت اسلام عمومی نہ ہوتی تو دوسری سرزمینوں کے بادشاہوں کے نام دعوت اسلام کے لئے خطوط روانہ نہ کرتے۔

لہٰذا کوئی بھی شخص حقانیتِ اسلام پر ایمان اور اُس کی شریعت پر عمل کرنے میں فرق کا قائل نہیں ہوسکتا، اور کوئی بھی اُس شریعت پر عمل کرنے اور اُس کی پیروی کرنے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

....

(۱) یہ خطوط تاریخ میں درج ہیں جنھیں مکاتیب الرسول نامی کتاب میں جمع کردیا گیا ہے۔

اسلام کے جہانی ہونے پر قرآنی دلائل۔

جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا کہ ایسے مطالب کو ثابت کرنے کے لئے بہترین دلیل قرآن کریم ہے کہ جس کی حقانیت اور معتبر ہونا گذشتہ دروس میں ثابت ہو چکا ہے، لہٰذا اگر کوئی ایک فرد بھی قرآن کا اجمالی مطالعہ کرے تو اسے بخوبی معلوم ہوجائے گا کہ اس کی دعوت جہانی ہے، اور کسی خاص قوم یا سرزمین سے مخصوص نہیں ہے، جیسا کہ بہت سی آیات میں (یٰأَیُّہَا النَّاسُ) اے لوگو!(۱) یا پھر (یَا بَنِی ءَادَمَ) اے اولاد آدم(۲) جیسے عناوین کے ذریعہ لوگوں کو خطاب کیا ہے، اور اپنی ہدایت کو (اَلنَّاس وَالعَالَمِینَ) تمام انسانوں (۳)(٤) کے لئے

قرار دیا ہے، اس کے علاوہ بہت سی آیات میں آنحضرت کی رسالت کوتمام انسانوں (اَلنَّاس وَ العَالَمِینَ)(٥)(٦) کے لئے مقرر کیا ہے اور ایک آیت میں اس کی دعوت کو ہر اس شخص سے مخصوص، اور شامل ہوجاتا ہے جو اس سے باخبر ہوجائے (٧) اسی طرح دوسرے مقامات پر ادیان آسمانی کے ماننے والوں کو اہل کتاب کے عنوان سے خطاب کیا ہے(٨) اور انھیں آنحضرت کی رسالت کو قبول کرنے کی طرف دعوت دی ہے، نیز آنحضرت پر قرآن کے نزول کے ھدف کا دوسرے ادیان پر اسلام کی کامیابی کو قرار دیا ہے۔(٩)

....

(١) سورۂ بقرہ۔آیت ٢١ ،نسائ۔آیت ١٧٤، فاطر آیت ١٥

(٢) سورۂ اعراف۔آیت ٢٦ ،٢٧ ،٢٨ ،٣١ ،٣٥ ،سورہ یس۔آیت ٦٠ .

(٣) سورۂ بقرہ۔١٨٥ ،١٨٧ ،سورہ آل عمران۔١٣٨ ، ابراہیم۔١ ،٥٢ ، جاثیہ۔٢٠ ،زمر۔٤١ ،نحل۔٤٤ ،کہف۔٥٤ ،حشر۔٢١ .

(٤) سورۂ انعام۔٩٠ ،یوسف۔١٠٤ ،ص۔٨٧ ،تکویر۔٢٧ ،قلم۔٥٢

(٥) سورۂ نسائ۔٧٩ ،حج۔٤٩ ،سبائ۔٢٨ (٦) سورۂ انبیائ۔١٠٧ ،فرقان۔١

(٧) انعام۔١٩ (٨) سورۂ آل عمران۔٦٥ ،٧٠ ،٧١ ،٩٨ ،٩٩ ،،،١١٠ ، مائدہ۔١٥ ،١٩

(٩) سورۂ توبہ۔٣٣ ،فتح۔٣٨ ،صف۔٩

اِن آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن کی دعوت کے عمومی ہونے اور اسلام کے جہانی ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔

اسلام کا جاودانی ہونا۔

گذشتہ آیات جس طرح عمومی کلمات بنی آدم، العالمین، الناس کے استعمال اور غیر عرب قوموں کو خطاب کرنے کے علاوہ بقیہ آسمانی ادیان کے ماننے والوں کو مخاطب کر کے اسلام کے جہانی ہونے کو ثابت کرتے ہیں، اسی طرح زمان کو مطلق قرار دیتے ہوئے کسی خاص زمانہ سے مخصوص ہونے کی نفی کرتی ہے بلکہ اس آیت کی تعبیر (لیظہرہ علی الدین)(۱) کسی بھی قسم کے شبہ کو زائل کر دیتی ہے، اسی سورۂ فصلت کی (۴۲) آیت کے ذریعہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ جس میں خدا فرماتا ہے:

(وَاِنَّهُ الکِتٰب ٭عَزِ یز لَا یَأْ تِیهِ البَاطِلُ مِن بَینِ یَدَیهِ وَلَامِن خَلفِهِ تَنزِیل مِّن حَکِیمٍ حَمِیدٍ)

اور اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ قرآن کبھی بھی مقام اعتبار سے ساقط نہیں ہوسکتا، نیز یہ آیت آنحضرت کی خاتمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کسی دوسرے نبی اور اس کی شریعت کے ذریعہ دین اسلام کے منسوخ ہونے کو بھی رد کرتی ہے، اس کے علاوہ اسی طلب کے تحت بے شمار روایتیں بھی وارد ہوئیں ہیں:

(حلال محمد حلال الی یوم القیامۃ، وحرامہ حرام الی یوم القیامۃ)(۲)

جس طرح سے اسلام جہانی ہے اسی طرح سے جاودانی بھی ہے جو دین کی ضروریات میں سے ہونے کے علاوہ کسی بھی دلیل سے بے نیاز ہے۔

....

(۲) سورۂ توبہ۔ ۳۳، فتح۔ ۳۸، صف۔ ۹

(۳) کافی، ج،۱، ص ۵۷

چند شبہات کا حل۔

اسلام کے دشمن جنھوں نے اسلام کو نابود کرنے کے لئے اپنی کسی بھی کوشش سے دریغ نہیں کیا ،اور برابر اُس سے برسر پیکار رہے، اور ہمیشہ اس کے خلاف اپنی مہم جاری رکھی، انہوں نے یہ شبہہ ظاہر کیا ہے جن کہ ذریعے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلام عربوں سے مخصوص ہے اور بقیہ انسانوں کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔

انھوں نے اپنے اعتراض کی تائید میں یہ آیت پیش کی ہے کہ جو آنحضرت کو اپنے رشتہ داروں کو اکٹھا کر کے انھیں اسلام کی طرف دعوت دینے کا حکم دیتی ہے، اسی طرح سورۂ مائدہ کی ۶۹، آیت کو بھی اپنی سند بناتے ہیں کہ جس میں خدا یہود و نصاریٰ اور صائیین کی طرف اشارہ کرنے کے بعد سعادت کے لئے ایمان کو معیار قرار دیتا ہے اور سعادت کے لئے اسلام کو قبول کرنے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا، اس کے علاوہ اسلامی فقہ میں اہل کتاب کا شمار مشرکین میں نہیں ہے بلکہ جزیہ کو ادا کرنے کے ذریعہ دامن اسلام میں ان کے مال و جان محفوظ ہیں اور وہ اپنی شریعت کے مطابق اعمال انجام دے سکتے ہیں، لہٰذا اس طرح انھیں

اجازت دینا گویا اُن ادیان کی حقانیت کو تسلیم کرنا ہے۔

اس شبہ کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ آیت جس میں آنحضرت کے رشتہ داوروں اور اہل مکہ کا تذکرہ ہے، دراصل وہ آیت آنحضرت کی دعوت کے پہلے مرحلہ کو بیان کرنے والی ہے اوراس کے بعد اہل مکہ اوراس کے اطراف میں رہنے والوں اور اسی طرح پھیلتے پھیلتے تمام انسانوں کو اپنے دائرے میں شامل کرلیتی ہے، لہٰذا ایسی آیت کو اُن آیتوں کے لئے (مخصوص کرنے والی) نہیں مان سکتے کہ جو اسلام کے جہانی ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اس لئے کہ یہ آیات عمومی طور پر لوگوں کو اپنا مخاطب بناتی ہیں اور انھیں تخصیص سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

لیکن سورۂ مائدہ کی مذکورہ آیت اِس نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ تنہا اسی دین یا فلاں دین سے منسوب ہونا سعادت حقیقی کے حصول کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ سعادت کے لئے ایمان واقعی اوران وظائف پر عمل کرنا بھی ضروری ہے جسے خدانے اپنے بندوں کے لئے مقرر فرمایا ہے اوراُن دلائل کی بنیاد پر جو اسلام کے جہانی اور جاودانی ہونے کو ثابت کرتے ہیں وہ اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ آنحضرت کے ظہور کے بعد ان قوانین پر عمل ضروری ہے جو آپ پر نازل ہوئے۔

لیکن اہل کتاب کا مشرکین کے مقابلہ میں ممتاز ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ اسلام کو قبول کرنے اوراُس کے قوانین پر عمل کرنے سے معاف کردئے گئے ہیں، بلکہ ایک دنیوی مصلحت ہے جو اُن کے لئے رکھی گئی ہے، بلکہ شیعوں کے اعتقاد کے مطابق یہ چھوٹ بھی ایک

معین مدت کے لئے ہے کہ جب امام زمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا ظہور ہوگا تو اُن سے یہ اختیار بھی چھین لیا جائے گا اوران سے بھی اسی طرح کا برتاؤ ہوگا کہ جس طرح مشرکین سے ہوا ہے، اس مطلب کو اس جملہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے (لیظہرہ علی الدین کلہ)

سوالات

۱۔ کس صورت میں تمام انسانوں پر اسلام کی پیروی کرنا واجب ہے؟

۲۔ اسلام کے جہانی اور جاودانی ہونے پر قرآنی دلائل کیا ہیں؟

۳۔ اس مطلب کے لئے ان دلائل کے علاوہ کیا کوئی اور دلائل پیش کئے جاسکتے ہیں؟

٤۔ اس امر کی وضاحت پیش کریں کہ وہ آیت جو آنحضرت کو ان کے رشتہ داروں کو دعوت اسلام کا حکم دیتی ہے کیا وہ آیت آنحضرت کی رسالت کو ان کے رشتہ داروں سے مخصوص ہونے پر دلالت کرتی ہے۔؟

٥۔ اس مطلب کی وضاحت کریں کہ کیا سورۂ مائدہ کی آیت (٦٩) دوسری امتوں کا اسلام کی پیروی سے معاف ہونے پر دلالت کرتی ہے؟

٦۔ کیا اہل کتاب کا اپنی شریعت کے مطابق عمل کرنا شریعت اسلام کے احکام کی پیروی سے معذور ہونے کی دلیل ہے؟

پینتیسواں درس

خاتمیت

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے

مقدمہ

خاتمیت پر قرآنی دلائل

خاتمیت پر روائی دلائل

ختم نبوت کا راز

چند شبہات کے جوابات

مقدمہ

۱۔دین اسلام کے جاودانی ہونے کی وجہ سے شریعت اسلام کا کسی دوسرے نبی کی بعثت سے منسوخ ہونے کا احتمال ختم ہوجاتا ہے،لیکن یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ کوئی ایسا نبی مبعوث ہو جوخوددین اسلام کی ترویج کرے اوراس کا مبلغ ہو،جیسا کہ گذشتہ انبیاءعلیہم السلام میں سے بہت سے نبی ایسی ہی ذمہ داریوں کے پابند تھے یہ انبیاءعلیہم السلام خواہ صاحب شریعت نبی کے زمانہ میں رہے ہوں جیسے جناب لوط علیہ السلام،صاحب شریعت پیغمبر جناب ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں تھےاوراُن کی شریعت کے تابع تھے،یابنی اسرائیل کے درمیان مبعوث ہونے والے اکثر انبیاءعلیہم السلام صاحب شریعت نبی کے بعدمبعوث ہوئے اور ان کی شریعت کے تابع تھے اِسی وجہ سے آنحضرت کی خاتمیت کے لئے ایک جداگانہ بحث کرنا ضروری ہے تاکہ ایسے توہمات ختم ہوجائیں۔

خاتمیت پر قرآنی دلائل۔

اسلام کے ضروریات میں سے ایک یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ آنحضرت پر تمام ہوگیا ہے یعنی (آنحضرت خاتم ہیں) اور آپ کے بعد نہ کوئی نبی مبعوث ہوا ہے اور نہ ہی آئندہ کوئی نبی مبعوث ہونے والا ہے یہاں تک کہ غیر مسلموں کو بھی معلوم ہے کہ یہ اسلام کے اعتقادات میں سے ہے اور اس پر ایمان رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے اسی وجہ سے دوسری ضروریات کی طرح اِس کے لئے استدلال کی ضرورت نہیں ہے، اس کے علاوہ اس مطلب کو قرآن اور متواتر دلیلوں کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کے قرآن کریم فرماتا ہے:

(مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ)[1]

محمد تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلک اللہ کے رسول اور خاتم النبین ہیں۔

یہ آیت واضح انداز میں آپ کے خاتم ہونے کو بیان کرتی ہے، لیکن اسلام کے دشمنوں نے اس آیت پر دو اعتراض کئے ہیں۔

(۱) پہلا اعتراض یہ ہے کہ ہم یہ مان لیتے ہیں کہ اس (کلمہ خاتم) کے وہی معنی مراد ہیں جو مشہور ہیں نیز یہ آیت سلسلہ انبیاء علیہم السلام کے ختم ہونے کی خبر بھی دے رہی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رسولوں کی بعثت کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا ہے۔

دوسرا اعترض یہ ہے کہ، بالفرض اگر ہم تسلیم کرلیں کہ مفاد آیت وہی ہے جو آپ نے بیان کیا ہے، یعنی آنحضرت سلسلہ نبوت کو ختم کرنے والے ہیں ،لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نبوت کے ساتھ، رسالت کا سلسلہ بھی ختم ہوجائے ،

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ خاتم کے معنی ختم کرنے اور تمام کرنے والے کے ہیں اور خاتم کواسی وجہ سے انگوٹھی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے کہ اس کے لگنے کے بعد تحریر مکمل ہو جاتی ہے

دوسرے اعترض کا جواب یہ ہے کہ جو بھی نمائندہ خدا مقام رسالت سے سرفراز ہو وہ مقام نبوت کا بھی مالک ہے، لہٰذا انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ کے ختم ہوتے ہی رسولوں کا سلسلہ بھی تمام

....

(۱) سورۂ احزاب۔آیت ۴۰.

ہوجاتا ہے اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا کہ (۱) اگر چہ مفہوم نبی رسول سے اعم نہیں ہے لیکن یہاں پر خود نبی رسول سے عام ہے۔

خاتمیت پر روائی دلائل۔

آنحضرت کی خاتمیت کے سلسلہ میں سیکڑوں روایات موجود ہیں جو اس بات کی وضاحت اور تاکید کرتی ہیں جیسے کہ حدیث منزلت جو آنحضرت سے نقل ہوئی ہے اُسے شیعہ اور سنی علماء نے تواتر کے ساتھ نقل کی ہیں جس کی وجہ سے اُس کی صحت اور مضمون میں کسی بھی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا اور وہ روایت یہ ہے۔

جب آنحضرت نے جنگ تبوک کے لئے مدینہ سے خارج ہونا چاہا تو حضرت علی علیہ السلام کو

مسلمانوں کی دیکھ بھال اور اُن کے امور کی انجام دھی کے لئے اپنا نائب بنا کر مدینہ چھوڑ گئے لیکن حضرت علی علیہ السلام اس فیض الٰہی سے محروم ہونے کے سبب غمگین و رنجیدہ خاطر تھے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، یہ دیکھ کر حضرت رسول اکرام نے آپ سے فرمایا۔

اَمَا تَرضَیٰ اَن تَکُونَ مِنِّی بِمَنزِلَۃِ ھَارُونَ مِن مُوسیٰ اِلَّا اَنَّہُ لَا نَبِیَّ بَعدِی(۲)

کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون علیہ السلام کو موسی علیہ السلام سے تھی؟ اور اسی جملہ کے فوراً بعد فرمایا:

(اِلَّا اَنَّہُ لَا نَبِیَّ بَعدِی)

بس فرق اتنا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا یہ جملہ آپ کی خاتمیت کے سلسلہ میں بھی ہر قسم کے شبہ کو دفع کر دیتا ہے۔

....

(۱) اس کتاب کے اتیسویں درس کی طرف رجوع کیا جائے۔

(۲) بحارا الانوار۔ ج ۳۷ ص ۲۸۹۲۵٤. صحیح بخاری۔ ج ۳ ص ٥۸. صحیح مسلم۔ ج ۲ ص ۳۲۳. سنن ابن ماجہ۔ ج ۱، ص ۲۸. مستدرک حاکم۔ ج ۳ ص ۱۰۹. مسند ابن حنبل۔ ج ۱ ص ۳۳۱ و ج ۲ ص ۳٦۹، ٤۳۷.

ایک دوسری روایت میں آپ سے نقل ہوا ہے کہ آپ فرماتے ہیں:

(اَیُّھا النَّاس اِنَّہُ لَا نَبِیَّ بَعدِی وَلَا اُمَّۃَ بَعدَ کُم):(۱)

اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں آئے گی۔

اسی طرح ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں:

(اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّہُ لَا نَبِیَّ بَعدِ وَلَا سُنَّۃَ بَعدَ سُنَّتِی)(۲)

اے لوگو میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور میری سنت کے بعد کوئی سنت نہیں ہوگی

ختم نبوت کا راز۔

جیسا کہ ہم نے اِس مطلب کی طرف گذشتہ صفحات پر بھی اشارہ کیا ہے کہ پے در پے نبیوں کے مبعوث ہونے کی حکمت ایک طرف زمین کے مختلف گوشوں میں رہنے والوں تک پیغامات الٰہی کا پہچانا اس قدر آسان نہیں تھا اور دوسری طرف اجتماعی روابط کا پھیلنے کی وجہ سے حالات کا پیچیدہ ہوجانا کہ جس کے سبب نئے آیئن اور جدید قوانین کی ضرورت تھی، اس کے علاوہ زمانہ کے گذرنے کے ساتھ افراد یا جماعتوں کے درمیان تبدیلی اور جاہلانہ دخالتوں کی وجہ سے، وجود میں آنے والی تحریفات کا تقاضا یہ تھا کہ کسی جدید نبی کی بعثت کے ذریعہ تعلیم الٰہی کو آگے بڑھایا جائے اور تحریفات کا خاتمہ ہو۔

لٰہذا جب پوری کائنات کے لئے تبلیغ رسالت الٰھی کی ذمہ داری صرف ایک رسول اور اس کے حامیوں اور جانشینوں کی مدد سے ممکن ہوجا اور اس کی شریعت کے احکام وقوانین حال و آئندہ کی احتیاجات کے جواب دینے پر قادر ہوں نیز مسائل جدید کو حل کرنے کے لئے اس شریعت میں آنی صلاحیت ہو اور اس کے علاوہ تحریف سے محفوظ رہنے کی ضمانت اُسے دی گئی، ہو تو پھر اس صورت میں کسی دوسرے پیغمبر کی بعثت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

....

(۱)وسائل اشیعہ۔ج۱ص ۱۵.خصال۔ج۱ص ۳۲۲ خصال ج۔۲ ص ٤٨٧.

(۲) وسائل الشیعہ ،ج۱۸ص ۵۵۵.من لایحضرہ الفقی ،ج ٤ ص ١٦٣.بحارالانوار، ج۲۲ ص۱ ۵۳۱.کشف الغمہ ،ج۱،ص۲۱

لیکن بشری علوم ایسے شرائط کی تشخیص سے ناتواں اور عاجز ہے، فقط خدا ہے جو اپنے لامتناھی علم کی وجہ سے ایسے زمان وشرائط کے تحقق سے باخبر ہے جیسا کہ اُس نے آخری نبی اور اُس کی کتاب کے ساتھ انجام دیا۔

لیکن سلسلہ نبوت کے ختم ہو جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان اب کوئی رابطہ نہیں رہتا، بلکہ اگر خدا چاہے تو کسی بھی وقت اپنے شائستہ بندوں کو علم غیب کے ذریعہ اضافہ کرسکتا ہے اگر چہ وحی کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو، جیسا کہ شیعوں کے عقیدے کے مطابق خدا نے ائمہ علیہم السلام کو ایسے علوم سے نوازا ہے، انشاءاللہ آئندہ دروس میں امامت سے متعلق مباحث کے سلسلہ میں بیان کریں گے۔

چند شبہات کے جوابات۔

گذشتہ بیان سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ختمِ نبوت کا راز۔

ایکً ، یہ ہے کہ آنحضرت اپنے اصحاب کی مدد سے پیغامات الٰہی کو تمام انسانوں تک پہنچا سکتے تھے

دوسرے یہ کہ،آپ کی کتاب (قرآن) کے سلسلہ میں کسی بھی قسم کی تحریف سے محفوظ رہنے

کی ضمانت لے لی گئی ہے،

تیسرے یہ کہ۔شریعت اسلام تا قیامت پیش آنے والی ضرورتوں کو پورا کرسکتی ہے۔

لیکن یہ ممکن ہے کہ ان مطالب کے پیش نظر کوئی یہ شبہ پیش کرے، جیسا کہ گذشتہ ادوار میں اجتماعی اور اقتصادی روابط کے پیچیدہ ہونے کی وجہ سے جدید احکامات یا اُن میں تغیرات کی ضرورت پڑھ جاتی تھی، یا پھر کسی دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت ہوتی تھی اسی طرح آنحضرت کے بعد بھی نمایاں تغیرات وجود میں آئے ہیں، اور اجتماعی روابط پیچیدہ ہوگئے ہیں، لہذا اس صورت میں ہمیں کہاں سے معلوم کہ آئندہ حالات کے بدلنے کی وجہ سے کسی دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت نہ پڑے؟

اس شبہ کے جواب میں ہم صرف اتنا کہیں گے کہ کس طرح کے تغیرات بنیادی قوانین کے بدل جانے کے موجب ہوتے ہیں، اس کی تشخیص بشر کے ہاتھ میں نہیں ہے اس لئے کہ ہمیں احکام وقوانین کی حکمتیں اور علتوں پر تسلط نہیں ہے بلکہ ہم نے تو اسلام کے جاودانی ہونے کے دلائل آنحضرت کی خاتمیت کے ذریعہ کشف کئے ہیں کہ اب اس کے بعد اسلام کے بنیادی قوانین کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔

البتہ ہم بعض اجتماعی مسائل کی پیدائش کا انکار نہیں کرتے کہ جن کے لئے نئے قوانین کی ضرورت ہے، لیکن اسلام نے اپنے مسائل کے قوانین کو وضع کرنے کے لئے ایسے اصول و قواعد وضع کردئے کہ جس کی مدد سے باصلاحیت افراد ضروری احکامات کو حاصل کر کے انھیں جاری کرسکتے ہیں، اور ان مطالب کی تفصیلی بحث کو فقہِ اسلام کی بحث حکومت اسلامی (امام

معصوم اور ولی فقیہ) کے اختیارات کے حصہ میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

سوالات

۱۔اسلام کے جاودانی ہونے کے اثبات کے بعد خاتمیت کے سلسلہ میں بحث کی کیا ضرورت ہے؟

۲۔قرآنی دلیل کے ذریعہ کیسے خاتمیت کو ثابت کیا جا سکتا ہے؟

۳۔اس دلیل کے سلسلہ میں موجودہ شبہات کو ذکر کریں اور ان کے جوابات تحریر فرمائیں؟

٤۔خاتمیت پر دلالت کرنے والی روایتوں میں سے تین روایت کو ذکر کریں؟

٥۔کیوں آنحضرت کی بعثت کے بعد سے انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ ختم ہو گیا؟

٦۔کیا ختمِ نبوت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد، علوم سے استفادہ کا راستہ بند ہو گیا ہے؟ کیوں؟

۷۔کیا آنحضرت کے بعد وجود میں آنے والے سماجی تغیرات کے لئے جدید شریعت کی ضرورت نہیں ہے؟ کیوں؟

۸۔جدید مسائل کے پیدا ہونے کی وجہ سے سماج کی ضرورتوں کو آئین اسلام کے ذریعہ کیسے حل کیا جا سکتا ہے۔

چھتیسواں درس

امامت

مقدمہ

مفہوم امامت

مقدمہ

حضرت رسول اکرم مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرکے، جب اِس شہر میں پہنچے تو اس شہر کے لوگوں اور وہاں بسنے والے مہاجر مسلمانوں نے بڑے زور وشور سے آپ کا استقبال کیا اسی وجہ سے اِنھیں انصار اور ہجرت کرنے والوں کو مہاجر کا نام دیا گیا، آپ نے وہاں ایک اسلامی سماج کی بنیاد ڈالی اوراس کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی، مسجد النبی محل عبادت اور تبلیغ رسالت کے علاوہ لوگوں کی تعلیم وتربیت کا مرکز ہونے کے ساتھ مہاجروں اور ناداروں کی پناہگاہ بھی تھی، وہاں پر لوگوں کی اقتصادی و معاشرتی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا تھا، اس طرح وہ جگہ محلِ قضاوت اور جھگڑوں کے حل وفصل اور جنگ کے لئے مشورہ، فوج کو میدان جنگ کی طرف حرکت دینے اوران کی مدد کرنے کا مرکز تھی غرضکہ حکومت کے تمام مسائل اِسی مسجد میں حل وفصل ہوتے تھے بلکہ لوگوں کی دنیااوران کے دین کے تمام امور آنحضرت کے ہاتھ میں تھے اورخود مسلمان بھی آپ کی اطاعت میں کوشاں رہتے تھے اس لئے کہ خدا نے آنحضرت کی اطاعت کا مطلق حکم دیا تھا(۱) بلکہ خدا

....

(۱) سورۂ آل عمران۔۲ ۱۳۲۳ نسائیٔ۔۸۰۶۹۱٤۱۲. مائدہ۔۹۲، انفعال۔٤٦٢۱. توبہ۔ ۷۱ نور۔ ٥٦٥٤٥۱. احزاب۔٦٦:۷۱ .حجرات۔ ۱٤ فتح ۔۱۷۱٦. محمد۔ ۳۳. مجادلہ۔ ۱۲ ممتحن۔۱۲ه تغابن۔۱۲ جن ۲

نے سیاسی، قضائی اور جنگی مسائل میں آنحضرت کی اطاعت کے لئے نہایت تاکید کی

تھی۔(۱)

ایک دوسری تعبیر کے مطابق آنحضرت منصب نبوت وامامت نیز تعلیم وتربیت کے فرائض اور سماج کے امور کو حل وفصل کرنے پر بھی مامور تھے،اور جس طرح اسلام وظائف عبادی، سیاسی ،اخلاقی ،اقتصادی،اورحقوقی وغیرہ سے سرفراز ہے،اسی طرح آنحضرت تعلیم وتربیت اور تبلیغ کے وظائف کو بیان کرنے کے ذمہ دار ہونے کے علاوہ قوانین الٰہی کو جاری کرنے کے عہدہ دار اور حکومتی منصب کے مالک تھے۔

اس لئے کہ یہ امر آشکار ہے کہ وہ دین جو تا قیامت تمام انسانوں کی رہبری کا دعویدار ہے وہ اُن مسائل کے مقابل میں سہل انگاری سے کام نہیں لے سکتا، اور وہ سماج جو اس دین کی بنیادوں پر قائم ہو وہ سیاسی اور حکومتی مناصب سے مبرا نہیں ہوسکتا وہ منصب جو عنوان امامت کے ضمن میں شمار کئے جاتے ہیں۔

لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ آنحضرت کے بعد کون اس مقام کا عہدہ دار وسزاوار ہے کون اُسے سنبھالے؟

کیا جس طرح خدا نے یہ منصب اپنے رسول کو عطا کیا تھا اِسی طرح کسی اور کو عطا کیا ہے؟ کیا یہ منصب صرف اِسی صورت میں قابل قبول ہے کہ جب خدا اُسے عطا کرے؟ یا پھر خدا کی جانب سے اس منصب کو عطا کرنا صرف رسول سے مخصوص تھا، اور آپ کے بعد اس منصب کی ذمہ داری کو خود عوام تعین کرے؟ کیا عوام کو ایسا کوئی حق ہے یا نہیں؟۔

اور یہی مسئلہ سنی اور شیعہ حضرات کے درمیان نقطہ اختلاف ہے، اس لئے کہ شیعوں کا عقیدہ

ہے کہ یہ منصب الٰہی خود خدا کی جانب سے باصلاحیت لوگوں کو عطا کیا جاتا ہے، لہذا آنحضرت نے خدا کی جانب سے اس امر کوانجام دیا ہے اور حضرت علی علیہ السلام کو اپنا بلا فصل خلیفہ بنادیا

....

(۱) سورۂ آل عمران۔ ۱۵۲.نسائ۔ ۴۲ ۵۹ ۶۵ ۱۰۵۶، مائدہ۔ ۴۸، حج۔ ۶۷، احزاب۔ ۳۶ .مجادلہ۔ ۹۸، .حشر۔ ۷

نیز اُن کے بعد ان کے گیارہ فرزندوں کو اِس منصب کی عہدہ داری کے لئے مقرر فرمادیا تھا، لیکن اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ امامت بھی رسالت ونبوت کے منصب کی طرح آنحضرت کی رحلت کے ساتھ تمام ہوگیا ہے، اور اِس کے بعد سے امام کا انتخاب لوگوں کے اختیار میں دے دیا گیا ہے، یہاں تک کہ بعض اہل سنت کے بزرگ علماء کا کہنا ہے کہ اگر کوئی اسلحہ کی بنیاد پر مسلط ہوجائے تو اس کی اطاعت کرنا واجب ہے۔(۱) لہذا معلوم ہے کہ یہ نظریہ جباروں اور ظالموں کے لئے ایک موقع غنیمت ہے جو اپنے زور وظلم کی بنیاد پر جس حد تک چاہیں سوء استفادکر سکتے ہیں، اوراس طرح مسلمانوں کے ضعف اوراُن کی بدبختی کا سبب بن سکتے ہیں۔

درحقیقت اہل سنت نے امامت کوخدا کی جانب سے منصوب کئے بغیر قبول کر کے دین اور سیاست میں جدائی کی بنیاد ڈالی ہے، اورشیعوں کے عقیدہ کے مطابق یہی نقطہ اختلاف اسلام کی صحیح راہ اور خدا کی عبادت سے انحراف کا باعث بنا ہے، جس کی وجہ سے آج تک بلکہ آئندہ

بھی ہزاروں نا گوار حوادث وجود میں آتے رہیں گے۔

اسی وجہ سے ہر فرد مسلمان پر واجب ہے کہ اس مسئلہ کے سلسلہ میں تعصب اور تقلید سے پرہیز کرتے ہوئے تحقیق کرے(۲)اور مذہب حق کو پہچان کر اُس کی شدت سے حمایت کرے اِس مسئلہ میں یہ امر آشکار ہے کہ جہان اسلام کی مصلحت کو پیش نظر رکھنا چاہیے، بلکہ دشمنان ا سلام کے

....

(۱)ابویعلی کی کتاب الاحکام السلطانیہ اور ابوالقاسم سمرقندی کی کتاب کا ترجمہ السواء والاعظم ص٤٠ ص٤٢ کی طرف رجوع کریں.

(۲)خدا کا شکر ہے کہ بہت بڑے بڑے دانشمندوں نے اس راہ میں بڑی تحقیق کی ہے جسے مختلف زبانوں میں مختلف انداز میں مرتب کیا ہے اور حق کے طلبگاروں کے لئے راستہ بالکل ہموار کر دیا ہے،جس میں سے عبقات الانوار، الغدیر، دلائل الصدق غایہ المرام اور اثبات الھدا، کا نام لیا جا سکتا ہے،لیکن وہ لوگ کہ جن کے پاس فرصت نہیں ہے وہ لوگ کتاب المراجعات کا مطالعہ کریں جو سنی اور شیعہ عالموں کے درمیان مکاتبات پر مشتمل ہے،اور اسی طرح اصل الشیعہ واصولھا کا مطالعہ کریں،ان دونوں کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

لئے دو مذہبوں کے اختلافات اور تفرقہ سے فائدہ اٹھنے کا موقع نہیں دینا چاہئے، اور کسی بھی صورت میں کوئی بھی ایسا عمل انجام نہیں دینا چاہیے جو مسلمانوں میں اختلاف کا باعث بنے، نیز کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کا اتحاد باقی رہ جائے، اس لئے کہ اس تفرقہ کا نقصان تمام

مسلمانوں کو اٹھانا ہوگا اور مسلمانوں کے معاشرہ کے ضعیف ہونے کے علاوہ اُس سے کوئی اور نتیجہ ظاہر نہیں ہوسکتا، لیکن اس طرح مسلمانوں کے درمیان حفظ وحدت کی خاطر مذہب حق کی شناخت کا راستہ بند نہیں ہونا چاہیئے تا کہ مسائلِ امامت کے سلسلہ میں طالبانِ حق تحقیق سے محروم نہ ہوسکیں، اس لئے کہ حق وحقیقت کو پالینا مسلمانوں کی دنیوی اوراخروی سعادت کا باعث ہے۔

مفہوم امامت۔

امامت لغت میں رہبری کے معنیٰ میں ہے چنانچہ جوبھی راہ حق میں یا راہ باطل میں کسی گروہ کی رہبری کرے اسے امام کہا جاتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں کفار کے لئے کلمہ أَئِمَّةَ الْكُفْرِ (۱) استعمال ہوا ہے اورنمازی جس شخص کی اقتدا کرتے ہیں اسے امام جماعت کہا جاتا ہے۔

لیکن علم کلام میں امامت یعنی دینی اور دنیوی امور میں سماجِ اسلامی پر ریاست عام، اِس تعریف میں دنیوی امور کا شامل کرنا دائرہ امامت کی وسعت کی بنا پر ہے وگرنہ سماج اسلامی کے دنیوی امور کی تدبیر دین اسلام کا ایک جزء ہے۔

مذہب تشیع کے لحاظ سے ایسی حکمرانی اسی وقت صحیح ہوگی کہ جب خداوند عالم کی طرف سے عطا ہوئی ہو اور اصالتہً یا، نیابتہً ایسے مقام کا مالک وہی ہوسکتا ہے جو احکامِ اسلامی کو بیان کرنے میں خطاؤں سے معصوم اور گناہوں سے دور ہو، بلکہ امام کے لئے نبوت ورسالت کے علاوہ تمام الٰہی منصبوں پر فائز ہونا ضروری ہے تا کہ، قوانین احکام اور معارف اسلامی کے سلسلہ

میں اس کے بیانات حجت ہوں اور حکومتی پیمانہ پر اُس کے قوانین واجب الاطاعۃ قرار پائیں۔

....

(۱) سورۂ توبہ۔ آیت۔ ۱۲

اس بیان کے لحاظ سے شیعہ اور سنی حضرات کے درمیانِ موضوع امامت کے تحت اختلاف تین چیزوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔اول یہ کہ امام خدا کی جانب سے منصوب ہونا چاہئے۔

۲۔دوم یہ کہ علوم الٰہی کا مالک اور اس کا خطاؤں سے محفوظ و مصوٴن ہونا ضروری ہے۔

۳۔سوم یہ کہ گناہوں سے معصوم ہونا بھی ضروری ہے۔

البتہ معصوم ہونا امامت کے مساوی نہیں ہے، اس لئے کہ شیعوں کے اعتقاد کے مطابق حضرت زہرا بھی معصوم تھیں، اگرچہ مقام امامت کی مالک نہیں تھیں، جیسا کہ حضرت مریم بھی مقام عصمت پر فائز تھیں اور شاید اولیاء الٰہی کے درمیان اور بھی افراد موجود ہوں جو عصمت درجہ پر فائز ہوں کہ جن کی ہمیں کوئی اطلاع نہ ہو، بلکہ بنیادی اعتبار سے معصوم شخص کا پہچاننا خدا کی جانب سے اطلاع کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

سوالات

۱۔آنحضرت منصب نبوت و رسالت پر فائز ہونے کے علاوہ اور کن مناصب پر فائز تھے؟

۲۔شیعہ اور سنی حضرات کے درمیان نقطہ اختلاف کیا ہے؟

۳۔نصب الٰہی کے بغیر امامت کو قبول کر لینے کی وجہ سے کیسے نتائج سامنے آسکتے ہیں؟

٤۔امامت کے لغوی اور اصطلاحی معنی کیا ہیں؟

٥۔امامت کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟

سینتیسواں درس

امام علیہ السلام کی احتیاج

مقدمہ

وجود امام علیہ السلام کی ضرورت

مقدمہ

وہ لوگ جو اعتقادی مسائل میں گہری فکر کے مالک نہیں ہیں، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ شیعوں اورسنیوں کے درمیان اختلاف صرف یہ ہے کہ شیعہ حضرات معتقد ہیں کہ آنحضرت نے اپنے بعد امام علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا لیکن سنی حضرات معتقد ہیں کہ آنحضرت نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا تھا، بلکہ پہلے مرحلہ میں خود لوگوں نے جانشین مقرر کیا، اور دوسرے مرحلہ میں اُسی جانشین نے اپنے لئے دوسرے جانشین کا انتخاب کیا، اور تیسرے مرحلہ میں جانشین کا انتخاب چھ لوگوں پر مشتمل شوری کو سونپ دیا گیا تھا، اور خلیفہ چہارم کو پھر خود لوگوں نے انتخاب کیا، لہٰذا مسلمانوں کے درمیان خلیفہ کی تعیین کے لئے کوئی روش نہیں ہے اسی وجہ سے خلیفہ چھارم کے بعد جس کے پاس بھی فوجی طاقت تھی وہ خلیفہ بن بیٹھا، جیسا کہ آج غیر مسلمان ممالک میں ہوتا ہے۔

یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق شیعہ حضرات خلیفہ اول کی تعیین کے سلسلہ میں اسی روش کے قائل ہیں جو خلیفہ دوم کو معین کرنے کے لئے اپنائی گئی تھی، صرف فرق اتنا ہے کہ وہاں آنحضرت کی بات کو لوگوں نے نہیں مانا، لیکن خلیفہ دوم کے سلسلہ میں خلیفہ اول کی بات سب نے مان لی۔

لیکن ہم یہاں پر اِن سوالات سے صرف نظر کرتے ہیں کہ۔

۱۔ خلیفہ اول کو خلیفہ دوم کی تعیین کا حق کس نے دیا؟ اور کیوں رسول اللہ نے (اہل تسنن کے

اعتقاد کے مطابق) خلیفہ کی تعیین میں اسلام کا خیال نہیں رکھا، اور کیوں ایک مسلمان سماج کو سر پرست کے بغیر تنہا چھوڑ دیا، حالانکہ آپ جب بھی مدینہ سے خارج ہوتے تھے اپنے لئے کوئی جانشین مقرر فرما دیتے تھے، اس کے علاوہ خود آنحضرت اپنے بعد سر اٹھانے والے فتنوں سے با خبر تھے، اس طرح کے سوالات سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ سنی اور شیعہ حضرات کے درمیان اختلاف، کیا یہ ہے کہ امامت ایک دینی مقام اور ایک الٰہی منصب ہے کہ وہ جسے چاہے منصوب کرے یا پھر ایک دنیوی سلطنت اور اجتماعی عوامل کے تابع ہے؟

اور شیعوں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت اپنے جانشین کو معین کرنے میں مستقل نہیں تھے، بلکہ آپ نے اُسے خدا کے فرمان کے مطابق انجام دیا ہے دراصل ختم نبوت کی حکمت امام معصوم علیہ السلام کو معین کرنے سے مربوط ہے جس کے ذریعہ آنحضرت کے بعد اسلامی سماج کی مشکلات حل ہوسکتی ہیں۔

اس مطلب سے یہ نکتہ واضح ہوجاتا ہے کہ کیوں شیعوں کے نزدیک فرعی ہونے کے بدلے امامت ایک اصل اعتقادی ہے اور کیوں وہ لوگ ان شرائط (علم خدادادی) عصمت (خدا کا منصوب کرنا) کو امام میں ہونا ضروری سمجھتے ہیں؟ اور کیوں شیعہ اعتقاد مفاہیم احکام الٰہی کی شناخت اور اسلامی سماج پر فرمارداوئی جیسے مفاہیم اس طرح سے ملے ہوئے ہیں، کہ گویا اِن تمام مفاہیم پر مفہوم امامت چھایا ہوا ہے لہٰذا ہم یہاں پر مفہوم امامت اور عقائد تشیع کے درمیان اس عقیدہ کی موقعیت اور اس کی حجت کے سلسلہ میں بحث کرتے ہیں۔

وجود امام علیہ السلام کی ضرورت۔

بائیسویں درس میں یہ نکتہ روشن ہوگیا تھا کہ خلقتِ انسان کا ہدف اسی وقت کامل ہوسکتا ہے کہ جب وحی کے ذریعہ اُس کی ہدایت کی جائے اور حکمتِ الٰہی کا تقاضا تھا کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے پیغمبروں کو مبعوث کرے تا کہ وہ انسانوں کو دنیا و آخرت میں سعادتمندی کا درس دے سکیں، نیز انسانوں کو درجۂ کمال تک تربیت کریں، اور اگر ممکن ہو تو سماج میں احکامِ الٰہی کو جاری کریں۔

اور چونتیسویں اور پینتیسویں درس میں اس امر کو روشن کر دیا گیا ہے کہ دینِ اسلام، جاودانی، ابدی اور نسخ نہ ہونے والا دین ہے، اور آنحضرت کے بعد کسی نبی کی بعثت واقع نہیں ہوسکتی، اور ختمِ نبوت بعثت انبیاء علیہم السلام کی حکمت سے اُسی وقت سازگار ہے کہ جب آخری شریعت تمام انسانوں کی ضروریات کو پورا کر سکے، اور تا قیامت اس کی بقا کی ضمانت ہو۔

یہ ضمانت قرآن میں موجود ہے اور خدا نے اس کتاب کو کسی بھی قسم کی تحریف سے محفوظ رکھنے کی ضمانت لی ہے، لیکن قرآن کی آیات سے تمام احکامات آشکار نہیں ہیں، نماز کی رکعات کی تعداد اور اُسے انجام دینے کی کیفیت اس طرح اور بھی بہت سے مستحبّات ہیں کہ جن کی کیفیتوں کو قرآن نے بیان نہیں کیا، اس کے علاوہ خود قرآن نے بھی احکامات کی تفاصیل بیان نہیں کی ہے، بلکہ یہ کام آنحضرت کے سپرد تھا، تا کہ جو علم خدا نے (وحی کے علاوہ) آپ کو عطا فرمایا تھا، اس کی مدد سے تشریح فرماتے (۱) اِسی وجہ سے آنحضرت کی نسبت کا شمار اسلام

کو پہچاننے والے اصلی منابع میں سے ہوتا ہے۔

لیکن آپ کی زندگی کی دشواریاں، جیسے شعب ابی طالب کے تین سال، اوردس سال دشمنان اسلام سے جنگ کے دوران، آپ کو اجازت نہیں دی، کہ تمام احکامات الہی کی تفصیلوں

....

(۱) سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۵۱، آل عمران۔ ١٦٤. جمعہ۔ ۲، نحل ۔٦٦ ٦٤. احزاب ۔۲۱ حشر۔۷

کو بیان کرتے ، اور جو کچھ اصحاب نے آپ سے معلوم کیا تھا، اس کا بھی سالم رہ جانا خطرے سے خالی نہیں تھا، یہاں تک کہ وضو کا مسئلہ جو آج تک اختلاف کا شکار ہے اُسے آنحضرت نے مسلمانوں کے درمیان سالہا انجام دیا تھا، لہذا جب احکام عملی کا یہ حال ہے، جبکہ یہ احکام ہمیشہ لوگوں کی نظروں کے سامنے اوراُن کی ضروریات میں سے ہیں، جس میں تحریف آسان نہیں ہے، تو پھر پیچیدہ اور سخت ترین احکامات خصوصاً وہ احکامات جو دنیا پرستوں اور ہوسرانوں کے مخالف ہیں ان میں تحریف کے امکانات کہیں زیادہ موجود ہیں (۱)

ان نکات کے پیش نظر یہ امر آشکار ہوجاتا ہے کہ دین اسلام اُسی وقت دین کامل اور تا قیامت تمام انسانوں کی ضروریات پورا کرنے والا بن سکتا ہے کہ جب اُس میں اُن ضروری مصلحتوں کو پورا کرنے والے اسباب موجود ہوں وہ مصلحتیں کہ جو آنحضرت کی رحلت کے بعد خطرات کا شکار ہوئیں، اور یہ مشکل آنحضرت کی طرف جانشین کے معین کئے بغیر حل نہیں ہوسکتی تھی، اور جانشین بھی ایسا ہو جو علوم الٰہی سے آراستہ اور احکامات کو اِس طرح بیان کرے، جس طرح

وہ نازل ہوئے ہیں، نیز عصمت کی صفت سے مزین بھی ہو، تا کہ نفسانی اور شیطانی حملات کا شکار نہ ہو اور دین میں جان بوجھ کر کوئی تحریف نہ کرے، اس کے علاوہ آنحضرت کی طرح لوگوں کی تربیت کر سکے اور انھیں کمال کی آخری منازل تک رہنمائی کر سکے اور اگر شرائط جمع ہو جائیں حکومت کی باگ ڈور سنبھال کر احکام الٰہی کو جاری کرے اور جہان میں حق و عدالت کو قائم کرے۔

نتیجہ: ختمِ نبوت اُسی وقت حکمت الٰہی سے سازگار ہو سکتی ہے کہ جب اُسے امام معصوم کے نصب سے مربوط کیا جائے جو نبوت و رسالت کے علاوہ آنحضرت کے تمام صفات سے متصف ہو۔

....

(۱) علامہ امینی نے الغدیر میں سات سو احادیث گھڑنے والوں کے نام ذکر کئے ہیں کہ جن میں سے بعض کی طرف ایک لاکھ احادیث کے گھڑنے کی نسبت دی گئی ہے (الغدیر ج ۵ ص ۲۰۸)

اس طرح وجودِ امام کی ضرورت بھی ثابت ہو جاتی ہے اور علوم الٰہی سے آراستہ ہونے کے علاوہ مقامِ عصمت پر فائز ہونے کی ضرورت بھی، نیز امام کا خدا کے فرمان کے مطابق منصوب ہونا بھی صرف اِس لئے ہے کہ اُسے معلوم ہے کہ کہاں منصب امامت کو قرار دے بلکہ وہی بندوں کی ولایت کا مالک ہے اور اس میں اتنی استطاعت ہے کہ وہ اِس منصب کو با صلاحیت لوگوں کو عطا کر دے۔

اس مقام پر اس نکتہ کی طرف توجہ دینا ضروری ہے کہ اہل سنت امام کی بیان کی گئی خصوصیات میں سے کسی بھی خصوصیت کے قائل نہیں ہیں، اور نہ ہی انھیں اس بات کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا اور رسول کی طرف سے منصوب ہوئے ہیں، نیز مقام عصمت پر فائز ہونے اور علوم الٰہی سے آراستہ ہونا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ اُنھوں نے اپنی کتابوں میں اُن کی خطاؤں اور لوگوں کے سوالات کے مقابل میں عاجزی کو تحریر بھی کیا ہے، جیسا کہ انھوں نے خلیفہ اول کے لئے نقل کیا ہے کہ (انّ ل شیطان یعتر ین) اور خلیفہ دوم کی نسبت نقل کیا ہے کہ اس نے خلیفہ اول سے بیعت کو ایک بے تدبیر امر کا نام دیا(۱) اور بار ہا اپنی زبان سے اس جملہ کی تکرار کی (لولا علیؑ لہلک عمر)(۲) خلیفہ سوم (۳) اور خلفاء بنی عباس اور بنی امیہ کی خطائیں اس قدر آشکار ہیں کہ انھیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جو بھی تاریخِ خلفاء سے معمولی آشنائی رکھتا ہوا سے بخوبی ان خطاؤں کا علم ہے جو انھوں نے انجام دی ہیں۔

سنیوں کے مقابلہ میں صرف شیعہ حضرات ان شرائط کا بارہ اماموں میں ہونا ضروری سمجھتے ہیں، مذکورہ وضاحت کے ذریعہ امامت کے سلسلہ میں شیعوں کے عقیدہ کی صحت آشکار ہوجاتی ہے، جسے ثابت کرنے کے لئے مفصل دلائل کی ضرورت نہیں ہے اس کے باوجود ہم اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے آئندہ دروس میں کتاب وسنت سے سہارا لیں گے۔

....

۱۔شرح نھج البلاغہ، ج۱،ص ۱۴۲، ۱۵۸، ج، ۳، ص ۵۷

۲۔الغدیر، ج ۶، ص ۹۳ کے بعد،

۳۔الغدیر ۸،ص ۹۷ کے بعد

سوالات

۱۔مسئلہ امامت میں شیعوں کا نظریہ اوراس مسئلہ میں اہل سنت سے اختلاف کو بیان کریں؟

۲۔کیوں شیعہ حضرات امامت کو(اصل اعتقاد)کے عنوان سے معتبر جانتے ہیں؟

۳۔وجودِامام علیہ السلام کی ضرورت کو بیان کریں؟

٤۔مذکورہ بیانات سے کیا نتائج حاصل ہوتے ہیں؟

اڑتیسواں درس

منصب امام

منصب امام

گذشتہ درس میں ہم نے وضاحت کر دی ہے کہ ختم نبوت کا سلسلہ،امام معصوم علیہ السلام کو منصوب کئے بغیر حکمت الٰہی کے خلاف ہے،اور جہانی و جاودانی اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ

آنحضرت کے بعد اُس کے لئے شائستہ جانشین معین کئے جائیں، جو نبوت و رسالت کے علاوہ تمام مناصب الٰہی سے سرفراز ہو۔

اس مطلب کو قرآنی آیات اور سنی وشیعہ تفاسیر میں موجودہ روایات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔جیسا کہ قرآن میں سورۂ مائدہ کی تیسری آیت میں خدا فرماتا ہے:

(اَلیَومَ اَکمَلتُ لَکُم دِینَکُم وَ اَتمَمتُ عَلَیکُم نِعمَتِی وَ رَضِیتُ لَکُمُ الاِسلَامَ دیناً)

میں نے آج تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے دینِ اسلام سے راضی ہو گیا۔

یہ آیت تمام مفسرین کے قول کے مطابق حجۃ الوداع کے بعد آنحضرت کی رحلت کے چند ماہ پہلے نازل ہوئی، جس میں اسلام کا آسیب پذیری سے محفوظ رہ جانے کی وجہ سے کفار کی نااُمیدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ آج میں نے تمہارے دین کو کامل اور اپنی نعمتوں کو تم پر تمام کر دیا اور ان روایات کی روشنی میں جو اِس آیت کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اکمال و اتمام، کفار کی ناامیدی سے مربوط اور آنحضرت کی طرف سے حکم خداوندی کے مطابق جانشین کے انتخاب کے ذریعہ متحقق ہو جاتا ہے، اس لئے کہ کفار اِس خیال خام میں تھے کہ آنحضرت کی وفات کے بعد چونکہ آپ کا کوئی فرزند نہیں تھا، لٰہذا اسلام بے سرپرست اور سرگردان ہو جائے گا، لیکن جانشین کے انتخاب کے ذریعہ دین کامل ہو گیا اور کافروں کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا (۱)

دین کے اکمال کی داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب رسول اکرم حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر

مدینہ کی جانب لوٹے تو غدیر خم کے مقام پر تمام مسلمانوں کو جمع کیا اور ایک مفصل خطبہ دینے کے بعد آنحضرت نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے سوال کیا (اَلَستُ اَولیٰ بِکُم مِن اَنفُسِکُم)(۲) کیا میں خدا کی جانب سے تمہارا ولی نہیں ہوں، سب نے مل کر، ہاں کہا، یہ جواب سن کر آنحضرت نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر فرمایا مَن کُنتُ مَولاہُ فَعَلیّ مَولاہُ. اور اس طرح آپ نے حضرت علی علیہ السلام کی ولایت کا اعلان فرمادیا، اور پھر حاضرین نے آپ کی بیعت کی نیز خلیفہ دوم نے بیعت کرنے کے ضمن میں حضرت علی کو ان الفاظ میں تہنیت پیش کی

(بَخٍ بَخٍ لَکَ یَا عَلیّ اَصبَحتَ مولایٰ وَ مولیٰ کُل مُومِن وَ مُؤمِنَۃٍ)(۳)

اُس روز یہ آیت نازل ہوئی

(اَلیَومَ اَکمَلتُ لَکُم دَینَکُم وَ اَتمَمتُ عَلَیکُم نِعمَتِی وَ رَضِیتُ لَکُم الِاسلَامَ دِینا)

آنحضرت ﷺ نے تکبیر کہی اور فرمایا:

(تَمَامُ نبُوَّتِی وَ تَمَامُ دِینِ اللہِ ولایۃُ علیٍّ بَعدِی)

....

(۱) اس آیت کے سلسلہ میں مزید وضاحت کے لئے تفسیر المیز ان میں مراجعہ کریں

(۲) یہاں سورۂ احزاب۔آیت ۶ النبی اولی بالمومنین من انفسہم کی طرف اشارہ ہے

(۳) اس حدیث کی دلالت اور سند کے قطعی ہونے کو ثابت کرنے لئے عبقات الانوار اور الغدیر کی طرف رجوع کیا جائے۔

اور ایک روایت میں آیا ہے کہ جسے بعض اہل سنت کے بزرگ علماء نے نقل کیا ہے کہ ابوبکر اور عمر اپنی جگہ سے بلند ہوئے اور آنحضرت سے سوال کیا، کہ کیا یہ ولایت صرف حضرت علی علیہ السلام سے مخصوص ہے؟ تو آنحضرت نے جواب میں فرمایا: ہاں یہ وصایت علی علیہ اسلام اور میرے اوصیاء سے تا روز قیامت مخصوص ہے، تو انھوں نے پھر سوال کیا کہ آپ کے اوصیاء کون لوگ ہیں تو آپ نے فرمایا:

(عَلِي آخِي وَ وَزِيرِي وَ وَارِثِي وَ وَصِي وَ خَلِيفَتِي فِي أُمَّتِي وَ وَلِيُّ كُلّ مومن مِن بَعدِي ثُمَّ اِبنِي الحَسن ثُمَّ اِبنِي الحسين ثُمَّ تِسعَةُ مِن وُلدِ اِبنِي الحُسين واحداً بَعدَ واحدٍ القرآن مَعَهُم وَ هُم مَعَ القُرآنِ لَا يُفارِقُهُم وُ لَا يُفَارِقُهُم حَتَّى يَرِدوا عَلَيَّ الحَوض)(۱)

ان روایات کی روشنی میں جو مطلب سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت حجۃ الوداع سے پہلے اس امر کے لئے مامور کردئے گئے تھے لیکن آپ کو اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں لوگ آپ کی جانشینی کو آپ کے شخصی و نجی نظریہ پر حمل نہ کریں، اور اسے قبول کرنے سے انکار کردیں، اِسی وجہ سے آنحضرت موقع کی تلاش میں تھے تا کہ اس امر کا اعلان کردیں، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی

(يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغ مَا أُنزِلَ اليكَ مِن رَبِّك وَإِن لَم تَفعَل فَمَا بَلَّغتَ رِسَالَتَهُ وَ اللَّهُ يَعصِمُكَ مِنَ النَّاسِ).(۲)

اے رسول جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا جا چکا ہے اُسے پہنچا دو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو گو یا تم نے میری رسالت کا کوئی کام نہیں کیا اور تم ڈرو نہیں خدا تمہیں لوگوں

کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

....

(۱)غایۃالمرام۔باب ۵۸ حدیث ٤ جسے فرائد حموینی نے نقل کیا ہے.

(۲)سورۂ مائدہ۔٦٧ اورتفسیرالمیز ان کی طرف مراجعہ کیا جائے.

آیت میں اِس امر کو لوگوں تک پہنچانے کی تاکید اس حد تک ہے کہ اگر یہ حکم انجام نہیں پایا تو گویا تبلیغ رسالت کے انجام نہ دینے کے برابر ہے،آنحضرت کو خوشخبری دیتا ہے کہ اِس پیغام کے بُرے نتائج سے محفوظ رکھے گا، یہ آیت جیسے ہی نازل ہوئی، آپ کو معلوم ہوگیا، کہ اس پیغام کا لوگوں تک پہنچانے کا وقت آگیا ہے اور اِس سے زیادہ تاخیر جائز نہیں ہے، اسی وجہ سے غدیر خم میں حضرت علی علیہ السلام کی جانشینی کا اعلان کر دیا۔(۱)

اگر چہ وہی دن اِس پیغام کو لوگوں تک پہنچانے اور لوگوں سے بیعت لینے سے مخصوص تھا، وگرنہ آنحضرت نے اپنے دوران حیات میں مختلف مقامات پر مختلف انداز میں حضرت علی کی جانشینی کو، لوگوں کے گوش گذار کرایا تھا بلکہ بعثت کے پہلے ہی سال جب آیہ، وَاَنذِر عَشِیرَتَکَ الاَقرِبِینَ .(۲) نازل ہوئی ،تو آپ نے اس وقت فرمایا: جو شخص سب سے پہلے میری دعوت کو قبول کرے گا اور میری مدد کرے گا، وہ میرے بعد میرا جانشین وخلیفہ ہوگا، اور فریقین کا اس بات پر اتفاق ہے،جس شخص نے سب سے پہلے اعلان نصرت کیا حضرت علی علیہ السلام تھے(۳) اسی طرح جب آیہ (یَا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسولَ واُولی الامرمنکم)(٤) نازل ہوئی، اوراس آیت نے اولوالامر کی اطاعت کو مطلق اوراُسے اطاعت

رسول کے برابر قرار دیا تو جابر بن عبداللہ انصاری نے آپ سے سوال کیا کہ یہ اولوالامر کون ہیں کہ جن کی اطاعت کا آپ کی اطاعت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے؟! تو آپ نے جواب میں فرمایا:

(هم خلفائی یا جابر و ائمةُ المسلمینَ مِن بَعدِی، اَوَّلُهُم علیٌّ ابن ابی طالب، ثُمَّ الحسن، ثُمَّ الحسین، ثُمَّ علی بن الحسین ثم محمد بن علی المعروف بالتوراة

....

(۱) اس موضوع کو اہل سنت نے سات صحابیوں سے نقل کیا ہے، زید بن ارقم، ابوسعید خدری، ابن عباس، جابر بن عبداللہ انصاری، براء بن عازب، ابو ہریرہ، ابن مسعود، الغدیر ج۱ ص ۳

(۲) سورۂ شعراء۲۱٤.

(۳) عبقات النوار، الغدیر، المراجعات.

(٤) سورہ نساء آیت ۵۹

بالباقر، سَتُدرِکُهُ یا جابر، فاذا لَقیتَهُ فاقرَأهُ منّی السلام، ثُمَّ الصادق جعفر بن محمد، ثّم موسیٰ بن جعفر، ثم علی بن موسیٰ، ثم محمد بن علی، ثم علی بن محمد، ثم الحسن بن علی، ثم سمیّی وَ کنیّی حجة الله فی ارضه بقیته فی عباده ابن الحسن بن علی)(۱)

آنحضرت کی پیشینگوئی کے مطابق جابر بن عبداللہ انصاری امام باقر علیہ السلام کے زمانہ تک با حیات رہے اور آنحصر ت کے سلام کو پہنچایا،

ایک دوسری حدیث میں ابوبصیر سے، اس طرح منقول ہے کہ ابوبصیر نے آیت اولوا الامر کے سلسلہ میں امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا، تو آپ نے جواب میں فرمایا: یہ آیت حضرت علی، امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے، تو میں نے دوبارہ عرض کیا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو پھر قرآن میں حضرت علی علیہ السلام اور اُن کے اہلبیت علیہم السلام کے اسماء کیوں نہیں ذکر کئے؟ تو آپ (علیہ السلام) نے فرمایا: تم جا کر اُن لوگوں سے کہہ دو کہ جب نماز کے لئے آیت نازل ہوئی، تو اس میں چار رکعت یا تین رکعت کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا یہ وضاحت آنحضرت نے بیان فرمائی تھی، اسی طرح آپ علیہ السلام نے حج وزکات کے سلسلہ میں آیات کی تفصیل بیان فرمائی لہٰذا آنحضرت نے اُن آیتوں کی طرح اِس آیت کی بھی تفصیل بیان فرمائی جو اِس طرح ہے: (مَن کنت مولاہ فعلی مولاہ) (اوصیکم بکتاب اللہ واہل بیتی فانی سئلت اللہ عزوجلّ ان لا یُفَرِّقَ بینھما حتی یُورِدہما علیّ الحوض فاعطانیہ ذلک) یعنی میں تمہیں کتاب خدا اور اپنے اہل بیت کے ساتھ ساتھ رہنے کی وصیت کرتا ہوں، میں نے خدا کی بارگاہ میں درخواست کی ہے کہ ان دونوں میں اس وقت تک جدائی نہ ڈالے کہ جب تک یہ دونوں حوض کوثر پر میرے پاس نہ پہنچ جائیں، اور خدا نے میری درخواست قبول کر لی، اور اِسی طرح ایک دوسری روایت میں ارشاد فرمایا:

(۱) غایۃ المرام، ج ۱۰، ص ۲٦۷ اور اثبات الھداۃ، ج ۳، ص ۱۲۳، و، ینابیع المودۃ، ص ٤۹٤

(لا تعلموهم فانهم اعلم منکم انهم لن یخرجو کم من باب هدی ومن یدخلو کم فی باب ضلالۃ)(۱)

یعنی انھیں تعلیم دینے کی کوشش نہ کرو کیوں کہ وہ تم سے زیادہ جاننے والے ہیں، جو ہرگز تمہیں باب ہدایت سے خارج اور چاہ ضلالت میں داخل نہیں کر سکتے.

اسی طرح بارہا اس مطلب کی طرف اشارہ فرمایا یہاں تک کہ اپنی حیات کے آخری ایام میں بھی فرمایا:

(اِنِّی تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقلینِ کتابَ اللهِ وَ اَهلِ بَیتِی اِنَّهُمَا لَن یَفتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیّ الحَوض)(۲)

اورفرمایا

(الان ان مثل اهل بیتی فیکم مثل سفینة نوح من رکبها نجا ومن تخلف عنها غرق)(۳)

اس کےعلاوہ حضرت علی علیہ السلام کو بارہا مخاطب کر کےفرمایا:

(اَنتَ وَلِیُّ کُلِّ مُومِنٍ بَعدِی)(۴)

ایسی سیکڑوں احادیث ہیں کہ جن کی طرف اشارکرنے کی یہاں پرگنجائش نہیں (۵)

....

(۱) غایۃ المرام (طبع قدیم) ج۲ ص ۵۶۲.

(۲) یہ روایت بھی متواترات میں سے ہے، جسے ترمذی، نسائی، صاحب مستدرک نے مختلف طرق سے نقل کی ہے.

(۳) مستدرک حاکم۔ج ۳ ص ۱۵۱.

(٤) مستدرک حاکم۔ج ۳ ص ٤ ۱۱۱۱۳.صواعق ابن حجر۔ص ۱۰۳.مسند ابن حنبل۔ج ۱ ص ۳۳۱ ج ٤ ص ۸ ۳ ٤ ۳ و...... .

(٥) کمال الدین وتمام النعمۃ ،بحارالانوار.

سوالات

۱۔قرآن کی کون سی آیت حضرت علیہ السلام کی جانشینی پر دلالت کرتی ہے؟اوراس کی دلالت کو بیان کریں؟

۲۔حضرت علی علیہ السلام کے منصب امامت پر فائز ہونے کی تفصیلات بیان کریں؟

۳۔کیوں آنحضرت حضرت علی علیہ السلام کی جانشینی کے پیغام کو پہنچانے میں تاخیر سے کام لیتے تھے؟اور پھر کیسے اس امر کوانجام دینے کے لئے کمرہمت باندھ لی؟

٤۔کون سی روایتیں تمام ائمہ علیہم السلام کی امامت پر دلالت کرتی ہیں؟

۵ ۔ان تمام روایتوں کو بیان کریں کہ جو اہل بیت علیہم السلام کی امامت پر دلالت کرتی ہیں؟

انتالیسواں درس

عصمت اور علم امام

مقدمہ

عصمت امام

علم امام

مقدمہ

جیسا کہ ہم نے گذشتہ درس میں بیان کر دیا کہ اہل تشیع اور اہل تسنن کے درمیان موضوع امامت کے تحت صرف تین مسئلوں میں اختلاف ہے

۱۔ پہلے یہ کہ امام کا تعینو انتخاب، خدا کی جانب سے ہو۔

۲۔ دوسرے یہ کہ امام ملکۂ عصمت سے آراستہ ہو۔

۳۔ تیسرے یہ کہ علم لدنی کا مالک ہو، اور سینتیسویں درس میں عقلی دلائل کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کر دیا ہے اور اڑتیسویں درس میں ائمہ علیہم السلام کا خدا کی جانب سے منصوب ہونے کو بیان کر دیا اور اب اس درس میں عصمت اور علم خدادادی کے سلسلہ میں بحث کرتے ہیں۔

عصمت امام۔

منصب امامت کا الٰہی ہونا اور حضرت علی علیہ السلام اور آپ کی اولاد کا خدا کی جانب سے منصب امامت پر فائز ہونے کے اثبات کے بعد ائمہ اطہار علیہم السلام کی عصمت کو اِس آیت کے ذریعہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔

لَا ینالُ عَھدِ الظَالِمِینَ(۱)

یعنی منصب امام صرف انھیں حضرات کے لئے سزاوار ہے جو گناہوں سے آلودہ نہ ہوں۔

اس کے علاوہ آیہ اولوا الامر (۲) جو امام کی اطاعت کو مطلق قرار دیتی ہے اور امام کی اطاعت کو آنحضرت کی اطاعت کے مساوی قرار دیتی ہے، اُس کے ذریعہ بھی ائمہ علیہم السلام کی عصمت

کو ثابت کیا جا سکتا ہے کیونکہ کسی بھی صورت میں امام کی اطاعت کو اطاعت خدا کے خلاف قرار نہیں دیا جا سکتا لہٰذا اولوا الامر یعنی امام کی مطلق اطاعت کا حکم دینا اس کے معصوم ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

اسی طرح ائمہ اطہار علیہم السلام کی عصمت کو آیہ تطہیر سے بھی ان کا معصوم ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے:

(إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجسَ أَهلَ البَيتِ وَيُطَهِّرَكُم تَطهِيراً)(۳)

اے اھل بیت! (رسول) خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو (ہر طرح کی) برائی سے دور رکھے اور جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے ایسا پاک و پاکیزہ رکھے۔

بندوں کی تطہیر کا ارادۂ تشریعی، کسی خاص فرد سے مخصوص نہیں ہے، لیکن اہل بیت علیہم السلام کی طہارت کے سلسلہ میں خدا کا ارادہ، ارادۂ تکوینی ہے کہ جس میں اراد کا ارادہ کرنے والے (خدا) سے تخلف ممکن نہیں ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

(إِنَّمَا أَمرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيئاً أَن يَقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ).(۴)

پس تطہیر مطلق اور کسی بھی قسم کی نجاست اور پلیدی سے دوری عین عصمت ہے اور ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی فرقہ آنحضرت کے اہل بیت علیہم السلام کی عصمت کا قائل

....

(۱) سورۂ بقرہ آیت ۱۲۴.

(۲) سورہ نسا۔ آیت ۵۹

(۳) سورۂ احزاب آیت ۳۳

(٤) سورۂ یس ۸۲.

نہیں ہے فقط شیعہ فرقہ ہے جو حضرت زہراء علیہا السلام اور بارہ اماموں کی عصمت کا قائل ہے۔(۱)

اس مقام پر اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا لازم ہے کہ اس آیت کے سلسلہ میں وہ روایتیں جو نقل ہوئیں ہیں، ان میں سے اکثر کو اہل سنت کے علماء نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، جو اِس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیت، خمسہ طیبہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔(۲)

شیخ صدوق حضرت علی علیہ السلام سے نقل فرماتے ہیں کہ رسول خدا فرمایا: اے علی! یہ آیت تمہارے اور حسن و حسین علیہم السلام اور تمہاری نسل سے ہونے والے اماموں کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے، میں نے سوال کیا کہ آپ کے بعد کتنے امام ہوں گے تو آپ نے فرمایا: اے علی! تم ہوگے پھر حسن اور پھر حسین اور حسین کے بعد علی بن الحسین اس کے بعد محمد بن علی اس کے بعد جعفر بن محمد اس کے بعد موسیٰ بن جعفر اس کے بعد علی بن موسیٰ اس کے بعد محمد بن علی اس کے بعد علی بن محمد اس کے بعد حسن بن علی اور پھر حسن کے فرزند حجت خدا امام ہوں گے۔

اس کے بعد فرمایا: کہ یہ اسماء اسی ترتیب سے ساحت عرش پر لکھے ہوئے ہیں، اور جب میں نے ان اسماء کو دیکھا تو خدا سے سوال کیا کہ یہ اسماء کس کے ہیں! تو خدا نے فرمایا: اے محمد یہ تمہارے بعد ہونے والے امام ہیں کہ جنھیں پاک قرار دیا گیا ہے اور وہ معصوم ہیں نیز ان کے دشمنوں پر بے شمار لعنت کی گئی ہے۔(۳)

ان آیتوں کے علاوہ حدیث ثقلین جس میں آنحضرت نے ائمہ اطہار علیہم السلام کو قرآن کے مساوی قرار دیا ہے اور تاکید فرمائی ہے کہ یہ دونوں کسی بھی حال میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے ، جو ائمہ معصومین علیہم السلام کی عصمت پر ایک روشن دلیل ہے، اس لئے کہ ایک معمولی خطا کا بھولے سے بھی سرزد ہو جانا قرآن عملی مفارقت کا سبب ہوگا۔

....

(۱) مزید وضاحت کے لے تفسیر المیز ان اور کتاب الامامۃ والولایۃ فی القرآن. کی طرف رجوع کیا جائے

(۲) غایۃ المرام ص۔ ۲۹۳۲۸۷.

(۳) غایۃ المرام (طقدیم)۔ ج،٦۔ ص ۲۹۳

علم امام۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے ائمہ اطہار علیہم السلام لوگوں کے مقابلہ میں علمی اعتبار سے بہت بلند مقامات کے حامل تھے جیسا کہ نحضرت نے فرمایا:

(لَا تُعَلِّمُوهُم فَاِنَّهُم اَعلَمُ مِنكُم)

انھیں تعلیم نہ دو اس لئے کہ وہ تم لوگوں سے کہیں زیادہ جاننے والے ہیں (۱)

مخصوصاً حضرت علی علیہ السلام جو بچپنے سے رسول اللہ کے سائے میں رہے اور آپ کی آخری سانسوں تک آپ کے علوم سے مستفید ہوتے رہے، جیسا کہ رسول اللہ نے خود فرمایا:

(اَنَا مَدِینَۃُ العِلمِ وَ عَلِیٌّ بَابُهَا) (۲)

میں علم کا شہر ہوں اور حضرت علی علیہ السلام اُس کا دروازہ ہیں۔

اس کے علاوہ خود امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

(اِنَّ رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ عَلَّمَنِ اَلفَ بَابٍ وَ کُلُّ بَابٍ یَفتَحُ اَلفَ بَابٍ فَذٰلِکَ اَلفَ اَلفَ بَاب حَتّٰی عَلِمتُ مَا کَانَ وَ مَا یَکُونُ اِلٰی یَومِ القِیَامَۃِ وَ عَلِمتُ عِلمَ المَنَایَا وَ البَلَایَا وَ فَصلَ الخِطَابِ) (۳)

....

(۱) غایۃ المرام۔ ص، ۲٦۵ اصول کافی۔ ج۱ ص ۲۹٤

(۲) مستدرک حاکم۔ ج ۳ ص ۲۲٦ قابل توجہ نکتہ تو یہ ہے کہ ایک سنی عالم نے ایک کتاب بنام فتح الملک العلی بصحۃ حدیث مدینۃ العلم علی نے لکھی جو ۱۳۵٤ میں قاہرہ میں چھپی ہے

(۳) ینابیع المودہ۔ ص ۸۸ اصول کافی۔ ج۱ ص، ۲۹٦

یعنی رسول اللہ نے مجھے علم کے ہزار باب سکھائے اور میں نے ہر باب سے ہزار ہزار باب کھولے جو مجموعاً ہزار ہزار باب (دس لاکھ باب) ہوجاتے ہیں یہاں تک کہ جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے اُن سب سے میں باخبر ہوگیا، اموات و آفات کے اسرار کا میں عالم اور عدل کے ساتھ حکم کرنا کا مالک ہوں۔

لیکن علوم آل محمد صرف اُن علوم پر منحصر نہیں ہے کہ جسے واسطہ کے ساتھ یا واسطہ کے بغیر انھوں نے آنحضرت سے حاصل کیا، بلکہ ائمہ اطہار علیہ السلام غیر عادی علوم سے بھی سرفراز تھے جس سے بصورتِ الہام باخبر ہوجاتے تھے(۱) بالکل اسی طرح کہ جیسے جناب خضر، جناب

ذوالقرنین، (۲) حضرت مریم اور جناب موسیٰ کی والدہ پر افاضہ ہوا کرتا تھا (۳) جن میں سے بعض کو قرآن نے وحی سے تعبیر کیا ہے لیکن یہاں وحی سے مراد وحی نبوت نہیں ہے، اسی وجہ سے بعض ائمہ علیہم السلام بچپنے میں مقام امامت پر فائز اور دوسروں سے تعلیم حاصل کرنے سے بے نیاز ہوتے تھے۔

یہ مطلب ان روایتوں کے ذریعہ ثابت ہے جو خود ائمہ اطہار علیہم السلام سے نقل ہوئیں ہیں جن کی حجیت آپ لوگوں کی عصمت سے ثابت ہے، لیکن ان میں سے بعض کو بطور نمونہ پیش کرنے سے پہلے قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ ضروری ہے جس میں بعض افراد کو ومن عندہ علم الکتاب (٤) کے عنوان سے آنحضرت کی حقانیت پر بہ طور شاھد پیش کیا گیا ہے، اور وہ آیت یہ ہے

(قُل كَفَى بِاللهِ شَهِيداً بَينِ وَبَينَكُم وَمَن عِندَهُ عِلمُ الكِتَابِ)(٥)

آپ کہہ دیں کہ خدا میرے اور تمہارے درمیان شہادت اور گواہی دینے کے لئے کافی ہے اسی طرح وہ لوگ بھی کافی ہیں کہ جن کے پاس علم الکتاب ہے۔

....

(۱) اصول کافی۔ کتاب الحجہ۔ ٢٧٠٢٦٤

(۲) اصول کافی۔ ج۱، ص ٢٦٨

(۳) سورۂ کہف۔ ٩٨٦٥ آل عمران۔ ٤٢، مریم ٢١١٧ طٰہ۔ ٣٨ قصص۔ ٧

(٤) سورۂ رعد۔ ٤٣

(۵) سورۂ رعد۔ ۴۳

پس اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ شخص جس کی گواہی خدا کی گواہی کے برابر ہو، اور علم الکتاب سے آراستہ ہو، وہ کمالات کے عظیم درجات پر فائز ہوگا۔

ایک دوسری آیت میں اسی شاہد کی طرف اشارہ کیا ہے:

)فَمَن كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِن رَبِّهِ وَ يَتلُوهُ شَاهِد مِّنهُ)(۱)

تو کیا جو شخص اپنے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل پر ہو اور اس کے پیچھے ہی پیچھے انہی کا ایک گواہ ہو

اس آیت میں (مِنہُ) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ شاہد رسول اللہ کے خاندان اور آپ کے اہل بیت سے ہے، اہل تشیع و تسنن کی طرف سے نقل ہونے والی روایتوں کے مطابق اس شاہد سے مراد علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔

منجملہ ابن مغازلی شافعی نے عبداللہ بن عطا سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا کہ میں ایک روز امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں تھا کہ عبداللہ بن سلام (آنحضرت کے دور میں اہل کتاب کے بزرگ علماء میں سے تھے) کے فرزند ہمارے سامنے سے گذرے تو میں نے امام علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا ومن عندہ علم الکتاب. سے مراد اس شخص کے والد ہیں؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا نہیں، بلکہ اس سے مراد حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہیں، اور آیہ

(وَيَتلُوهُ شَاهِد مِنه) اور آیہ (اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُولُهُ وَ الَّذِينَ آمَنُوا) (۲)

(اے ایماندارو) تمارے مالک وسرپرست بس یہی ہیں۔ خدا اس کا رسول اور وہ مومنین جو

پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام ہی کی شان میں نازل ہوئی ہے اسی طرح بہت سی روایتوں کے مطابق جو شیعہ اور سنی اسناد کے (۳) مطابق وارد ہوئی ہیں، سورۂ ہود میں شاہد سے مراد علی ابن ابی طالب ہیں،

....

(۱) سورۂ ہود۔آیت/ ۱۷

(۲) سورۂ مائدہ۔آیت/ ۵۵

(۳) غایۃ المرام (ط قدیم) ۳۶۱.۳۵۹

لہٰذا منہ سے مراد امام علی علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

علم الکتاب کے حامل ہونے کی اہمیت اُس وقت آشکار ہوگی کہ جب ہم جناب سلیمان علیہ السلام کے حضور میں تخت بلقیس کے حاضر کرنے کی داستان کا مطالعہ کریں:

(وَقَالَ الَّذِی عِندَہُ عِلمٌ مِنَ الکِتَابِ أَنَا آتِیکَ بِہِ قَبلَ ان یَرتَدَّ اِلَیکَ طَرفُکَ)(۱)

یعنی جس کے پاس کتاب کا ایک مختصر علم تھا اس نے کہا کہ میں تخت بلقیس کو آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے یہاں حاضر کروں گا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ علم الکتاب کے ایک حصہ سے باخبر ہونا ایسے حیرت انگیز امور کا باعث ہے، پس تمام علم الکتاب سے متصف ہونا کیسے عظیم اثرات کیرونما ہونے کا سبب ہوسکتا ہے، یہی وہ نکتہ ہے جسے امام صادق علیہ السلام نے جناب سدیر سے نقل ہونے والی

روایت میں فرمایا ہے، سدیر کہتے ہیں کہ میں،، ابو بصیر، یحییٰ بزاز اور داوٗد بن کثیر جو امام صادق علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر تھے کہ حضرت بڑے غضب کے عالم میں وارد مجلس ہوئے فرمایا: کہ مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے کہ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارے پاس علم غیب ہے، حالانکہ خدا کے علاوہ کوئی بھی علم غیب سے واقف نہیں ہے میں اپنی کنیز کو تنبیہ کرنا چاہتا تھا کہ وہ فرار ہوگئی جبکہ مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کس حجرہ میں مخفی ہے۔(۲)

....

(۱) سورۂ نمل۔آیت ٤٠

(۲) اس حدیث کے لب ولہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نے یہ باتیں نامحرموں سے کہی ہیں، اور یہ نکتہ معلوم رہے کہ وہ علم غیب جو خدا سے مخصوص ہے اس سے مراد وہ علم ہے جسے حاصل کرنے کے لئے تعلیم کی ضرورت نہ ہو جیسا کہ امام علی علیہ السلام نے سائل کے سوال کے (کیا آپ علم غیب کے مالک ہیں) کے جواب میں فرمایا کہ انما ہم تعلم من ذی علم وگرنہ انبیاء اور اولیاء الٰہی وحی اور الہام کے ذریعہ علوم غیبی سے واقف تھے، مادر حضرت موسیٰ کے لئے خدا کی جانب سے الہام انھیں مقامات میں سے ایک ہے کہ جس کے لئے شک نہیں کیا جاسکتا۔

انا رادہ الیك و جاعلوہ من المرسلین قصص ،،.

سدیر کہتے ہیں: جب امام علیہ السلام اپنے گھر کی طرف جانے کے لئے کھڑے ہوئے تو میں بھی ابو بصیر اور میسر کے ساتھ آنحضرت کے ہمراہ ہولیا اور راستہ میں میں نے حضرت علیہ

السلام سے عرض کی کہ ہم آپ پر قربان جائیں آپ نے جو کچھ اپنی کنیز کے سلسلہ میں فرمایا، اسے ہم نے تسلیم کیا اور ہم اس کے بھی معتقد ہیں کہ آپ بے شمار علوم کے مالک ہیں نیز کبھی بھی آپ کے سلسلہ میں علم غیب کا دعوی نہیں کرتے۔

امام علیہ السلام نے فرمایا کہ اے سدیر! کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا میں نے عرض کی کہ کیوں نہیں،، تو آپ نے فرمایا کہ کیا اِس آیت کی تلاوت نہیں کی ہے:

(قَالَ الذِّی عِندَہُ عِلم مِن الکِتَابِ اَنَا آتِیكَ بِهِ قَبلَ اَن یَرتَدَّ اَلِیكَ طَرفُكَ)

وہ شخص (آصف بن برخیا) جس کے پاس کتاب خدا کا کچھ علم تھا بولا کہ میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس کو آپ کے پاس حاضر کردوں گا۔

تو میں نے کہا کہ ضرور تلاوت کی ہے، پھر امام علیہ السلام نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ شخص کتاب میں سے کس قدر علم کا مالک تھا؟ تو میں نے کہا کہ آپ ہی فرمائیں، پھر امام علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک عظیم سمندر سے صرف ایک قطرہ کے برابر، اس کے بعد فرمایا کہ کیا اس آیت کی تلاوت کی ہے؟

(قل کفی باللہ شهیداً بین و بینکم ومَن عندہ علم الکتاب)

میں نے کہا کہ ضرور تلاوت کی ہے، تو امام علیہ السلام نے فرمایا کہ بتاؤ وہ شخص افضل ہے جو تمام کتاب کے علم سے واقف ہے یا وہ شخص جو صرف کتاب کا ایک حصہ جانتا ہے؟ تو میں نے جواب میں عرض کیا کہ جس کے پاس تمام کتاب کا علم ہے، اس کے بعد امام علیہ السلام نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا خدا کی قسم تمام کتاب کا علم ہمارے پاس ہے(۱) اب اس کے بعد اہل بیت علیہم السلام کے علوم کو بیان کرنے والی روایتوں کی طرف اشارہ کرتے

ہیں۔

....

(۱) اصول کافی۔ج ۱ ص ۲۰۷ (طبع دار الکتب الاسلامیہ).

امام رضا علیہ السلام، امامت کے سلسلہ میں ایک مفصل حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں:
جب خدا کسی کو لوگوں کے لئے منتخب کرتا ہے تو اسے سعہ صدر عطا کرتا ہے اور اس کے دل میں حکمت کے چشمے جاری اور اُسے علم کی دولت سے آراستہ کر دیتا ہے تا کہ وہ سوالات کے جوابات دے سکے، اور حق کو پہچاننے میں سرگردان نہ ہو، چنانچہ ایسا شخص معصوم، خدا کی طرف سے تائید شدہ اور خطاؤں سے محفوظ ہوتا ہے۔

دراصل خدا، اِس لئے اس کو یہ خصلتیں عطا کرتا ہے تا کہ اس کے ذریعہ سے اپنے بندوں پر حجت تمام کر سکے لھذا یہ ایک عطیہ ہے جسے خدا پسند کرتا ہے اُسے عطاء کرتا ہے

اسکے بعد فرمایا کیا عوام میں اتنی استطاعت ہے کہ وہ ایسے شخص کو پہچان کر اسے منتخب کر لیں، اور جب وہ کسی کا انتخاب کرتے ہیں تو کیا وہ شخص ایسی صفات کا مالک ہوتا ہے؟!(۱)

حسن بن یحییٰ مدائنی امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام علیہ السلام سے سوال کیا کہ جب امام سے کوئی سوال کیا جاتا ہے تو وہ کس طرح جواب دیتے ہیں تو آپ (علیہ السلام) نے میں فرمایا: کبھی اُس پر الہام ہوتا ہے اور کبھی فرشتہ سے سنتا ہے اور کبھی دونوں ایک ساتھ (۲) واقع ہوتا ہے۔

ایک دوسری روایت میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ وہ امام جسے معلوم نہ ہو کہ اس پر

کیسی مصیبت آنے والی ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا تو وہ بندوں پر خدا کی حجت نہیں ہوسکتا۔(۳)

ایک دوسری روایت میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب بھی امام کسی چیز کے متعلق جاننا چاہتا ہے تو خدا اُس سے باخبر کردیتا ہے۔(٤)

....

(۱)اصول کافی۔ج۱ص۱۹۸۔۲۰۳.

(۲)بحارالانوار۔ج۲۶ص۵۸.

(۳)اصول کافی۔ج۱ص۱۵۸.

(٤)اصول کافی۔ج۱ص۲۵۸.

اسی طرح آپ کی جانب سے نقل ہونے والی متعدد روایتوں میں آیا ہے کہ روح، جبرئیل و میکائیل سے عظیم تر مخلوق ہے جو رسول اللہ کے پاس تھی، اُن کے بعد ائمہ علیہم السلام کی طرف منتقل ہوگئی جن سے ان کی مدد ہوتی ہے۔(۱)

....

(۱)اصول کافی ج۱ص۲۷۳.

سوالات

۱۔امام علیہ السلام کی عصمت کو کن آیتوں کے ذریعہ ثابت کیا جا سکتا ہے؟

۲۔کون سی روایت امام علیہ السلام کی عصمت پر دلالت کرتی ہے؟

۳۔ائمہ علیہم السلام کن راہوں سے علوم کو حاصل کرتے ہیں؟

٤۔گذشتہ ادوار میں کون لوگ ایسے علم کے مالک تھے؟

٥۔کون سی آیت علم امامت پر دلالت کرتی ہے اس کی وضاحت کریں؟

٦۔علم الکتاب کی اہمیت بیان کریں؟

۷۔علوم ائمہ علیہم السلام سے مربوط چند روایتوں کو پیش کریں؟

چالیسواں درس

حضرت مہدی (عج)

مقدمہ

جہانی حکومت الٰہی

وعدہ الٰہی

چند روایتیں

غَیبت اور اُس کا راز

مقدمہ

گذشتہ بحث کے ضمن میں ہم نے اُن روایتوں کو بیان ہے کیا جس میں ائمہ علیہم السلام کے

اسماء درج تھے،لیکن ان روایتوں کے علاوہ دوسری بہت سی روایتیں ہیں جنھیں شیعہ اور سنی علماء نے آنحضرت سے نقل کی ہیں ،جس میں یا تو ائمہ اطہار علیہم السلام کی تعداد کا تذکرہ ہے یا بعض روایتوں میں ان حضرات کا قریش سے ہونے کی طرف اشارہ ہے یا بعض روایتوں میں ان کی تعداد کو نقباء بنی اسرائیل کی تعداد کے مطابق ہونے کا اشارہ ہے، اسی طرح بعض روایتوں میں وارد ہوا ہے کہ ان میں نو امام، امام حسین علیہ السلام کے صلب سے ہوں گے، اور بعض روایتوں میں جنھیں شیعہ اور سنی علماء نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے ان میں ان کے اسماء مبارک درج ہیں (۱) اور انھیں تمام ائمہ علیہم السلام کے ہونے کی طرف اشارہ موجود ہے جنھیں ہم یہاں بیان کرنے سے قاصر ہیں (۲)

بلکہ اس درس کو امام حجت مہدی بن حسن علیہ السلام سے مخصوص کرتے ہیں، اور اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف مہم نکات کی طرف اشارہ کریں گے۔

(۱) منتخب الاثر فی الامام الثانی عشر، طبع سوم۔ ص۔ ۱۲۱۰.

(۲) بحار الانوار، غایۃ المرام، اثبات الھداۃ وغیرہ.

جہانی حکومت الٰہی۔

ہمیں یہ نکتہ اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ہدف لوگوں کو رشد تکا

مل (بہ تدریج کمال تک پہونچانے) کے راستہ پر گامزن کرنا تھا ، اور یہ ھدف وحی الٰھیکو لوگوں کی دست رس میں قرار دینے ہی کے ذریعہ متحقق ہوسکتا ہے، اِس ہدف کے علاوہ اُن کے اور دوسرے اہداف بھی تھے جیسے لوگوں کی عقلوں اور اُن میں بااستعداد حضرات کی روحی اور معنوی اعتبار سے تربیت کرنا وغیرہ۔

یعنی، انبیاءعلیہم السلام، خدا پرستی، عدل و داد کی حکومت، اور الٰہی آرزوؤں کے مطابق ایک اچھے اور ہدایت یافتہ سماج کو قائم کرنا چاہتے تھے، لہٰذا اُن میں سے ہر ایک نے اپنے اہداف کے حصول کے لئے قدم اٹھائے بلکہ ان میں سے بعض حکومت الٰہی کو قائم کرنے میں کامیاب بھی ہوئے، لیکن اُن میں سے کسی کے لئے بھی جہانی حکومت قائم کرنے کے شرائط مہیا نہ ہوسکے۔

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اُن کی تعلیمات ناقص، یا اُن کی رہبری میں نقص تھا، یا ہدف الٰہی محقق نہ ہوسکا، اس لئے کہ اُن کا ہدف تو صرف یہ تھا کہ انسانوں کے مختار ہوتے ہوئے کمال کی جانب حرکت کے لئے شرائط فراہم کئے جائیں۔

(لِئَلاَّ یَکُونَ لِلنَّاسِ عَلَی اللَّہِ حُجَّۃ بَعدَ الرُّسُلِ)(۱)

تا کہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کی خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہ جائے۔

یعنی لوگوں پر دین حق اور الٰہی پیغمبروں کو ماننے کے لئے کوئی جبر نہیں ہے، اور یہ ہدف حاصل ہو چکا ہے۔

....

(۱) سورۂ نسائ۔ آیت ۱٦٥

لیکن پھر بھی خدا نے اپنی کتابوں میں پوری زمین پر حکومت الٰہی کے بر پا ہونے کی خوشخبری دی ہے جسے دین حق کے قبول کرنے کے لئے شرائط کے فراہم ہونے کی پیشنگوئی کا نام دیا جا سکتا ہے، جو باعظمت جماعتوں اور افراد کے علاوہ غیبی مدد کے ذریع حکومت جہانی کی راہ میں موجود رکاوٹوں کو برطرف کرکے عدل و انصاف کی حکومت قائم ہوگی، ستمگروں سے نالاں معاشرے اور مختلف مذاہب وحکمرانوں سے عاجز سماج کونجات ملے گی اس ہدف کوآنحضرت کی بعثت اور دین جاودانی کا انتہائی ہدف مانا جاسکتا ہے جیسا کہ خداوندے عالم فرماتا ہے

(لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ)(۱)

تاکہ اس کوتمام دینوں پر غالب کرے

چونکہ امامت، نبوت کو کامل کرنے والی اور حکمت خاتمیت کومحقق کرنے والی ہے لہٰذا اِس سے یہ نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ یہ ہدف آخری امام علیہ السلام کے ہاتھوں پورا ہوگا، اور یہ وہی مطلب ہے کہ جس کی طرف اُن روایتوں میں تاکید کی گئی ہے کہ جوامام زمانہ (عج) اوراحنالہ الفداہ کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔

اب اِس کے بعد اُس حکومت جہانی کے سلسلہ میں بشارت دینے والی آیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اُس کے بعد اِسی ضمن میں موجود روایتوں کا تذکرہ کریں گے۔

....

(۱) سورۂ توبہ۔ آیت ۳۳ سورہ فتح۔ آیت ۲۸ سورہ صف۔ آیت ۹،

بحارالانوار۔ج٥١ ص٠ ٥ ج٢٢ ص٦٠، ج٥٨ ص٩

وعدۂالٰہی۔

خداوندعالم قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ ہم نے توریت وانجیل میں یہ بشارت دیدی ہے کہ زمین کےوارث صالح افراد ہوں گے۔

(وَلَقَد كَتَبنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعدِ الذِّكرِ اَنَّ الاَرضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ)(١)

اورہم نے یقیناً زبور میں لکھ دیا تھا کہ روئے زمین کےوارث ہمارے نیک بندہ ہوں گئے،

ایک دوسری روایت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس مضمون کے مشابہ عبارت موجود ہے(٢)اوراس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ وعدہ ضرورایک دن پورا ہوگا۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پرداستانِ فرعون کے بعدنقل کرتا ہے

(وَنُرِيدُ اَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ استُضعِفُوا فِي الاَرضِ وَ نَجعَلَهُم اَئِمَّةً و نَجعَلَهُمُ الوَارِثِينَ)(٣)

اورہم تو یہ چاہتے ہیں جولوگ روئے زمین پر کمزورکردئے گئے ہیں اُن پراحسان کریں اورانھیں لوگوں کوپیشوابنائیں اورانھیں کواِس زمین کا مالک ووارث قراردیں۔

یہ آیت گرچہ بنی اسرائل کے سلسلہ میں ہے،فرعون کی ہلاکت کے بعداُن کاحکومت کی باگ ڈورسنبھالنے کی طرف اشارہ کرتی ہےلیکن (نرید) کی تعبیرایک سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہےاسی وجہ سے بہت سی روایتوں میں اسی آیت کوحضرت مہدی (عج) کی جہانی حکومت کے لئےدلیل بنایا گیا ہے۔(٤)

....

(۱) سورۂ انبیائ۔آیت ۱۰۵

(۲) سورۂ اعراف۔آیت ۱۲۸

(۳) سورۂ قصص۔آیت ۵

(٤) بحارالانوار۔ج۵۱ص۵٤ج۔۵۳۳٦٤٦.

نیز قرآن نے ایک دوسرے مقام پر مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تم میں سے جو بھی واقعی ایمان لائے ،اور نیک اعمال انجام دے، وہ زمین کا خلیفہ ہوگا اور پورے امن و امان کے ساتھ خدا کی عبادت کرے گا۔

(وَ عَدَ اللّٰہُ الَّذِینَ آمَنُوا مِنکُم وَ عَمِلُوا الصّالِحَاتِ لَیَستَخلِفَنَّھُم فِی الاَرضِ کَمَا استَخلَفَ الّذِینَ مِن قَبلِھِم وَلَیُمَکِنَنَّ لَھُم دِینَھُمُ الَّذ ارتَضَیٰ لَھُم وَلَیُبَدِلَنَّھُم مِّن بَعدِ خَوفِھِم اَمنًا یَعبُدُونَنِ لَا یُشرِکُونَ ب شَئیًا وَمَن کَفَرَ بَعدَ ذٰلِکَ فَاُولَئِکَ ھُمُ الفَاسِقُون)(۱)

اے ایمان والوں تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کیے ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ایک نہ ایک دن روئے زمین ضرور پر اپنا نائب مقرر کرئے گا، جس طرح ان لوگوں کو نائب بنایا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں، اور جس دین کو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا (اسلام) اس پر انہیں ضرور ضرور پوری قدرت دے گا، اور ان کے خائف ہونے کے بعد امن سے ضرور بدل دے گا، اور وہ میری ہی عبادت کریں گے، اور کسی کو ہمارا شریک نہیں بنائیں گے، اور جو شخص بھی اس کے بعد ناشکری کرے تو ایسے ہی لوگ بدکار ہیں۔

روایات کے مطابق یہ وعدہ امام زمانہ (عج) کے ہاتھوں پورا ہوگا۔(۲)
اسی طرح بہت سی روایتوں میں قرآن کی مختلف آیتوں (۳) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو امام مہدی (عج) کی جہانی حکومت پر دلالت کرتی ہیں جنھیں ہم یہاں بیان نہیں کر سکتے (٤)

....

(۱) سورہ نور۔ آیت ٥٥

(۲) بحارالانوار۔ ج٥١ص٥٨، ج٥٢ص٣٤٠

(۳) جیسے یہ آیات

ویکون الدین کلّمه لله لیظهره علی الدین کله بقیة الله خیر لکم

(٤) بحارالانوار۔ ج٥١ص٤٤-٦٤

چند روایتیں۔

وہ روایتیں جسے شیعہ اور سنی علماء نے آنحضرت سے نقل کی ہیں حد تواتر سے بھی زیادہ ہیں اور وہ روایتیں جسے صرف سنی علماء نے نقل کیا ہے خود انھیں کے قول کے مطابق وہ روایتیں متواتر ہیں (۱) بلکہ اُنھیں علماء میں سے بعض اِس بات کے بھی قائل ہیں کہ حضرت مہدی (عج) پر اعتقاد تمام اسلامی فرقوں میں پایا جاتا ہے، (۲) انھوں نے حضرت مہدی (عج) اور اُن کے ظہور کے علامات کے سلسلہ میں مختلف کتابیں بھی تحریر کی ہیں (۲) ان روایتوں میں سے ہم چند کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اہل سنت نے رسول اکرم سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں رسول اللہ فرماتے ہیں: اگر جہان میں سے صرف ایک دن باقی رہ جائے تو خدا اُسے اتنا طولانی کر دیگا کہ میرے اہل بیت علیہم السلام میں سے ایک فرد کہ جس کا نام میرے ہی نام پر ہوگا عالمی حکومت قائم کرے گا، اور زمین کو اسی طرح عدل وداد سے پر کرے گا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی۔(۳)

جناب ام سلمہ رسول خدا سے نقل فرماتی ہیں: آپ نے فرمایا مہدی (عج) میری عترت اور فاطمہ علیہا السلام کی اولاد سے ہے۔(٤)

....

(۱) صواعق ابن حجر۔ص ۹۹، نور الابصار۔ شبلنجی۔ص ۱۵۵ اسعاف الراغبین۔ص ۱٤۰ الفتوحات الاسلامیہ۔ج۲ ص۲۱۱

(۱) شرح ابن ابی الحدید نہج البلاغہ ج۲ ص ۵۳۵ سبائک الذہب سویدی۔ص۷۸ غایۃ الماموول۔ج۵ ص۳٦۲

(۲) کتاب البیان فی اخبار صاحب الزمان تالیف حافظ محمد بن یوسف گنجی شافعی کتاب البرھان فی علامات مہدی آخر الزمان۔تالیف متقی ہندی

(۳) صحیح ترمذی۔ج۲ ص٤٦ صحیح ابوداود۔ج۲ ص ۲۰۷ مسند ابن حنبل۔ج۱ ض ۲۷۸ ینابیع المودہ۔ص۱۸٦ ٤٤۰۲۵۸ . ۲۸۸ . ۲۹۰

(٤) اسعاف الراغبین ۱۳٤۔

جناب ابن عباس رسول اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ یقیناً علی علیہ السلام

میرے بعد اِس اُمت کے امام ہیں اوراس کی اولاد سے ایک قائم منتظر،عج ، ہے،لہذا جب وہ ظہور کرے گا،تو زمین کواسی طرح عدل وانصاف سے پر کردے گا کہ جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی ۔(۱)

غیبت اور اُس کا راز۔

اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے امام زمانہ علیہ السلام کے سلسلہ میں جو روایات وارد ہوئی ہیں ان میں آپ کی غیبت کی طرف تاکید ہوئی ہے جیسا کہ عبدالعظیم حسنی ،امام محمد تقی اور آپ اپنے جدامام علی علیہم السلام سے نقل فرماتے ہیں کہ ہمارے قائم ،عج ،کی غیبت طولانی ہوگی اور شیعوں کو دیکھ رہا ہوں کہ جو بھوکے چوپایوں کی طرح جو اپنی چرا گاہوں کی تلاش میں پھرتے ہیں،اسی طرح وہ ہمارے قائم (عج) کی جستجو میں سرگرداں ہوں گے اوراسے نہیں پائیں گے ، یادرہے کہ اس وقت جو بھی اپنے ایمان پر ثابت رہے گا اور حضرت کی غیبت کی وجہ سے قساوت قلب میں مبتلانہیں ہوگا وہ روز قیامت میری صف میں ہوگا،اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جب ہمارا قائم ،قیام کرے گا،اُس کی گردن پر کسی کی بیعت نہ ہوگی ،اورکوئی ظالم حکمران اُس پر مسلط نہیں ہوسکے گا) اِس ہدف کی خاطر وہ پوشیدہ طور پر متولد ہوگا اورنظروں سے اوجھل ہوجائے گا۔(۲)

امام سجاد علیہ السلام اپنے جد حضرت علی علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ امام نے فرمایا کہ ہمارے قائم کی دو غیبتیں ہوں گی جن میں سے دوسری غیبت پہلی غیبت سے طولانی ہوگی اُس

وقت جو یقین قوی اور معرفت صحیح کا مالک ہوگا وہ اُس کی امامت پر باقی رہے گا۔(۲)

....

(۱) ینابیع المودہ ٤٩٤.

(۲)منتخب الاثر ٢٥٥.

(۳)منتخب الاثر ۲۵۱.

راز غیبت کو معلوم کرنے کے لئے ائمہ اطہار کی حیات کا اجمالی جائزہ لینا ہوگا۔

یہ نکتہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ رسول خدا کی وفات کے بعد لوگوں نے ابوبکر، پھر عمر، اُس کے بعد عثمان، کی بیعت کی، لیکن عثمان کی طرف سے ذات پات کے فرق اور غیر عادلانہ برتاؤ کی وجہ سے لوگوں نے اُس کے خلاف قیام کر کے اسے قتل کر دیا اور پھر امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کی۔

حضرت علی علیہ السلام جبکہ خدا و رسول کی طرف سے خلیفہ تھے لیکن جامعہ اسلامی کی خاطر خلفائے ثلاثہ کے ادوار میں خاموش رہے فقط اس دور میں اتمام حجت کرتے رہے لیکن اسلام و مسلمین کی منفعت جہاں ہوتی تھی وہاں اپنی کوششوں سے دریغ نہیں کرتے تھے اور جب آپ نے خلافتِ ظاہری کی باگ ڈور سنبھالی تو آپ کے اقتدار کا پورا دور، اصحاب جمل، نہروان اور معاویہ سے جنگ کرنے میں ختم ہو گیا، آخر کار خوارج میں سے ابن ملجم کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

امام حسن علیہ السلام بھی معاویہ کے فرمان سے زہر کے ذریعہ شہید کر دئے گئے، اور معاویہ کی

موت کے بعد اس کا بیٹا یزید کہ جسے اسلام کی کوئی پروانہ تھی تخت سلطنت پر بیٹھ گیا، اُس کے اعمال وحرکات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ہی برسوں میں اسلام کا کوئی نام ونشان باقی نہیں رہے گا، اِسی وجہ سے امام حسین علیہ السلام نے قیام کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں دیکھا، لہٰذا اپنی مظلومانہ شہادت کے ذریعہ مسلمانوں کو بیدار اور اسلام کو فنا ہونے سے بچالیا، لیکن اس کے باوجود حکومت عدل کی تشکیل کے لئے شرائط مہیا نہ ہو سکے، اِسی وجہ سے تمام ائمہ اطہار علیہم السلام نے عقائد و معارف احکام، تہذیب نفس اور باصلاحیت لوگوں کو تربیت کرنے میں اپنی عمریں گزار دیں، اور جہاں تک حالات اجازت دیتے تھے پوشیدہ طور پر لوگوں کو ظالموں کے خلاف ابھارتے رہے، اور انھیں حکومت اسلامی کے قائم ہونے کی امید دلاتے رہے یہاں تک کہ اسی راہ میں تمام ائمہ علیہم السلام ایک ایک کر کے شہید کر دئے گئے۔

بہر حال ائمہ اطہار علیہم السلام نے ڈھائی سوسال کی مدت میں، جان لیوا مشکلات اور بے شمار زحمتوں کے باوجود لوگوں کو اسلام کے حقائق سے آشنا کرتے رہے، اُن میں سے بعض نے عمومی طور پر اور بعض نے اپنے اصحاب کے لئے خصوصی طور پر تعلیم وتربیت کا آغاز کیا، اس طرح انھوں نے معارف اسلامی کے ذریعہ ایک اسلامی سماج تشکیل دینے کی کوشش کی اور شریعت محمدی کو بقاء کی ضمانت ملی نیز ممالک اسلامی کے گوشہ وکنار میں ظالموں کے خلاف قیام ہوئے اور ایک حد تک ستمگروں کے ظلم وستم کا خاتمہ ہوا۔

لیکن جس خبر نے ظالموں کی نیند اڑادی وہ حضرت مہدی (عج) کے ظہور کی خبر تھی جو اُن کی نابودی کی خبر دیتی تھی، اِسی وجہ سے امام حسن عسکری علیہ السلام کو شدت وسختی سے نظر بند کر دیا

تھا، تا کہ اگر آپ سے کوئی فرزند پیدا ہو تو اُسے قتل کر ڈالیں، اور خود امام حسن عسکری علیہ السلام کو جوانی کے عالم میں زہر سے شہید کر ڈالا لیکن خدا کا یہ ارادہ تھا کہ حضرت مہدی (عج) پیدا ہوں، اور انسانوں کو ان کے ذریعہ نجات مل سکے، اسی وجہ سے جب آپ پیدا ہوئے تو پانچ سال تک کچھ خاص افراد کے علاوہ کوئی بھی آپ کی زیارت نہیں کر سکتا تھا اور جب گیارہویں امام کا انتقال ہو گیا، تو لوگوں کا ارتباط آپ سے نواب اربعہ کے ذریعہ ہوتا تھا(۱)، اسی طرح ایک مدت گذری گئی اور پھر نا معلوم مدت کے لئے غیبت کبریٰ کا زمانہ شروع ہو گیا، اور یہ زمانہ اُسی وقت ختم ہوگا کہ جب اسلامی معاشرہ میں حکومت جہانی کے قائم ہونے کے لئے شرائط فراہم ہو جائیں اُس وقت امام علیہ السلام خدا کے اِذن سے ظہور کریں گے۔

لہٰذا امام علیہ السلام کی غیبت کا اصلی راز ستمگروں اور ظالموں کے شر سے محفوظ رہنا ہے اِس کے علاوہ روایتوں میں دوسری حکمتیں بھی بیان ہوئی ہیں، منجملہ یہ ہے کہ خدا اِس طرح لوگوں کا امتحان لینا چاہتا ہے کہ ان کے ماننے والے اپنے ایمان میں کس قدر پائدار اور ثابت قدم ہیں۔

....

(۱) عثمان بن سعید، محمد بن عثمان، حسین بن روح، علی بن محمد سمری.

البتہ زمانہ غیبت میں لوگ آپ کے فیوض و برکات سے محروم نہیں ہیں، بلکہ روایتوں کے مطابق آپ کے فیوض کا سلسلہ اسی طرح لوگوں کے شامل حال ہے۔(۱) کہ جس طرح خورشید بادلوں کی پشت سے نور افشانی کرتا ہے، اور آج بھی بہت سے نیک اور صالح افراد

اپنی مشکلات اور بلاؤں سے خلاصی کے لئے آپ کی خدمت میں مشرف ہو چکے ہیں اس کے علاوہ آپ کا وجود لوگوں کی امید کا سبب ہے ہ وہ آپ کے ظہور کے لئے شرائط کو مہیا کرنے کے ساتھ اپنی اصلاح کریں۔

....

(۱) بحارالانوار۔ ج۵۲ ص ۹۲

سوالات

۱۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا انتہائی ہدف کیا ہے؟

۲ ۔ یہ ہدف کیسے پورا ہوسکتا ہے؟

۳۔ کون سی آیت حکومت جہانی کے قائم ہونے کی خوشخبری دیتی ہے؟

٤ ۔ امام مہدی (عج) کے سلسلہ میں اہل سنت نے جو روایتیں نقل کی ہیں ان میں سے بعض کو بیان کریں؟

٥ ۔ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے حضرت مہدی (عج) کے سلسلہ میں وارد ہونے والی روایتوں میں سے بعض کو بیان کریں؟

٦ ۔ غیبت صغریٰ اور کبریٰ نیز ان دونوں کے درمیان فرق کو واضح کریں؟

۷ ۔ امام زمانہ (عج) کی غیبت کا راز کیا ہے؟

۸۔غیبت کے زمانہ میں لوگ امام زمانہ(عج) سے کیسے ملاقات کر سکتے ہیں۔؟

اکتالیسواں درس

شناخت عاقبت کی اہمیت

مقدمہ:

قیامت پر اعتقاد کی اہمیت وضرورت

قیامت کے مسئلہ پر قرآن کی تاکید

نتیجہ:

مقدمہ:

اس کتاب کی ابتدا ہی میں ہم نے دین مبین اور اس کے بنیادی عقاید (توحید، نبوت، قیامت،) کے بیان کے ساتھ اس بات کی تشریح ووضاحت بیان کردی تھی کہ انسانی زندگی کا مفہوم، انھیں مسائل کے حل میں پوشیدہ ہے اور کتاب کے پہلے حصے میں خدا شناسی (توحید) کے مسائل اور دوسرے حصے میں راہ اور رہنما شناسی (بنوت وامامت) کے متعلق بحث گذر

چکی ہے اور اب کتاب کے تیسرے حصے میں معاد (قیامت) کے عنوان کے تحت گفتگو کو جاری رکھتے ہیں۔

لیکن پہلے معاد کی خصوصیت اور انسان کی، انفرادی، اجتماعی زندگی پر پڑنے والے اثرات سے بحث ہو گی، اور اس کے بعد اس بات کی وضاحت کریں گے کہ معاد (قیامت) کا خصوصی تصور نامحسوس روح اور اس کے زندۂ جاوید ہونے کے ساتھ مشروط ہے، اور جس طرح موجودات کی معرفت بغیر خدائے وحدہ لاشریک کے ناقص ہے اسی طرح انسان کی معرفت بھی بغیر اس اعتقاد کے کہ روح زندۂ جاوید ہے ناقص اور نامکمل ہے۔

اس بیان کے بعد قیامت کے بنیادی مسائل مناسب انداز سے اس کتاب میں بیان کریں گے۔

قیامت پر اعتقاد کی اہمیت وضرورت۔

زندگی کا جذبہ، اس کی ضرورت اور خواہشات اور ضروریات زندگی کی طرف اس کا رجحان اصل میں یہ تمام چیزیں صرف کمال اور ابدی سعادت تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں، اور اب رہی بات کہ انسان انھیں حاصل کرنے کے لئے کس راستہ کا انتخاب کرے، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ انسان ان اھداف کی شناخت کیسے کرے؟

جو اسے اس کے ھدف تک پہنچا دیں درحقیقت زندگی کے راستے کی تعین اور اپنی رفتار و کردار کو معین کرنے کا اصل سبب انسان کی اپنی سوجھ بوجھ اور تصور اور خود اپنے کمال وسعادت اور

اپنی حقیقت کو پہچان لینا ہے،اور جولوگ زندگی کوصرف مادیت اوراس سے متعلق عناصر کواپنی حقیقت سمجھتے ہیں ،اور یہ تصور کرتے ہیں کہ یہی چندروزہ زندگی ہی سب کچھ ہے اور موت کے بعدصرف عدم اورفنا ہے، یااخروی لذت اور سعادتِ ابدی کے منکر ہیں وہ اپنی زندگی کو کچھ ایسا بنالیتے ہیں کہ اب صرف ان کے پیش نظر یہی دنیاوی لذت اورخواہش ہی ان کی سعادت اور نیک بختی ہےلیکن جوافراد اپنی دنیاوی زندگی کو ہی نہیں بلکہ اس کے آگے آنے والی زندگی کی حقیقت سے آشنا ہیں وہ اپنے اعمال وکردارکوآنے والی ابدی زندگی کا وسیلہ بناتے ہیں اور ایسے بنیادی کام انجام دیتے ہیں جواُن آنے والی اس زندگی میں مددگارثابت ہوں یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ مادی زندگی کی سختیوں اورناکامیوں کے باوجود یہ لوگ مایوس اورناامید نہیں ہوتے، بلکہ سعادت وکامیابی تک پہنچنے کے لئے اپنی بھرپورکوشش اورتلاش جاری رکھتے ہیں۔

انسانی زندگی کے یہ دواہم رخ صرف اس کی انفرادی زندگی ہی پر منحصر نہیں ہیں بلکہ اجتماعی زندگی پر گہرااثر چھوڑتے ہیں چنانچہ آخرت پرایمان اور جزاوسزاجیسی چیزیں انسان کودوسروں کےحقوق کا خیال، ایثاراوراحسان جیسے قابل تحسین کردار پرآمادہ کرتی ہیں اور ظاہر ہے کہ جس معاشرے یاقوم وملت کا یہ عقیدہ ہوگا،اس کے یہاں قانون عدالت پرعمل،ظلم وستم کا مقابلہ اورزوروزبردستی کاکم سے کم استعمال ہوگا،اور واضح رہے کہ اگر یہ اعتقادات دنیا کی تمام قومیں اپنا شیوہ بنالیں تو اس دنیا کی بین الاقوامی مشکلات خودبخود حل ہوجائیں گی۔

لہٰذاان تمام بیانات کے پیش نظر قیامت کی اہمیت وضرورت روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی

ہے بلکہ تنہا عقیدۂ توحید (بغیر عقیدۂ قیامت کے) بھی انسانی زندگی کو صحیح راستہ دکھانے سے قاصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام ادیان آسمانی خصوصاً دین اسلام اور تمام پیغمبران الٰہی قیامت کے عقیدہ کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ یہ عقیدہ انسانیت کا اہم ترین رکن بن جائے اور لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ ہو جائے۔

آخرت پر اعتقاد، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اعتبار سے صرف اسی صورت میں کارگر ثابت ہوں گے، جب ہم یہ مان لیں، کہ اس دنیا کے اعمال اور ابدی زندگی کی سعادت و بدبختی کے درمیان ایک قسم کا رابطہ علیت پایا جاتا ہے، یا کم از کم یہ ثابت ہو جائے، کہ وہاں کا ثواب وعذاب صرف اس دنیا میں عمل کرنے کا نتیجہ ہے (جیسے دنیوی فوائد اور نقصان) اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر مسئلہ آخرت اپنی حقیقت و اصلیت کھو بیٹھے گا کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دنیوی سعادت حاصل کرنے کے لئے اسی دنیا میں کوشش ہونی چاہیے اور اخروی سعادت ونجات کے لئے وہاں کی دنیا ہونی چاہیے لہٰذا ضرورت ہے کہ قیامت کے اثبات کے ساتھ ساتھ دنیا و آخرت کے درمیان پائے جانے والے رابطے اور ابدی خوشبختی یا بدبختی میں انسان کے اختیار اعمال و کردار کی تاثیر کو بھی ثابت کر دیا جائے۔

قیامت کے مسئلہ پر قرآن کی تاکید۔

قران کریم کی ایک تہائی سے زیادہ آیتیں انسان کی ابدی زندگی سے متعلق ہیں بعض آیات بیان کرتی ہیں کہ آخرت پر ایمان رکھنا لازم ضروری ہے (١) اور بعض آیتیں انکار آخرت کے

نقصانات

....

١۔ بقرہ ٤ ،لقمان ٤ ،نمل ٣

کو بیان کرتی ہیں (١) بعض آیتیں ابدی نعمتوں کا تذکرہ کرتی ہیں (٢) اور بعض آیات میں ابدی عذاب کا ذکر موجود ہے (٣) اوراسی طرح سے بہت سی دوسری آیتوں میں بھی نیک اور بداعمال اور آخرت میں اسی بنیاد پر ہونے والے ثواب وعقاب کا ذکر ہوا ہے، نیز اور دوسرے طریقوں سے بھی قیامت کے امکان اوراس کی ضرورت واہمیت پرقرآن نے تاکید کی ہے،اور ساتھ ہی ساتھ منکران قیامت کے سامنے محکم اورٹھوس دلیلیں بھی پیش کی ہیں اور ان کے اعتراضات کے جوابات دئے ہیں چنانچہ گمراہی، انکار قیامت اوراس سے،فراموشی کی بنیادی وجہ بھی بیان فرمائی ہے (٤) اگرقرآن مجید میں غورکیا جائے تواس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ پیغمبروں کی گفتگواوران کے اقوال نیز لوگوں سے بحث ومباحثہ کا بیشتر حصہ قیامت کے موضوع سے متعلق ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی کوششیں توحید کوثابت کرنے سے زیادہ قیامت کوثابت کرنے کے لئے رہی ہیں کیونکہ اکثر افراد قیامت کوقبول کرنے میں بہت ہی شدید وسخت رہے اوراس سختی کی بھی شاید دووجہ بیان ہوسکتی ہے۔

١۔ پہلی وجہ جومشترک ہے وہ یہ ہے کہ ہرغیبی اورنامحسوس چیزوں کاانکارکردینا ہے۔

٢۔ اوردوسری وجہ جوقیامت کے مسئلہ سے مخصوص ہے وہ یہ ہے کہ انسان کاکسی قانون کا پابند نہ ہونا (لاابالی ہونا) ہے کیونکہ قیامت کا قبول کرنا گویا اپنی زندگی کامحدودکرلینااور برے اعما

ل، منجملہ ظلم وفساد وگناہوں سے نفرتو بیزاری کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی خواہشات سے دست بردار ہوجائے اوراس کے انکار کردینے کی صورت میں ہوا وہوس اورشہوت پرستی وخود خواہی کے سارے راستے کھل جائیں گےقرآن مجیداسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشادفرمارہاہے۔

....

١۔اسراء١٠،فرقان١١صبا٨،مومنون٧٤،

٢۔رحمٰن٤٦،تاآخرسورہ،واقعہ١٥،٣٨،الدہر١١،٢١،

٣۔حاقہ آیت۔٢٠،٢٧،ملک٦،١١،واقعہ٤٢،٥٦،

(٤)سورہ ص آیت٢٦۔سورہ سجدہ آیت١٤٠

(اَيَحْسِبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ ٭بَلَىٰ قَادِرِيْنَ عَلَىٰ اَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَه ٭بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهُ)(١)

کیاانسان یہ خیال کرتاہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کوجمع نہ کرسکیں گے،یقیناہم اس بات پرقادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کے پورتک درست کرلیں بلکہ انسان یہ چاہتاہے کہ اپنے سامنے برائی کرتاچلاجائے۔

اوراسی قیامت کےاس حقیقی معنی سے انکار وامتناع کوان افراد میں ڈھونڈھا جاسکتاہے جو اپنی تحریروتقریر یارفتاروگفتار کےذریعہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ قیامت کواسی دنیا کا ایک حادثہ بناکرلوگوں کےسامنے پیش کریں جس سے مراد یہ ہے کہ اس دنیامیں قومیں آئیں گی جن میں طبقاتی نظام نہ ہوگا،یاجنت سے مرادیہی زمین ہے یا آخرت اوراس سے متعلق

دوسری چیزیں صرف فرضی اور تصوراتی یا خودساختہ داستانیں ہیں (۲)

قرآن مجید نے ایسے افراد کو (انسان نما شیطان) اور (انبیاء کے دشمنوں) سے تعبیر کیا ہے جو اپنے نرم و لطیف لہجہ اور سحر آمیز باتوں کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور لوگوں کو صحیح عقیدہ و ایمان اور احکام الٰہی پر عمل کرنے سے منحرف کر دیتے ہیں۔

(وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیَاطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا یَفْتَرُوْنَ ۔ وَلِتَصْغٰى اِلَیْهِ اَفْئِدَةُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِیَرْضَوْهُ وَلِیَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُقْتَرِفُوْنَ) (۳)

اوراسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے شیاطین جن وانس میں سے، انکا دشمن قرار دیا ہے یہ آپس میں ایک دورسرے کو دھوکہ دینے کے لئے مہمل باتوں کے اشارے کرتے ہیں اور اگر خدا چاہ

....

۱۔قیامت۔آیت/ ۳، ۵

۲۔نمل آیت ۶۸، الحقاف آیت ۱۷،

۳۔انعام ۱۱۲، ۱۱۳،

لیتا تو یہ ایسا ہر گز نہیں کر سکتے تھے لہٰذا اب آپ انھیں ان کے افتراء پر چھوڑ دیجئے، اور یہ اس لئے کرتے ہیں کہ جن لوگوں کا ایمان آخرت پر نہیں ہے ان کی طرف مائل ہو جائیں اور وہ اسے پسند کرلیں اور پھر خود بھی انھیں کی طرف افتراء پردازی کرنے لگیں۔

نتیجہ۔

انسان کو چاہیے ایک ایسے راستہ کا انتخاب کرے جو اسے اُس کی منزل مقصود یعنی کمال اور سعا دت ابدی سے ہم کنار کر دے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اس بات پر غور کرے، کہ کیا انسان کی زندگی اُس کی موت کے بعد ختم ہو جاتی ہے یا اس کے بعد بھی کوئی دوسری زندگی ہے؟ یا یہ کہ اس جہان سے دوسرے جہان میں منتقل ہونا ایک شہر سے دوسرے شہر میں سفر کرنے جیسا ہے، کہ جس کے لئے زندگی کے تمام وسائل اور ضروریات کو وہیں حاصل کیا جا سکتا ہے؟ یا یہ کہ اس دنیا کی خاص زندگی اُس آنے والی زندگی کی خوشی اور ناخوشی کا مقدمہ ہے اور جو کام واعمال یہاں انجام دئے جائیں اور اس کے آخری نتیجہ سزا یا جزا کو وہاں حاصل کیا جائے جب تک یہ مسائل حل نہیں ہو جاتے، تب تک انسان صحیح راستے اور مقصد کا انتخاب نہیں کر سکتا، کیونکہ جب تک انسان کو اس کے سفر کا مقصد معلوم نہ ہو، تب تک اس تک پہنچا نے والے راستے کو معین نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس حیات ابدی کے وجود کا احتمال جتنا بھی ضعیف اور فرضی ہی کیو ں نہ ہو پھر بھی ہوشیار اور عقلمند انسان کو اس کے سلسلے میں تحقیق اور تلاش وجستجو پر آمادہ کرتا ہے، اس لئے کہ اس احتمال کی کوئی حد معین نہیں ہے۔

سوالات

١۔اپنی زندگی کو منظم بنانے کے لئے قیامت پر اعتقاد رکھنے اور نہ رکھنے میں کیا فرق ہے؟

٢۔کس صورت میں اخروی زندگی پر اعتقاد رکھنا زندگی کو منظم بنانے میں اچھا کردار ادا کر سکتا ہے؟

٣۔قیامت کے متعلق قرآن مجید کی تاکید کو واضح طور سے بیان کیجئے؟

٤۔لوگ قیامت کو قبول کرنے میں اتنی سختی سے کیوں کام لیتے ہیں، شرح کیجئے؟

٥۔قیامت پر اعتقاد کی تحریف میں دلوں کے مریض لوگوں کی کوششوں کے چند نمونے اور اس کے مقابلے میں قرآن کا موقف کیا ہے؟

٦۔قیامت کے بارے میں تحقیق کی ضرورت کو لکھتے ہوئے اس تحقیق کی برتری کو دنیاوی مسائل پر تحقیق کرنے پر بیان کریں، شرح دیں؟

بیالیسواں درس

مسئلہ قیامت اور مسئلہ روح کا باہمی رابطہ

زندہ موجودات کی وحدت کا معیار

انسان کے وجود میں روح کا مقام (کردار)

زندہ موجودات کی وحدت کا معیار۔

تمام حیوانوں کی طرح انسان کا بدن بھی زندہ اور متحرک اجزاء اور عناصر کا ایک مجموعہ ہے کہ جس میں سے ہر ایک عنصر مسلسل تبدیلی وتغیر کا شکار ہے، اور اس کا یہ انداز پیدائش کے وقت سے لیکر زندگی کے خاتمہ تک بدلتا نہیں ہے یا یہ کہ ان عناصر اور اجزاء کی تعداد ہمیشہ ایک حالت پر باقی ہے۔

اس تبدیلی اور تغیرات کو دیکھتے ہوئے جو حیوانات بلکہ خاص طور سے انسانوں کے بدن میں جا ری ہے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا معیار ہے جس کی بنیاد پر متغیر اور بدلے ہوئے عنا

صر و اجزاء کے مجموعہ کو موجودِ واحد کا نام دیا جائے، جبکہ ممکن ہے کہ پوری زندگی میں متعدد مرتبہ وہ اجزاء اور عناصر تبدیل ہو جائیں اور ان کی جگہ اسی طرح کے دوسرے عناصر آ جائیں (۱)؟

....

۱۔اس سوال سے پہلے ایک دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ بنیادی طور سے ثابت اور بند مجموعے میں وحدت کا معیار کیا ہے؟ اور کیمیائی ترکیب کو کس معیار کے مطابق موجود واحد شمار کیا جا سکتا ہے؟ لیکن بحث و گفتگو کے زیادہ طولانی ہو جانے کی وجہ سے اس کو یہاں چھیڑنے سے پرہیز کیا جا رہا ہے، ضرورت مند حضرات آموزش فلسفہ جلد اول درس نمبر ۲۹ کی طرف رجوع کریں۔

اس سوال کا سب سے آسان اور سادہ جواب جو دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ زندہ موجودات میں وحدت کا معیار ان اجزاء کا ایک دوسرے سے ایک ہی زمانے میں یا الگ الگ متصل ہونا جبکہ وہ عناصر تدریجی طور سے ناپدید اور ختم ہوتے رہتے ہیں اور اس جگہ دوسرے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں لیکن پیوستگی اور اتصال کے سبب جو مسلسل تبدل و تغیر کے ساتھ ہے موجود واحد کا نام دیا جاتا ہے۔

لیکن یہ جواب اطمینان بخش نہیں ہے کیوں کہ اگر ایک مکان فرض کر لیں کہ جو مختلف اور متعدد اینٹوں سے مل کر تیار ہوا ہو، اور اس کی اینٹوں کو آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے تبدیل کرتے رہیں، اس طرح کی کچھ مدت کے بعد پہلے کی ایک اینٹ بھی باقی نہ رہ جائے تو ایسی صورت

میں اس نئ اینٹوں کے مجموعے کو وہی پہلے والا مکان نہیں کہا جا سکتا، اگر چہ سہل انگاری کی بنا پر اعتبار سے ایسی تعبیرات کا استعمال کیا جا تا ہے بالخصوص ان لوگوں کی جانب سے جو اس مجمو عے کے اجزاء کی تبدیلی کی اطلاع نہیں رکھتے۔

گذشتہ جواب کو اس طرح مکمل کیا جا سکتا ہے کہ یہ تبدیلی اس مجموعے کی وحدت کے لئے نقصا ن دہ نہیں ہے کہ جب ایک فطری اور اندرونی سبب کی بنیاد واقع ہو جیسا کہ زندہ موجودات میں دیکھا جا تا ہے، لیکن کسی مکان کی اینٹوں کی تبدیلی ایک باہری اور خارجی سبب کی بنیاد پر واقع ہوئی ہے لہٰذا اس پوری مدت میں جس دوران اس کے اجزاء تبدیل ہوتے ہیں اس کی طرف حقیقی وحدت کی نسبت نہیں دی جا سکتی۔

یہ جواب اس ایک طبیعی وفطری سبب کے قبول کرنے پر موقوف ہے جو ان تمام تغیرات اور تبدیلی کے ساتھ ہمیشہ باقی رہتا ہے اور ان اجزاء اور عناصر کے نظام اور ترتیب کو محفوظ رکھتا ہے، پس دوبارہ اس سبب کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سبب کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کی وحدت کا معیار کیا ہے؟

معروف فلسفی نظریہ کے مطابق ہر طبیعی موجود میں وحدت کا معیار ایک امر بسیط (غیر مرکب) اور غیر محسوس شیء ہے اور وہ طبیعت (فطرت) یا صورت (۱) یعنی اجزاء اور ذرات کے بدلنے سے تبدیل نہیں ہوتے اور زندہ موجودات کہ جو مختلف افعال انجام دیتے ہیں جیسے غذا حاصل کر نا اور رشد ونمو کرنا، ایجاد وتولید کرنا وغیرہ ایک عامل کی وجہ سے ہے کہ جس کو نفس کوا جا تا ہے۔

قدیم فلسفی علماء نفس نباتی اور نفس حیوان کو مادّی اور نفس انسانی کو مجرد عن المادہ جانتے تھے لیکن بہت سے اسلامی حکماء منجملہ صدر المتألھین شیرازی نے نفس حیوانی کو بھی تجرد اور مادہ سے خالی ہونے کو ایک مرتبہ جانا ہے اور شعور و ارادہ کو اسی مجرد موجود کی علامت شمار کیا ہے لیکن ماتر یا یسیم کہ جو وجود کو مادّے اور اس کی خاصتیوں میں منحصر جانتے ہیں وہ روح مجرد کا انکار کرتے ہیں اور جدید مادہ پرست انسان (مادّیین) (جیسے پوزتیولیسم بنیادی طور سے ہر غیر محسوس چیز کا انکار کرتے ہیں اور جب کسی بھی غیر محسوس چیز کو قبول نہیں کرتے جس کے نتیجہ میں ان کے پا س زندہ موجودات ہیں وحدت کے معیار کے سلسلے میں کوئی صحیح جواب نہیں ہے۔

اس بنا پر کہ نباتات کے اندر معیار وحدت اس کا نفس نباتی ہوتا ہے لہٰذا نباتی زندگی کا وجود، مادہ مستعد میں صورت اور نفس نباتی خاص کی وجہ سے ہے، اس طرح سے جس وقت مادہ کی استعداد ختم ہو جائے گی اس وقت اس کا صورت اور نفس نباتی ہونا بھی ختم ہو جائے گا اور اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ وہ مادّہ دوبارہ صورت نباتی کو قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد کو حاصل کر سکتا ہے تو ایسی صورت میں ایک جدید نفس نباتی کا اس میں اضافہ ہوگا، لیکن دو (پرانے اور نئے) سبزوں (درخت یا پودے) کے درمیان مکمل شباہت کے باوجود بھی حقیقی وحدت نہیں پائی جا سکتی اور اگر دقیق نظر سے دیکھا جائے تو اس جدید سبزے کو پہلے والا سبزہ نہیں کہا جا سکتا۔

....

۱۔ جاننا چاہیے ان میں سے ہر ایک لفظ کے دوسرے اصطلاحی معنی بھی پائے جاتے ہیں اور یہاں پر ان سے مراد وہی صورتِ نوعیہ ہے۔

لیکن حیوان اور انسان کے متعلق، چونکہ ان دونوں کی روح مجرد ہے (مادّہ سے خالی ہے) لہٰذا بدن کے نابود اور ختم ہو جانے کے بعد بھی باقی رہ سکتی ہے، اور جب دوبارہ بدن میں داخل ہو گی تو اپنی وحدت کو حفظ کر سکتی ہے چنانچہ موت سے پہلے بھی یہی روح کی وحدت شخص کی وحدت کا معیار تھی اور مادہ کا تبدیل ہونا شخص کے بدل جانے کا سبب نہیں بنتا، لیکن اگر کوئی انسان وحیوان کے وجود کو اسی بدن اور اسکی خاصیتوں میں منحصر جانے، اور روح کو بھی اسی بدن کی خاصیت یا خاصیتوں کا مجموعہ تسلیم کرے یہاں تک کہ اگر اس کو غیر محسوس لیکن مادّی تصور کرے، کہ جو بدن کے اعضاء وجوارح کے ختم ہو جانے کے ساتھ ساتھ وہ (روح) ختم ہو جائے گی تو ایسا انسان قیامت کا صحیح تصور نہیں کر سکتا، کیونکہ اس فرض کے ساتھ کہ بدن دوبارہ حیات کی استعداد پیدا کر سکتا ہے، کیونکہ نئی خاصیتیں اس کے اندر پیدا ہوں گی اور ایسی صورت میں وحدت کا حقیقی معیار وجود میں نہیں آ سکتا، کیونکہ فرض یہ ہے کہ پہلے کی خاصیتیں بالکل ختم ہو چکی ہیں اور نئی خاصیتوں نے جنم لیا ہے۔

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ اُس وقت موت کے بعد حیات کا صحیح تصور ممکن ہے جب روح کو بدن سے اور اس کی خاصیتوں سے ہٹ کر الگ سمجھیں اور یہاں تک اس کو ایک مادی صورت نہ سمجھیں جو بدن میں حلول کر گئی ہو اور بدن کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جائے، لہذا سب سے پہلے روح کو قبول کرنا ہوگا، اس کے بعد اس کو ایک امرِ جوہری تسلیم کرنا ہوگا نہ بدن کے اعراض کے مانند کوئی شیئ، (بدن کے اوپر عارض ہونے والی کیفیات) اور اس کے بعد پھر، اس کو بدن کے ختم ہو جانے کے بعد بھی قابل بقا اور قابل استقلال ماننا ہوگا نہ کہ حلول

کرنے والی شیء کی طرح (اصطلاح میں مادہ کے مطابق) کہ جو بدن کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ ختم ہوجاتی ہے۔

انسان کے وجود میں روح کا مقام (کردار)

یہاں پر جس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ انسان کا روح اور بدن سے مرکب ہونا، پانی میں آکسیجن اور ہیڈروجن سے مرکب ہونے کے مانند نہیں ہے کہ ان دونوں کے ایک دوسرے سے جدا ہونے کے ساتھ ساتھ خود مرکب کا وجود بھی ایک کل کے عنوان سے ختم ہوجائے بلکہ روح، انسان کا ایک اصلی عنصر ہے اور جب تک یہ عنصر باقی ہے انسان کی انسانیت بھی باقی رہے گی اور شخص کی شخصیت بھی باقی رہے گی، اسی لئے بدن کے عناصر اور اجزاء کے بدل جانے کی وجہ سے شخص کی وحدت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا، کیوں کہ انسان کی وحدت کا حقیقی معیار اس کی روح ہے قرآن حکیم اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُن منکرین قیامت کے جواب میں جو کہتے تھے کہ کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان اپنے بدن کے سارے اجزاء ختم ہونے کے بعد دوبارہ نئی حیات پا جائے؟

خداوندے عالم ارشاد فرماتا ہے۔

(قُلْ يَتَوَفَّاكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ)(۱)

کہدو (کہ تم نابود نہیں ہوگے بلکہ) فرشتہ موت تمہیں اٹھائے گا

بس ہر انسانیت اور شخصیت کا قوام اور وجود اسی چیز سے وابستہ ہے جس کو ملک الموت (اٹھا

لیتا)،قبض کر لیتا ہے، نہ کہ بدن اس اجزاء کے ذریعہ جوزمین میں بکھر جاتا ہےاور ختم ہوجاتا ہے،

....

١۔سورہ سجدہ۔آیت۔١١

سوالات

١۔کیا ایک مجموعہ کے متغیر اجزاء کے اتصال کو اس کی وحدت کا معیار مانا جا سکتا ہے؟اور کیوں؟

٢۔کون سے دوسرے معیار کوارگانیک ترکیبات کی وحدت کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے؟

٣۔موجوداتِ مرکب و بالخصوص زندہ موجودات کے بارے میں معروف فلسفی کا نظریہ کیا ہے؟

٤۔صورتِ طبیعی اور نفس میں کیا فرق ہے؟

٥۔نفسِ نباتی،اور نفسِ حیوانی وانسانی میں کیا فرق ہے؟اور یہ فرق مسئلہ قیامت میں کیا اثر رکھ سکتا ہے؟

٦۔قیامت کا صحیح تصور کن اصول کا محتاج ہے

٧۔انسان کا روح وبدن کے ساتھ مرکب ہونے اور کیمیائی ترکیبات میں کیا فرق ہے؟

تینتالیسواں درس

روح کا غیر محسوس ہونا (روح کا مجرد ہونا)

مقدمہ:

جو ذیل کی بحثوں پر مشتمل ہے

روح کے غیر محسوس ہونے پر عقلی دلائل

قرآنی دلائل

مقدمہ:

اس سے پہلے ہم یہ جان چکے ہیں کہ مسئلہ قیامت مسئلہ روح کے اوپر موقوف ہے، یعنی اس وقت کہا جا سکتا ہے (جو بھی مرنے کے بعد زندہ ہوگا وہ واقعاً وہی پہلا شخص ہوگا) کہ جب بدن کے ختم ہو جانے کے بعد بھی روح باقی رہے، یا یوں کہا جائے کہ ہر انسان اپنے مادی بدن کے علاوہ ایک غیر مادی جوہر رکھتا ہے جو بدن سے الگ ہو کر مستقل رہنے کی قابلیت رکھتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو اسی شخص کے لئے دوبارہ حیات کا فرض کرنا عاقلانہ تصور نہیں ہوگا، لھذا قیامت کے

اثبات اور اس سے متعلق مسائل اور خود قیامت کو بیان کرنے سے پہلے یہ مطلب ثابت ہو جانا چاہیے اس لئے ہم نے اس درس کو اسی موضوع سے مخصوص کر دیا ہے اور اس کو ثابت کرنے کے لیے دو طریقوں سے استدلال کریں گے، ایک تو عقل کے ذریعہ سے اور دوسرا وحی کے ذریعہ(۱)

....

۱۔ممکن ہے یہ تو ہم پیدا ہو کہ وحی کے ذریعہ استدلال قیامت اور روح کے مسائل کو ثابت کر نے کے لئے ایک دوری استدلال ہے کیونکہ اس دلیل میں جو بنوت کی ضرورت پر پیش کیا تھا اس اخروی حیات کو جو مسئلہ روح پر موقوف ہے ایک اصل موضوع کے عنوان سے نظر میں رکھا تھا لہذا خود اس اصل کو ثابت کرنا وحی کے ذریعہ اور بنوت کے ذریعہ مستلزم دور ہے یعنی دور لا زم آئے گا لیکن توجہ ضروری ہے کہ وحی کے ذریعہ استدلال کی صحت میں ضرورت نبوت کے مسئلہ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے وقوع پر موقوف ہے کہ جو معجزہ کے ذریعہ ثابت ہوگا (غور کیجئے)اور چونکہ قرآن مجید خود بخود معجزہ اور پیغمبر کی حقانیت کی دلیل ہے لہٰذا اس کے ذریعہ روح اور قیامت کے مسائل کو ثابت کرنے کے لئے استدلال کرنا صحیح ہے۔

روح کے غیر محسوس ہونے پر عقلی دلائل

کافی زمانے سے فلسفیوں اور مفکروں نے روح (کہ جس کو فلسفی اصطلاح میں نفس کہا

جاتا ہے)(۱) کے بارے میں کافی بحث و گفتگو کی ہے،اور خصوصاً اسلامی حکماء نے اس موضوع کو بہت ہی اہمیت دی ہے،اپنی فلسفی کتابوں کے زیادہ حصوں کو اسی کی بحث سے مخصوص کر دیا ہے اور اس کے علاوہ خود مستقل کتابیں بھی تحریر کی ہیں،اور ان لوگوں کے نظریات کو جو روح کو بدن کے اعراض میں سے ایک عرض یا مادی صورت (جو بدن کے مادہ میں ڈھل جائے) تصور کرتے ہیں بے شمار دلائل کے ذریعہ ردّ اور باطل کیا ہے،

ظاہر ہے کہ اس سے تفصیلی بحث اس موضوع کے ذیل میں اس کتاب کے لئے مناسب نہیں ہے لہذا اس مختصر گفتگو پر اکتفا کرتے ہیں،اور کوشش کرتے ہیں کہ اس باب میں ایک واضح بیان اور محکم گفتگو پیش کریں، چنانچہ یہ بیان چند عقلی دلیلوں پر مشتمل ہے جسے ہم اس مقدمہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

ہم اپنی جلد اور کھال کے رنگ اور اپنے بدن کی شکل وصورت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اعضاء بدن کی نرمی اور سختی کو اپنی قوت لامسہ کے ذریعہ محسوس کرتے ہیں نیز اس کو تشخیص دیتے ہیں اور اپنے بدن کے اندرونی اجزاء کے بارے میں صرف غیر مستقیم طریقہ سے اطلاع حاصل کرتے ہیں،لیکن ہم اپنے اندر خوف ومحبت اور غصہ وارادہ نیز اپنی فکر کو بغیر حسی اعضاء کے درک کر لیتے ہیں،اور میرا ذاتی وجود (نفس) جو قوت احساسات کا مالک ہے نیز عطوفت ومہربانی اور نفسیاتی حالات اپنے اندر رکھتا ہے بغیر حسی اعضاء کے آگاہ ہے۔

....

۱۔جاننا چاہیئے کہ نفس کی فلسفی اصطلاح اس کے اخلاقی اصطلاح کے علاوہ ہے جو عقل کے

مقابل میں اوراس کی ضد کے عنوان سے استعمال کی جاتی ہے

لہذا انسان کلی طور سے دوطرح کے ادراکات کا مالک ہے، ادراک کی پہلی قسم وہ ہے کہ جس میں حسیِ اعضاء کی ضرورت پڑتی ہے، اورادراک کی دوسری قسم وہ ہے جس میں حسی اعضاء کی ضرورت نہیں پڑتی،

ایک دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ان خطاؤں اور غلطیوں کے پیش نظر جوادراکاتِ حسی میں پائی جاتی ہیں، ممکن ہے کہ خطا کا احتمال، ادراک کی پہلی قسم سے مربوط ہے لیکن دوسری قسم میں کسی بھی طرح کے خطا وشائبہ کا امکان نہ ہو، مثال کے طور پر ممکن ہے کہ کوئی شک کرے کہ کیا آیا اس کی کھال کا رنگ واقعاً ویسا ہی ہے جیسا وہ محسوس کرتا ہے یا نہین، لیکن کوئی بھی انسان اپنی فکر اور ذہن کے بارے میں یہ شک نہیں کرسکتا کہاس کے وہاں سوچنے کی قوت ہے یا نھیں ،ارادہ کیا یا نہیں، شک پیدا ہوا یا نہیں۔

اس مفہوم کو فلسفہ میں اس تعبیر کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ علم حضوری بغیر کسی واسطے کے خود واقعیت سے متعلق ہوتا ہے اس لئے اس میں خطاء کا امکان نہیں ہے لیکن علم حصولی چونکہ ادراکی واسطے کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے لہذا ذاتی اعتبار سے قابل شک وتردید ہے (۱)

یعنی انسان کے یقینات اوراس کے حتمی علوم علم حضوری ہیں جہ شہود کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، وہ علم بہ نفس یعنی احساسات اورعواطف اوردوسرے نفسیاتی حالات کوبھی شامل ہیں اس بنا پر (میں) کا وجود جودرک کرنے والا ہے، غوروفکر کرنے والا شک وشبہہ کے قابل نہیں ہے جیسا کہ خوف ومحبت اورغصہ اورفکروارادہ بھی قابل شک نہیں ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ (میں) وہی مادی اور محسوس بدن ہے اور کیا یہ نفسیاتی حالات بھی اسی بدن کا ایک عارضہ ہے یا ان کا وجود بدن کے وجود سے علیحدہ ہے اگر چہ اس میں،، اور بدن،، کے درمیان نہایت ہی گہرے تعلقات ہیں اور اپنے اکثر افعال کو اسی بدن کے ذریعہ انجام دیتا ہے اور اس میں اپنا اثر بھی ڈالتا ہے اور خود اس بدن سے متاثر بھی ہوتا ہے، مذکورہ مقدمہ کے پیش نظر اس سوال کا جواب بہت آسانی سے دریافت ہو جاتا ہے کیونکہ۔

....

۱۔آموزش فلسفہ ج۱ درس نمبر ۱۳ کی طرف رجوع کریں۔

۱۔سب سے پہلے ممیں،، کو علم حضوری کے ذریعہ درک کرتے ہیں جبکہ بدن،، کو حسی اعضاء کے ذریعہ محسوس کیا جاتا ہے۔

۲۔دوسرے میں،، ایک ایسا وجود ہے جو اپنی وحدت اور حقیقی شخصیت کے وصف کے ساتھ دسیوں سال تک باقی رہتا ہے اور اس وحدت و شخصیت کو ہم نا قابل حفظ علم حضوری کے ذریعہ درک کرتے ہیں درآں حالیکہ بدن کے اجزاء بارہا تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور سابق اور لاحق اجزا کے درمیان کوئی بھی معیار وحدت نہیں پایا جاتا۔

۳۔تیسرے میں،، ایک بسیط اور نا قابل تجزیہ موجود کا نام ہے مثلاً اس کو آدھے (میں) میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، جبکہ بدن کے اعضاء و جوارح متعدد اور قابل تجزیہ و تقسیم ہیں۔

٤۔چوتھے احساس اور ارادہ وغیرہ کے مانند ایک بھی نفسیاتی حالت میں مادیات کی اصلی خاصیت جیسے امتداد اور قابل تقسیم ہونا نہیں پائی جاتی، (یعنی نفسیاتی حالت میں مادیت کی کوئی

بھی اصلی خاصیت نہیں پائی جاتی ،اور ایسے غیر مادی امور کو مادہ (بدن) کے اعراض میں شمار نہیں کیا جاسکتا لہٰذا ان اعراض کا موضوع ایک جوہر ہے جو غیر مادی (مجرد) ہے(۱)۔

موت کے بعد روح کی بقا اور استقلال اور اسکے وجود کے او پر اطمینان بخش اور دل نشیں دلیلیں وہ سچے خواب ہیں کہ بعض شخصیتوں نے مرنے کے بعد خوابوں کے ذریعہ ان حقائق کی نشاندھی کی ہے نیز اولیاء خدا کی کرامتوں اور یہاں تک کہ مرتاضوں کی ریاضتوں کے ذریعہ روح اوراس کے غیر محسوس ہونے کو ثابت کیا جاسکتا ہے،اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے ایک مفصل اور مستقل کتاب درکار ہے

....

۱۔آموزش فلسفہ جلد دوم درس نمبر ٤٤ اور ٤٩ کی طرف رجوع کریں

قرآنی دلائل۔

قرآن کریم کی رو سے روح انسانی کے وجود میں شک وشبہہ نہیں کیا جاسکتا وہ روح جس کواس کی انتہائی شرافت کی بنیاد پر خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے(۱)

جیسا کہ انسان کی خلقت کی کیفیت کے متعلق ارشاد ہورہا ہے

(وَنُفِخَ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهِ)(۲)

بدن کو بنانے کے بعد اس میں اپنی روح پھونک دی ،ایسا نہیں ہے کہ معاذ اللہ خدا کی ذات

سے کوئی شے جدا ہوکر انسان کے اندر منتقل ہوگئی ہو۔

اور حضرت آدم کی تخلیق کے بارے میں فرماتا ہے (نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِ)(۳) اسی طرح دوسری آیتوں سے استفادہ ہوتا ہے کہ روح بدن اوراس کی خاصیتوں سے علیحدہ ایک دوسری شی ہے جو بقا کی صلاحیت رکھتی ہے باہم ان کافروں کےقول کوذکرکرنے کے بعد کہتے تھے۔

(ءَإِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَءِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ) (۴)

جس وقت ہم (مرگئے) اورزمین میں گم ہوگئے (اور ہمارے بدن کے اجزاء مٹی میں بکھر گئے) کیا ہم دوبارہ پیدا کئے جائیں گے۔

اس طرح جواب دے رہا ہے

(قُلْ يَتَوَفَّاكُمْ مَلَكُ الْمَوتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَى رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ)(۵)

کہدو(تم گم نہیں ہوگے) وہ موت کافرشتہ جوتمہارے اوپر تعینات ہے وہ تمہیں وفات دے گا اور پھراپنے پروردگار کی طرف پلٹادیئے جاؤگے،

....

۱۔اصول کافی۔ج۱ص،۱۳٤

۲۔سجدہ آیہ ۹

۳۔حجر۲۹،ص۷۲

٤ سجدہ۔آیت۱۰

۵۔سجدہ آیت۱۱

پس انسان کی شناخت کا معیار وہی روح ہے کہ جوموت کے فرشتے کے ذریعے قبض کی جاتی

ہے، اور ہمیشہ محفوظ رہتی ہے نہ کہ وہ اجزاء بدن جو زمین میں بکھر جاتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں اور، ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے۔

(اَللّٰہُ یَتَوَفی الا نفس حَیْنَ مَوْ تِہا وَ الَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَاْ مِھاْ فَیُمْسِكُ الَّتِی قَضٰی عَلَیْہَا الْمَوتَ، وَیُرْ سِلُ الاُ خریٰ الیٰ اَجَلٍ مُسَمّیٰ)(۱)

اللہ ہی ہے جو روحوں کو (یا اشخاص) کو موت کے وقت اپنی طرف بلا لیتا ہے اور جو نہیں مرتے ہیں ان کی روحوں کو بھی نیند کے وقت طلب کر لیتا ہے (یعنی وہ جو سو گیا ہے اس کی موت کا وقت نہیں آیا)۔

اور پھر جس کی موت کا فیصلہ کر لیتا ہے اس کی روح کو روک لیتا ہے اور دوسری روحوں کو ایک مقررہ مدت کے لئے آزاد کر دیتا ہے۔

اور ستمگاروں کی موت کی کیفیت کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے۔

(اِذِ الظّٰالِمُوْنَ فِ غَمَرَاتِ اَلْمَوْتِ وَالْمَلاَئِکَۃُ بَاسِطوُا أَیْدِیْہِمْ أَخْرِجُوْا أَنْفُسَکُمْ)(۲)

اور اگر آپ دیکھتے کہ ظالمین موت کی سختیوں میں ہیں اور ملائکہ اپنے ہاتھ بڑھائے ہوئے آواز دے رہے ہیں کہ اب اپنی جانوں کو نکال دو۔ (تسلیم ہو جاؤ)

ان آیات اور اس طرح کی دوسری آیتوں کہ جن کو اختصار کی وجہ سے ہم نے نقل نہیں کیا، استفادہ ہوتا ہے کہ ہر شخص کی نفسیت اور شخصیت اس چیز کے ذریعہ ہے جس کو خدا اور ملک الموت اور روح قبض کرنے والے فرشتے اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں اور بدن کا نابود ہو جانا انسان کی روح اور اس کی حقیقت وحدت کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

....

۱۔زمر۔آیت ۴۲،

۲۔انعام۔آیت ۹۳،

نتیجہ کلام۔

سب سے پہلے،انسان کے اندر ایک شئے بنام روح پائی جاتی ہے،دوسرے یہ کہ انسان کی روح بدن سے جدا ہوکر بقا اور استقلال کی صلاحیت رکھتی ہے،نہ کہ مادی صورت اور اعراض کی طرح جو بدن کے ختم ہوجانے سے ختم ہوجائے،

تیسرے یہ کہ ہر فرد اور ہر شخص کی شناخت اور اس کا امتیاز اس کی روح سے وابستہ ہے،بلکہ یوں کہا جائے کہ ہر انسان کی حقیقت اس کی روح ہے اور بدن روح کی بہ نسبت ایک وسیلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

سوالات

۱۔علم حضوری اور علم حصولی کی تعریف کرتے ہوئے ان کے مابین فرق کو واضح کیجئے؟

۲۔روح کے غیر محسوس ہونے کو عقلی دلیلوں سے واضح کیجئے؟

۳۔روح کے غیر محسوس (مجرد) ہونے پر دوسری کون سی دلیلوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

۴۔اس بحث وگفتگو سے مربوط آیات کو ذکر کیجئے؟

۵۔ان آیتوں سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

چوّالسیواں درس

قیامت کا اثبات

مقدمہ:

جومندرجہ ذیل بحثوں پر مشتمل ہے

برہان حکمت

برہان عدالت

مقدمہ

جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے شروع ہی میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا، کہ قیامت اور آخرت میں انسان کے ہر فرد کے زندہ ہونے پر اعتقاد رکھنا تمام آسمانی ادیان کا بنیادی ترین عقیدہ ہے، اور انبیاء الٰہی علیہم السلام نے بھی اس اصل پر تاکید فرمائی ہے، اور لوگوں کے دلوں میں اس عقیدہ کو ثابت اور راسخ کرنے کے لئے بے انتہا زحمتیں برداشت کی ہیں، اور قرآن مجید میں قیامت اور عدل پر عقیدہ رکھنے کو خدا کی توحید پر عقیدہ رکھنے کے برابر جانا گیا ہے ،اور تقریباً بیس سے زیادہ مقامات پر کلمہ (اللہ) اور (وَالیَ وم الاٰ خِر) کوایک ساتھ استعمال

کیا گیا ہے، اگرچہ دو ہزار سے زیادہ آیات میں آخرت سے متعلق بحث کی گئی ہے۔
اس جز کی ابتدا میں ہم نے عاقبت شناسی کے بارے میں تحقیق کی اہمیت پر حتی المقدور روشنی ڈال چکے ہیں، اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ قیامت کا صحیح تصور اس روح کو قبول کرنے پر موقوف ہے جو ہر انسان کی شناخت کا معیار ہے اور اس کا وجود موت کے بعد بھی باقی رہے گا ،تا کہ یہ کہا جا سکے کہ وہی شخص جو اس دنیا سے گیا ہے دوبارہ قیامت اور آخرت میں زندہ کیا جائے گا، پھر اس کے بعد عقل و وحی کے ذریعہ اس روح کو ثابت کیا گیا ہے تا کہ انسان کی ابدی زندگی کے بارے میں گفتگو کا راستہ ہموار ہو جائے اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس اہم اعتقادی اصل کو ثابت کرنے کی کوشش کریں۔
جس طرح مسئلہ روح کو دو طریقوں عقل و نقل (آیات و روایات) کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے، اسی طرح اس مسئلہ کو بھی انہیں دونوں طریقوں سے ثابت کریں گے، ہم سب سے پہلے قیامت کی ضرورت پر دو عقلی دلیلیں پیش کریں گے اور اس کے بعد بعض قرآنی ارشادات کو ضرورت اور امکان معاد کے سلسلے میں پیش کریں گے۔

برہان حکمت۔

خدا شناسی کے باب میں وضاحت کی تھی کہ خدا کی خلقت بیکار اور بے مقصد نہیں ہے بلکہ خیر و کمال سے محبت کہ جو خدا کی عین ذات ہے بالاصالۃ اور اس کے آثار ہیں بالتبع ،کہ جس میں خیر و کمال کے بعض مراتب پائے جاتے ہیں متعلق ہوتی ہے، اسی لئے دنیا کو اس طرح پیدا کیا

ہے کہ زیادہ سے زیادہ خیر وکمال کا کسب کرنا اس پر مبنی ہو، اور اس طرح سے ہم نے حکمت کی صفت کو ثابت کیا، کہ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ مخلوقات کو ان کے مناسب کمال اور مقصد تک پہنچایا جا سکے، لیکن چونکہ مادی دنیا مزاحمتوں اور ٹکراؤ کا مقام ہے، مادی موجودات کے خیر وکمالات ایک دوسرے کے معارض ہیں لہذا خدا کی حکیمانہ تدبیر کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو اس انداز سے مرتب اور منظم کرے کہ مجموعی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ خیرات اور کمالات اس پر مرتب ہوں، بلکہ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس دنیا میں بہترین نظام پایا جائے، اسی وجہ سے مختلف قسم کے عناصر اور ان کی مقدار و کیفیت، فعل و انفعالات نیز اس کی حرکات و سکنات اس طرح منظم اور مرتب ہیں کہ سبزوں اور درختوں اور آخر میں اس دنیا کی سب سے کامل ترین مخلوق یعنی انسان کی خلقت کا زیادہ سے زیادہ موقع فراہم ہو جائے، اور اگر یہ مادی دنیا اس طرح پیدا کی گئی ہوتی کہ موجودات زندہ کی پیدائش اور اس کے رشد کو ناممکن بنا دیتی، تو یہ

حکمت کے خلاف کام ہوتا۔

اب ہم مزید اضافہ کرتے ہیں اس بات کے مدنظر کہ انسان کے اندر قابل بقا روح پائی جاتی ہے، اور وہ ابدی و جاودانی کمالات کو حاصل کر سکتا ہے وہ بھی ایسے کمالات جس کا تقابل مادی کمالات سے نہیں کیا جا سکتا، اگر اس کی حیات اس دنیوی زندگی پر منحصر ہو جائے تو حکمت الٰہی کے ساتھ ساز گار نہیں ہو سکتی، خاص طور سے اس بات کے پیش نظر کہ دنیاوی حیات بے شمار رنج و مصیبت اور سختیوں و پریشانیوں کے ہمراہ ہوتی ہے اور غالباً کوئی بھی لذت بغیر رنج و

مصیبت اور زحمت کے حاصل نہیں ہوتی، اس طرح حساب لگانے والے افراد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ محدود لذتوں کو حاصل کرنے کے لئے ان سب زحمتوں اور پریشانیوں کا برداشت کرنا مفید نہیں ہے، اور انہیں محاسبات کے ذریعہ بیکاری اور بے مقصد زندگی کی طرف رجحان پیدا ہوتا ہے یہاں تک بعض لوگ زندگی سے شدید محبت رکھنے کے باوجود خودکشی کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں درحقیقت اگر انسان کی زندگی اس کے علاوہ نہ ہوتی کہ مسلسل زحمتیں برداشت کرے، اور طبیعی واجتماعی مشکلات سے ہمیشہ دست وگریباں رہے تاکہ چند لمحہ لذت وخوشی کے ساتھ گذارے، اور اس وقت خستگی اور تھکاوٹ کے باعث سو جائے تاکہ جس وقت اس کا جسم دوبارہ محنت کرنے اور کام کے لئے آمادہ ہو جائے (نیا دن اور نئی روزی) تو پھر دوبارہ سعی وکوشش کرے مثلاً ایک لقمہ روٹی حاصل کرلے اور اسے کھانے کے ذریعہ ایک لمحہ کی لذت محسوس کرے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں! ایسا تکلیف دہ اور رنج وملال آور تسلسل کو عقل ہرگز پسند نہیں کرتی، اور نہ تو اس کے انتخاب کا حکم (فتوی) دیتی ہے، ایسی زندگی کی بہترین مثال یہ ہے کہ ایک ڈرائیور اپنی کار کو پٹرول پمپ تک جائے اور پٹرول کی ٹنکی کو بھرنے کے بعد اس پٹرول کو دوسرے پٹرول پمپ تک لیجانے میں صرف کردے، اور اس کام کو برابر انجام دیتا رہے یہاں تک کہ اس کی کار پرانی وبوسیدہ ہو جائے اور کام کرنا چھوڑ دے یا کسی ایکسیڈنٹ یا دوسرے موانع کی وجہ سے تباہ ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ انسان کی زندگی کے متعلق ایسا نظریہ رکھنا بے مقصد بے ہدف ہونے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

دوسری طرف انسان کی مہم اور بنیادی خواہشات میں سے ایک بقا اور جاویدانگی ہے کہ جسے خدا وند عالم نے اس کی فطرت میں قرار دیا ہے اور ایک ایسے محرک اور قوت کے حکم میں ہے جو اسے ابدیت کی طرف لے جاتا ہے اور مسلسل اس کی رفتار میں اضافہ کرتا رہتا ہے ایسے موقع پر اگر یہ فرض کیا جائے کہ ایسے محرک اور تیز رفتاری سے چلنے والے کا انجام سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ وہ اپنی رفتار کی سرعت کی انتہا پر ایک مضبوط پتھر سے ٹکرا جائے اور پاش پاش ہو کر ختم ہو جائے آیا ایسے انجام اور مقصد کے پیش نظر قوت و سرعت و رفتار میں اضافہ کرنا منا سب ہوگا ؟ لہذا ایسا فطری رجحان اس وقت حکمت الٰہی کے ساتھ سازگار ہوگا کہ جب اس فا نی اور موت سے محکوم دنیا کے علاوہ کوئی اور زندگی پائی جائے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اپنی انھیں دو تمہیدوں کے بعد یعنی حکمت اور انسان کے لئے ابدی زندگی کے امکان سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس محدود دنیاوی زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی انسان کے لئے ہونی چاہیے تاکہ حکمت الٰہی کی مخالفت نہ ہو۔

اور جاودانی زندگی کی طرف رجحان کو ایک دوسرا مقدمہ قرار دیا جا سکتا ہے اور اس میں حکمت الٰہی کو ضمیمہ کر کے ایک دوسری دلیل بنا کر پیش کی جا سکتی ہے۔

اسی کے ضمن میں یہ بات بھی روشن ہوگئی ہے کہ انسان کی ابدی زندگی میں ایک دوسرا نظام ہونا چاہیئے کہ جس میں دنیاوی حیات کی طرح رنج و مصیبت نہ پائی جائے ورنہ یہی دنیاوی زندگی اگر ہمیشہ کے لئے ممکن ہو جاتی، تب بھی حکمت خدا کے ساتھ سازگار نہ ہوتی۔

برہان عدالت۔

اس دنیامیں سارے انسان اچھے اور برُے عمل کوانجام دینے میں آزاد ہیں ایک طرف تو وہ لو
گ ہیں جو اپنی پوری زندگی خدا کی عبادت اور بندگانِ خدا کی خدمت میں گذار دیتے
ہیں، اور دوسری طرف ایسے ایسے گنہگار اور بدکردار افراد نظر آتے ہیں جو اپنی شیطانی خواہشا
ت تک پہنچنے کے لئے بڑے سے بڑا ظلم اور بد سے بدتر گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں اور بنیادی
طور سے اس دنیامیں انسان کی خلقت کا مقصد اور اس کومختلف متضاد رجانات اور ارادہ وانتخا
ب سے اور مختلف عقلی ونقلی شناختوں سے

مالا مال کردینے اور اس کی مختلف رفتار وکردار کے لئے موقع فراہم کرنے اور حق وباطل اور خیر
وشر کے دو، راہے پر لاکر کھڑا کردینے کا مقصدو ہدف یہ ہے کہ انسان بے شمار امتحانات اور
آزمائشوں سے گذرے، اور اپنے کمال کی راہ کو اپنے ارادہ واختیار کے ذریعہ انتخاب کرے،
تاکہ اپنے اختیاری اعمال کی جزا یا سزا پاسکے اور درحقیقت انسان کے لئے اس دنیا کی پوری
پوری زندگی صرف امتحانات اور آزمائشیں اور اپنی شخصیت کو بنانا ہے یہاں تک کہ یہ انسان
اپنی عمر کے آخری لمحے تک ان آزمائشات اور امتحانات اور تکلیف کے انجام دینے سے
معذور نہیں ہے۔

لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خدا کے نیک بندے اور گنہگار وظالم اس دنیا میں اپنے کئے کی جزا یا

سزا نہیں پاتے اور بسا اوقات دیکھتے ہیں گنہگار لوگ زیادہ نعمتوں سے سرفراز ہیں اور خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں، اور بنیادی اعتبار سے اس دنیاوی زندگی میں بہت سے ایسے اعمال ہیں جنکی جزا یا سزا کی گنجائش نہیں، مثلاً وہ شخص جس نے ہزاروں بے گناہ انسان کو قتل کر دیا ہو اسکو ایک بار سے زیادہ قصاص نہیں کیا جا سکتا اور باقی تمام جرائم و فسادات اور سارے ظلم بغیر سزا کے رہ جائیں گے، حالانکہ عدل پروردگار کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر کسی نے چھوٹے سے چھوٹا بھی اچھا یا برُا کام کیا ہے تو اس کو اس کا نتیجہ ملنا چاہیے۔

پس جیسا کہ یہ دنیا آزمائش اور امتحان کا مقام ہے ویسے ایک دوسرا مقام ہونا چاہیے جہاں جزا اور سزا ملے اور انسان کے اعمال کا نتیجہ سامنے آئے اور ہر فرد اپنے مناسب مقامات تک پہنچ جائے، تا کہ خدا کی عدالت عینی طور سے محقق ہو جائے۔

اسی بیان کے ذیل میں یہ بھی واضح ہوتا ہے آخرت، انتخاب راہ اور تکلیف کو انجام دینے کی جگہ نہیں ہے، آئندہ انشاء اللہ اس سے بھی مفصل بحث کریں گے۔

سوالات:

١۔ حکمت الٰہی کا نظام احسن سے کیا رابطہ ہے؟ شرح کیجئے؟

٢۔ برہان حکمت کو دو تقریروں کے ذریعہ بیان کیجئے؟

٣۔ اس برہان سے اصل قیامت کے اثبات کے علاوہ اور کون سا دوسرا نکتہ سمجھ میں آتا ہے؟

٤۔ اس دنیا میں انسان کی خلقت کے مقصد کی وضاحت کیجئے؟

٥۔ برہان عدالت کو تفصیل کے ساتھ بیان کیجئے؟

٦۔اس برہان سے کون سا خاص نکتہ حاصل ہوتا ہے؟

پینتالیسواں درس

قرآن میں قیامت کا تذکرہ

مقدمہ

قیامت کا انکار بے دلیل ہے۔

قیامت کے مانند دوسرے حوادث۔

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے۔

سبزوں کا اُگنا۔

اصحاب کہف کا سونا۔

حیوانوں کا زندہ ہونا۔

بعض انسانوں کا زندہ ہونا۔

مقدمہ:

قرآن مجید میں قیامت کو ثابت کرنے یا منکرین قیامت سے احتجاج کرنے کے متعلق جو آیتیں موجود ہیں، ان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔وہ آیتیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ منکرین قیامت کے پاس قیامت کے انکار کے اوپر کوئی دلیل نہیں ہے یعنی ان کے پاس انکار قیامت کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

۲۔وہ آیاتِ کریمہ جو قیامت کے مانند رونما ہونے والے دوسرے حوادث کی طرف اشارہ کرتی ہیں تا کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ قیامت کا واقع ہونا بعید از قیاس نہیں ہے

۳۔وہ آیات جو قیامت کے منکرین کے شبہات کو رد اور اس کے واقع ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔

٤۔وہ آیتیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی کہ قیامت خدا کا ایک حتمی اور سچا وعدہ ہے جس میں تبدیلی نہیں آسکتی،اور درحقیقت قیامت کے برپا ہونے کو سچّے خبر دینے والے کی خبر کے ذریعہ ثابت کرتی ہیں۔

٥۔وہ آیات شریفہ جو قیامت کی ضرورت پر عقلی دلیلوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں،درحقیقت آیاتِ کریمہ کے ابتدائی تین گروہ امکانِ وقوع قیامت سے متعلق ہیں اور دوسرے دو گروہ قیامت کی ضرورت سے متعلق ہیں۔

قیامت کا انکار بے دلیل ہے۔

قرآن مجید نے باطل عقائد رکھنے والوں کے مقابل میں احتجاج کی جو روش اپنائی ہے وہ یہ ہے کہ ان سے دلیل کا مطالبہ کیا ہے تا کہ یہ ظاہر اور واضح ہو جائے کہ ان کے فاسد اور باطل عقائد عقل و منطق کی بنیاد پر نہیں ہیں،چنانچہ کئی آیتوں میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ۔

(قُلْ هٰاتُوا بُرْهٰانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰادِقِينَ)(۱)

اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل لے کر آؤ اور اسی کے مانند دوسرے مقامات پر بھی اسی لب ولہجہ میں ارشاد ہوا کہ ایسے غلط عقیدہ رکھنے والے کسی واقعی اور دلیل کے ذریعہ ثابت چیز پر عقیدہ نہیں رکھتے، بلکہ بے دلیل وہم وگمان اور غیر واقعی خیالات پر ہی اکتفا کرتے ہیں(۲) منکرین قیامت کے متعلق فرماتا ہے۔

(وَقٰالُواْ مٰا هِ اِلاَّ حٰاتُنَا اَلدُّنْيٰا نَمُوتُ وَنَحْيٰى وَمَا يُهْلِكُنَا اِلاَّ اَلدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلاَّ يَظُنُّونَ)(۳)

اور یہ لوگ کہتے ہیں، کہ یہ صرف زندگانی دنیا ہے اسی میں مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو ہلاک کر دیتا ہے اور انہیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ صرف ان کے خیالات ہیں اور بس۔

اور اسی طرح دوسری آیاتِ شریفہ میں بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ قیامت کا انکار صرف وہم وگمان اور بغیر کسی دلیل وبرہان کے ہے(٤) اگر چہ ممکن ہے کہ اگر یہ بے دلیل مدعیٰ خواہشات اور ہوا پرستی کا پیش خیمہ بن جائے تو ہوا پرست افراد سے قبول کر لیں گے،(٥)

....

۱۔ بقرہ۔ آیت ۱۱۱، انبیائ۔ آیت ٢٤، نمل۔ آیت ٦٤

۲۔ مومنون ۱۱۷، نساء ۱٥۷، انعام ۱۰۰، ۱۱۹، ۱٤۸، کہف ٥، حج ۳، ۸، ۷۱، عنکبوت ۸، روم ۲۹، لقمان ۲۰، غافر ٤۲ زخرف ۲۰ نجم ۲۸،

۳۔ جاثیہ ۲۴، ۲۵۔ قصص ۳۹، کہف ۳۶، ص ۲۷ جاثیہ ۳۲، انشقاق ۱۴، ۱۵۔ قیامت ۵

لیکن آہستہ آہستہ (تدریجاً) یہ مدعیٰ ارتکاب گناہ کی وجہ سے اعتقاد اور یقین کی صورت اپنا لے گا (۱) حتیٰ کہ لوگ اپنے اس موہوم عقیدہ پر ہٹ دھرمی (سخت پابندی) سے کام لینے لگیں گے (۲)

قرآن مجید نے قیامت کا انکار کرنے والوں کے قول کو نقل کیا ہے جو نہایت بعید اور اگر ان لوگو ں نے کوئی شبہ بھی کیا تو وہ بھی نہایت ہی ضعیف اور سست اور بے اہمیت ہے (۳)

اب ایسی صورت میں ایک طرف تو پروردگار قیامت سے مشابہ حوادث کا ذکر کرتا ہے تا کہ وقوع قیامت کے بعید ہونے کا تصور دور ہو جائے (۴)

اور دوسری طرف اُن شبہات کے جوابات کی طرف اشارہ کر رہا ہے تا کہ اِس سلسلے میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہ جائے اور قیامت کا آنا ثابت ہو جائے لیکن صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا اور اِس وعدۂ خدا کے حتمی اور ضروری ہونے اور وحی کے ذریعہ لوگوں پر حجت تمام کرنے کے سا تھ ساتھ قیامت کی ضرورت پر عقلی دلیلوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جیسا کہ آئندہ درسوں میں بیان کیا جائے گا۔

....

۱۔ روم۔ آیت ۱۰، مطففین ۱۰۔ ۱۴،

۲۔ نحل۔ آیت ۳۸

۳۔ ھود ۔ آیت ۷ ، اسراء ۔آیت ۵۱ ،صا فا ت ۔آیت ۱۶، ۵۳،

دخان۔آیت ۳٤، احقاف۔آیت ۱۸

٤۔وہ امور جو ایک دوسرے کے مانند ہیں حکم واحد کا درجہ رکھتے ہیں خواہ امکان کا حکم ہو یا عدم امکان کا حکم

(حکم الامثال فی ما یجوز و ما لا یجوز واحد)

قیامت کے ماند دوسرے حوادث

(الف) سبزوں کا اگنا۔

مرنے کے بعد انسان کا دوبارہ زندہ ہونا اس، حیات مابعدالموت کے مانند ہے اور اس کی مثال سبزہ اُگنے کی طرح ہے جس طرح زمین میں سبزہ خشک ہوجانے کے بعد دوبارہ اگتا ہے اسی طرح انسان مرنے کے بعد زندہ ہوگا، اگر انسان روزمرہ وقوع میں آنے والے واقعات کو پیش نظر رکھے اور اس میں غور وفکر کرے، تو یہ اُس کے لئے اپنی موت کے بعد دوبارہ حیات کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں اور چونکہ انسان روزمرہ کی ان تمام چیزوں کو دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے، لہٰذا ایسے مناظر کو وہ کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا، اور بہت ہی آسان اور سادہ سمجھتا ہے ورنہ پیدائش کے لحاظ سے سوکھی ہوئی گھاس کے دوبارہ سبز ہونے اور انسان کے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اس عادت کو ختم کرنے کے لئے متعدد مرتبہ لوگوں کی توجہ مبذول کرائی ہے

انسان کے دوبارہ زندہ ہونے کواس سے تشبیہ دی ہے(۱)اورارشادفرماتا ہے

(فَانْظُرْ اِلٰی آثَارِ رَحْمَةِ اللّٰهِ کَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ ذَالِكَ لَمُحْیِی الْمَوْتٰی وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر)(۲)

پس رحمت خدا کے آثار کوغور سے دیکھو کہ کیسے زمین کومردہ ہونے کے بعدزندہ کرتا ہے بیشک (وہی زمین کا زندہ کرنے والا) مردوں کودوبارہ زندہ کرتاہےاوروہ ہرچیز پرقادرہے

....

۱۔اعراف ۵۷ ،حج ۵ ۔۶ ،روم ۱۹، فاطر ۹ فصلت ۱۹ زخرف ۱۱، ق ۱۱،

۲۔روم ۵۰

(ب)اصحاب کہف کا سونا۔

قرآن مجیداصحاب کہف کی عجیب وغریب داستان کوبیان کرنے کے بعدارشادفرماتا ہے۔

(وَ کَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَیْهِمْ لِیَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَاللّٰهِ حق وَأَنَّ السَّاعَةَ لَارَیْبَ فِیْهَا)(۱)

اوراس طرح ہم نےقوم کوان کے (اصحاب کہف) حالات پرمطلع کردیا،تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ کاوعدہ سچاہےاورقیامت آئے گی،اس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں ہے۔

حقیقتا ایسا عجیب وغریب حادثہ کہ چندافرادصدیوں (شمسی اعتبار سے تین سوسال اورقمری لحاظ سے تین سونوسال،سوتے رہیں،اوراس کے بعد بیدارہوجائیں، انسان کوقیامت کی طرف متوجہ کرنے اور یہ واضح کرنے کے لئے کہ قیامت کاوقوع قریب قیاس ہےاوربعید

نہیں ہے نہایت موثر اور کامیاب ہے کیونکہ انسان کا سونا موت کے مثل ہے (النوم اخ المو ت) (سونا موت کا بھائی ہے) اور جا گنا اسی کی حیات کے مانند ہے جو موت کے بعد حا صل ہو، لیکن نیند کے عالم میں یا سونے کی حالت میں عموماً انسان کا جسم اپنے فطری اور طبیعی حالت (زندگی کے آ ثار کے ساتھ بیولوجیک) پر برقرار رہتا ہے اور روح کا جسم میں واپس آ نا کوئی تعجب خیز، بات نہیں ہے لیکن اگر یہی جسم تین سوسال سوتا رہے اور وہ بھی بغیر آ ب و دانہ کے تو ایسی صورت میں بدن کے فطری نظام میں خلل پڑ جانا چاہیے اور اس جسم کو تباہ و برباد ہو جانا چاہیے اور روح کو دوبارہ اس میں آنے کی صلاحیت کھو دینا چاہیے، لیکن یہ غیر معمولی معجزہ الٰہی انسان کی فکر کو اس معمولی نظام کے پسِ پردہ دوسری حقیقت کی طرف متو جہ کرتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ روح کا جسم میں دوبارہ پلٹ کر آ نا، ہمیشہ عادی اور معمولی اسباب وشرائط کے ہونے یا نہ ہونے کا محتاج نہیں ہے لہذا انسان کی دوسری زندگی بھی اگر چہ اس طبیعی اور فطری نظام کے خلاف ہی کیوں نہ ہو کوئی ممانعت نہیں رکھتی وعدۂ پروردگار کے مطابق محقق ہو کر رہے گی۔

....

۱۔کہف۔آیت۲۱

(ج)حیوانات کا زندہ ہونا۔

اسی طرح قرآن کریم غیر عادی طریقہ سے زندہ ہونے والے چند حیوانوں کی طرف بھی اشارہ کررہاہے جن میں سے وہ چار پرندے ہیں جو حضرت ابراہیم کے ہاتھوں زندہ ہوئے تھے (۱) دوسرے وہ (گدھا جس پر جناب عزیر سوار ہوتے تھے) اس کے بھی دوبارہ زندہ ہونے کی طرف قرآن نے اشارہ کیاہے اور جب حیوان کا زندہ ہونا ممکن ہے تو انسان کا زندہ ہونا بھی ناممکن نہیں ہوگا

(د) اسی دنیا میں بعض انسانوں کا زندہ ہونا۔

سب سے زیادہ مہم بات یہ ہے کہ بعض افراد اسی دنیا میں دوبارہ زیورِ حیات سے آراستہ ہوئے ہیں کہ جس کے چند نمونے خود قرآن مجید نے بیان فرمائے ہیں، انھیں افراد میں سے ایک بنی اسرائیل کے نبی ہیں جو ایک سفر کے دوران ایک ایسے قریے سے گذرے، جہاں کے لوگ ہلاک اور نابود ہو چکے تھے، اوران کے آثار فنا ہو چکے تھے جب آپ کی نظر ان افراد پر پڑی تو بے ساختہ ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ افراد دوبارہ کیوں کر زندہ ہو سکتے ہیں؟ اسی اثنا میں پروردگار نے ان کی روح قبض کر لی، اور پورے سو سال کے بعد دوبارہ زندہ کیا، اور ان سے سوال کیا کہ تم اس مقام پر کتنا سوئے؟ وہ جو کہ گویا ابھی سوکر جاگے تھے بولے ایک روز، یا اس سے بھی کچھ کم، خطاب ہوا نہیں بلکہ تم کو یہاں پر سو سال ہو گئے دیکھو ایک طرف تمہارا آب ودانہ بالکل صحیح وسالم ہے لیکن دوسری طرف تمھارے گدھے کا کیا حال ہے جس کی ہڈیاں بکھری ہوئی ہیں! اب صرف یہ دیکھو کہ ہم کیسے ان ہڈیوں کو آپس میں جوڑتے ہیں

اوراس پر گوشت چڑھاتے ہیں اوراسے دوبارہ زندہ کردیتے ہیں(۲)؟!

....

۱۔بقرہ۔آیت۲٦۰

۲۔بقرہ۔آیت۲۵۹

دوسرواقعہ:

بنی اسرائیل کاوہ گروہ جس نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ جب تک ہم خدا کواپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں گے، ہرگز ایمان نہیں لائیں گے،لہٰذا خدا نے انھیں آسمان سے ایک بجلی گرا کر ہلاک کردیالیکن پھرحضرت موسیٰ کی درخواست پرخدا نے انھیں دوبارہ زندہ کردیا(۱)۔

ایک اورواقعہ بنی اسرائیل کا یک شخص حضرت موسیٰ کے زمانے میں قتل کردیا گیا تھااورذبح کی ہوئی گائے کے ایک حصے کواس سے مس کیا گیااوروہ زندہ ہوگیااس کی تفصیل سورۂ بقرہ میں موجود ہے نیزاس سورہ مبارکہ کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے پھرارشاد ہوا۔

(کَذٰلِکَ یُحیِ اللّٰہُ المَوْتیٰ وَیُرِیْکُمْ آیاٰتِہِ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُونَ)(۲)

اسی طرح خدامردوں کوزندہ کرتا ہےاوراس کی نشانیوں کوتمھارے سامنے رکھتا ہے تا کہ شاید تمھیں کچھ عقل آجائے۔

اوراسی طرح حضرت عیسیٰ کے معجزے کے ذریعہ(۳)بعض مردوں کازندہ ہونا، یہ وہ نمونے ہیں جن کوقیامت کے وقوع کے امکان کے سلسلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

....

۱۔سورہ بقرہ۔آیت ٥٥، ٥٦

۲۔سورہ بقرہ۔آیت ٦٧، ٧٣

۳۔آل عمران۔آیت ٤٩، مائدہ۔آیت ١١٠

سوالات:

۱۔قرآن قیامت کا انکار کرنے والوں کے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے؟ بیان کیجئے ؟

۲۔سبزہ کا اگنا انسان کے دوبارہ قیامت میں زندہ ہونے سے کیا شباہت رکھتا ہے؟ اس سے متعلق قرآن کا کیا بیان ہے؟

۳۔اصحاب کہف کی داستان سے، قیامت سے متعلق کون سا نکتہ سمجھ میں آتا ہے؟

٤۔حضرت ابراہیم کے ہاتھوں پرندوں کے زندہ ہونے کو بیان کرتے ہوئے قیامت کے موضوع سے اس کے رابطہ کو بیان کیجئے ؟ اور شرح پیش کیجئے ؟

٥۔قرآن مجید میں زندہ ہونے والے میں کن لوگوں کا ذکر موجود ہے؟

چھیالیسواں درس

منکرین کے شبہات کے لئے قرآن کا جواب

فنا ہونے کے بعد دوبارہ پلٹنے کا شبہ۔

جو مندرجہ ذیل بحثوں پر مشتمل ہے۔

بدن میں دوبارہ حیات پانے کی قابلیت نہ ہونے کا شبہ۔

فاعل کی قدرت کے بارے میں شبہ۔

عالم کے علم کے بارے میں شبہ۔

منکرین قیامت کے مقابلہ میں قرآن کریم نے جو احتجاج کیا ہے اور جو جوابات دئے ہیں ان کے لب ولہجہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قیامت کے انکار کرنے والوں کے ذہن میں پہلے سے یہ سارے شبہات پائے جاتے تھے، جس کو ہم جوابات کی مناسبت سے اس طرح ترتیب دیتے ہیں۔

۱۔فنا ہونے کے بعد دوبارہ پلٹنے کا شبہ۔

اس سے پہلے اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ قرآن کریم ان لوگوں کے مقابلہ میں جو یہ کہتے تھے، کہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد درحالیکہ اس کا جسم پاش پاش ہو کر نابود ہوگیا ہے وہ دوبارہ زندہ ہوجائے؟ جواب دیتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے

وجود کی شناخت تمہاری روح کے ذریعہ ہے نہ کہ تمہارے بدن کے اعضا و جوارح کے ذریعہ جو زمین میں بکھر جاتے ہے(۱)

....

۱۔سجدہ۔آیت ۱۰۔۱۱

اس گفتگو سے اس بات کا استفادہ ہوتا ہے کہ کافروں کے انکار کا سر چشمہ اور اس کا سبب فلسفہ کا وہی شبہہ ہے جیسے اعادۂ معدوم محال ،،(فنا ہو جانے والی شی کا پلٹنا محال ہے) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے،یعنی ان لوگوں کا گمان تھا کہ انسان اسی مادی جسم کو کہتے ہیں جو مرنے کے بعد نابود اور فنا ہو جاتا ہے لہذا اگر دوبارہ زندہ ہوگا تو وہ کوئی دوسرا شخص ہوگا، کیونکہ اُس موجود کا پلٹنا جو معدوم (نابود،ختم ہو چکا ہو) ذاتاً ممکن نہیں ہے،

اس شبہ کا جواب قرآن کریم کے بیان سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر انسان کی اپنی پہچان اور اُس کی شخصیت اس کی روح سے وابستہ ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ معاد و قیامت،اعادۂ معدوم (فنا شی کا پلٹنا) نہیں ہے، بلکہ اُس موجود کی روح کی بازگشت کا نام ہے۔

۲۔بدن میں دوبارہ حیات پانے کی صلاحیت نہ ہونے کا شبہ۔

پہلا شبہ قیامت کے امکان ذاتی سے مربوط تھا اور یہ شبہہ اس امکان وقوعی سے متعلق ہے(یعنی آیا ایسا واقع ہونا ممکن ہے)یعنی اگر چہ بدن میں روح کا پلٹ آنا عقلی لحاظ سے محال اور ناممکن نہیں ہے اور فرض کرنے کی صورت میں کوئی تناقض نہیں پایا جاتا، لیکن اس کا

واقع ہونا بدن کی قابلیت وصلاحیت کے اُوپر موقوف ہے کہ جس کو آستہ آستہ تدریجی صورت میں فراہم ہونا چاہیے، مثلاً رحم میں ایک نطفہ قرار پائے اوراس کے رشد ونمو کی ساری مناسب شرطیں مہیا ہوں، تا کہ وہ آہستہ آہستہ مکمل جنین کی شکل اختیار کرلے، اور ایک انسان کی صورت میں بدل جائے، لیکن وہ بدن جو گلنے کے بعد ختم ہوگیا ہے اس میں اب حیات کی صلاحیت نہیں پائی جاتی کہ دوبارہ زندہ ہوسکے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دنیا کا یہ ظاہری نظام صرف ممکن نظام نہیں اور تجربات کی بنیاد پراس دنیا میں جن اسباب اور علتوں کو پہچانا گیا ہے وہ منحصر ومحدود نہیں ہیں، اوراس کی دلیل یہ ہے کہ اسی دنیا میں غیر معمولی حوادث وجود میں آئے ہیں، جیسے بعض حیوانوں کا زندہ ہونا یا بعض انسانوں کا زندہ ہونا، قرآن مجید میں مذکورہ بعض غیر معمولی حوادث کے ذریعہ اس جواب کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

۳۔فاعل کی قدرت کے بارے میں شبہ۔

ایک دوسرا شبہ یہ پایا جاتا ہے کہ ایک واقعہ کے وجود میں آنے کے لئے ذاتی امکان اور قابلیت کے علاوہ فاعل کے قدرت کی بھی شرط پائی جاتی ہے، اور یہ کہاں سے ثابت ہے کہ خدا مردوں کو زندہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے؟

یہ ہے بے بنیاد شبہ ان لوگوں کی ایجاد ہے جو خدا کی لامحدود قدرت کو نہیں سمجھ سکے اوراس کا جواب یہ ہے کہ خدا کی قدرت کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے اور ہر ممکن شی سے، اسکا تعلق

ہے، جیسا کہ اِس بے کراں عظیم دنیا کو اُس نے پیدا کیا ہے۔

(اَوَلَمْ یرَوا أَنَّ اَللهَ اَلَّذِی خَلَقَ اَلسَّمَوَاتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یعْ بِخَلْقِهِنَّ بِقَٰدِرٍ عَلَىٰ أَن یُحیِ الْمَوتَیٰ بلىٰ اِنَّه عَلَىٰ کُلِّ شَيءٍ قَدِیر)(۱)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور اس کے پیدا کرنے میں اسے کوئی دقت اور پریشانی نہیں ہوئی وہ خدا مردوں کو دوبارہ زندہ بھی کرسکتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے،

اس کے علاوہ دوبارہ زندہ کرنا پہلی بار پیدا کرنے سے زیادہ سخت بھی نہیں ہے کہ جس میں زیادہ قدرت کی ضرورت پڑے، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے پہلی خلقت سے آسان ہے کیوں کہ دوبارہ زندہ کرنے میں سوائے روح کے پلٹنے کے اور کچھ نہیں ہے،

(فَسيَقُولُونَ مَن يُعِيدُ نَا قُلِ الَّذ فَطَرَ كُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَسيُنغِضُونَ اِلَيْك رَءُ وسَهُمْ)(۲)

ہیں گے کہ کون ہم کو پلٹائے گا (اور دوبارہ زندہ کرے گا) کہدو کہ وہی جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا ہے بس وہ لوگ تمہارے سامنے سر ہلائیں گے (اور اس جواب پر تعجب کریں گے۔

....

۱۔احقاف ۳۳، یس ۸۱، اسراء ۹۹ صافات۔آیت ۱۱، نازعات۔آیت ۲۷

۲۔اسراء۔آیت ۵۱ عنکبوت۔آیت ۱۹۔۲۰، ق۔آیت ۱۵، واقعہ۔آیت ۶۲ یس ۸۰ حج ۵، قیامت ۴۰،

(وَهُوَ اَلَّذِی یَبْدَءُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَیْه)(۱)

اور وہی ایسا ہے جو خلقت اور پیدائش کا آغاز کرتا ہے اور پھر اس کو پلٹا دیتا ہے اور یہ (پلٹانا) اس کے لئے بہت آسان ہے۔

٤۔ فاعل کے علم کے بارے میں شبہ۔

ایک اور شبہ یہ ہے کہ اگر خداوند عالم انسانوں کو زندہ کرے اور اُن کو اُن کے اعمال کی جزا یا سزا دے تو اس کے لئے اُسے ضروری ہوگا کہ پہلے وہ بے شمار اجسام کو ایک دوسرے سے الگ کرے تاکہ ہر ایک کی روح کو اسی کے بدن میں داخل کرئے ، اور دوسری طرف سارے اچھے اور برُے کاموں کو بھی یاد رکھے، تاکہ اسی کے لحاظ سے جزا یا سزا تجویز کرے اور یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ سارے بدن جو مٹی بن چکے ہیں اور اس کے ذرات آپس میں مل گئے ہیں ان کو ایک دوسرے سے جدا کر کے اُس کو پہچانے؟ اور کیسے ممکن ہے کہ ہزاروں بلکہ کروڑوں سال تک ہر انسان کے اعمال ورفتار وکردار کا ریکارڈ محفوظ رکھے اور اس کی نظارت کرتا ہے اور پھر ان سب کا فیصلہ کرے؟ یہ شبہ بھی ان لوگوں کی ایجاد واختراع ہے جنھوں نے خدا کے لامحدود علم کو نہیں پچانا اور خدا کے علم کو اپنے ناقص اور محدود علم پر قیاس کرتے ہیں اور اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کے علم کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے اور اس کا علم ساری چیزوں کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے اور خداوند عالم کبھی بھی کسی چیز کو فراموش نہیں کرتا

قرآن مجید فرعون کے قول کو اِس طرح نقل کر رہا ہے کہ اُس نے حضرت موسیٰ سے کہا۔

(فَمَا بَالُ الْقُرُ ونِ الاٗ ولٰی)

اگر خدا ہم سب کو زندہ کرے اور ہم سب کا حساب و کتاب کرے تو وہ لاکھوں کروڑوں لوگ جو ہم سے پہلے مر گئے اور ختم ہو گئے ان کا کیا ہوگا؟ حضرت موسیٰ نے جواب دیا (عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّ لاٰ یُضِلُّ رَبِّ وَلاٰ یَنسیٰ)(۲) ان سب کا علم پروردگار کے پاس کتاب

....

۱۔روم۔آیت ۲۷

۲۔طہٰ۔آیت ۵۱۔۵۲،ق۔آیت ۲۔۴

میں محفوظ ہے اور میرا خدا گمراہ نہیں ہوتا اور کوئی چیز بھولتا نہیں ہے۔

ایک آیت میں آخر کے دو شبہوں کا جواب اس طرح بیان ہوا ہے۔

(قُلْ یحْیِیهَا الَّذِی اَنشَأَ هَا أَوَّل مرةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلقٍ عَلِیم)(۱)

(اے پیغمبر) کہہ دیجئے مردوں کو وہی زندہ کرتا ہے جس نے انہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق کو جانتا ہے۔

....

۱۔یس۔آیت ۷۹

سوالات:

۱۔فنا ہونے کے بعد دوبارہ پلٹنا محال ہے،اس شبہ اوراس کا جواب بیان کیجئے ؟

۲۔بدن میں دوبارہ حیات پانے کی قابلیت نہ ہونے کا شبہ اوراس کا جواب تحریر کریں؟

۳۔فاعل کی قدرت سے متعلق شبہ اوراس کا جواب بیان کریں؟

٤۔فاعل کے علم سے متعلق شبہ اوراس کا جواب، بیان کریں؟

سینتالیسواں درس

قیامت کے بارے میں خدا کا وعدہ

مقدمہ:

خدا کا سچا اور یقینی وعدہ

عقلی دلائل کی طرف اشارہ

مقدمہ

قرآن مجید ایک طرف تو خداوند عالم کی جانب سے اپنے بندوں کے لئے بھیجے گئے پیغام کے عنوان سے قیامت کے وقوع پر تاکید کررہا ہے اور اس کو ایک حتمی اور خدا کا سچا وعدہ شمار کرتا ہے، جس میں وعدہ خلافی کا امکان نہیں ہے، اور اس کے ذریعہ لوگوں پر اپنی حجت تمام کررہا ہے، اور دوسری طرف قیامت کی ضرورت پر عقلی دلائل کی طرف اشارہ کررہا ہے، تاکہ لوگوں کی عقلی لحاظ سے قیامت کو پہچاننے کی خواہش پوری کرے اور اپنی حجت کو دوگنا کردے، اس لئے ہم قیامت کے متعلق قرآنی بیانات کو دو حصوں میں تقسیم کررہے ہیں۔

خدا کا سچا (حتمی) وعدہ:

قرآن کریم نے قیامت کے آنے اور عالم آخرت میں تمام انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے کو ایک یقینی اور غیر قابل شک وتردید امر جانا ہے، اور ارشاد فرماتا ہے:

(إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا)١

....

١۔ غافر ٥٩ اوررجوع کریں آل عمران ٩، ٢٥ ،نسائی ٨٧ ،نعام ١٢ کہف ٢١ حج ٧ شوریٰ ٧ ،جاثیہ ٢٦، ٣٢،

اوراس کوایسا سچا وعدہ شمار کیا ہے جس میں خلاف کا تصور نہیں ہوسکتا، اورفرمایا:

(بَلَى وعداً عَلَيهِ حَقاً) (١)

اے رسول کہہ دو کہ وہ ضرور ایسا کرے گا اس پر اپنے وعدہ کی وفا لازمی اور ضروری ہے:

اور متعدد مرتبہ اس کے واقع ہونے کے سلسلے میں قسمیں کھا چکا ہے جیسا کہ ارشاد ہے

(قُل بَلىٰ وَرَبِّي لَتُبعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِما عَمِلتُم وَ ذالِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِير)(٢)

اے رسول! تم کہہ دو کہ ہاں اپنے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے جو کام تم کرتے ہو اس کے بارے میں تم کو ضرور بتایا جائے گا اور یہ کام خدا پر آسان ہے۔

لوگوں کو اس سے ہوشیار اور آگاہ کرنا انبیاء کا مہم ترین وظیفہ اوران کی اہم ذمہ داری جانتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

(يُلقِي الرَّوحَ مِن أَمرِهِ عَلىٰ مَن يَشَاءُ مِن عِبَادِهِ لِيُنذِرَ يَومَ التَّلاقِ)(٣)

اپنے حکم سے روح نازل کرتا ہے تا کہ وہ بندوں کو قیامت کے دن سے ڈرائے جس دن وہ لوگ قبروں سے نکل پڑیں گے۔

اوراس کے منکرین کے لئے ابدی بدبختی اور جہنم کا عذاب معین کیا ہے اورفرمایا:

(وَاَعتَدنَا لِمَن كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيراً)(٤)

جس شخص نے قیامت کو جھوٹ سمجھا اس لئے ہم نے جہنم کو تیار کرر کھا ہے۔

اس بنا پر جو اس کتاب (قرآن) کی حقانیت تک پہنچ گیا ہے وہ قیامت کے انکار یا اُس میں شک کرنے کا کوئی بہانہ نہیں کرسکتا، پہلے حصہ میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ قرآن مجید کی حقا نیت ہر حق

....

۱۔نحل ۳۸، آل عمران ۹، ۱۹۱، نساء ۱۲۲، یونس ٤، ٥٥، کہف ۲۱، انبیاء ۱۰۳، فرقان ١٦، لقمان ۹، ۳۳، فاطر ٥ زمر ۲۰ نجم ٤٧، جاثیہ ۳۲ ۱ احقاف ۱۷،

۲۔تغابن ۷، یونس ٥٣، سبا ۳،۔

۳۔غافر ١٥، انعام ۱۳۰، ١٥٤، رعد ۲ شوریٰ ۷، زخرف ٦١ زمر ۷۱

٤۔فرقان ۱۱، اسراء ۱۰، سباء ۸، مومنون ٧٤،

طلب اور انصاف پسند انسان کے لئے قابل درک وفہم ہے اس وجہ سے کوئی بھی شخص اس کو قبول نہ کرنے کا کوئی عذر پیش نہیں کرسکتا، مگر وہ شخص جس کی عقل میں کوئی قصور پایا جاتا ہو یا کسی اور سبب سے اس کی حقانیت کو درک نہ کر سکے۔

عقلی دلائل کی طرف اشارہ

قیامت کی ضرورت پرقرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں عقلی استدلال کالب ولہجہ پایا جاتا ہے کہ جس کو برہان حکمت اور برہان عدالت برناظر مانا جاسکتا ہے جیسا کہ استفہامِ انکاری کی صورت میں ارشادہورہاہے:

(اَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَا کُمْ عبثاً وَأَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرجَعُوْنَ)(۱)

کیاتم نے یہ گمان کرلیاہے کہ ہم نے تمھیں بیکار پیدا کیاہے اورتم ہماری طرف پلٹائے نہیں جاؤ گے؟ یہ آیہ شریفہ کھلے انداز میں اس بات پردلالت کرتی ہے کہ اگر قیامت اورخدا کی طرف بازگشت نہ ہوتی ،تواس دنیا میں انسان کا پیدا ہونا بیکار اور بے مقصد ہوتا چونکہ پروردگار بیکار اور بے مقصد کام انجام نہیں دیتا ،لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اس دنیا کے علاوہ کوئی دوسری جگہ ہے ،جہان،اپنی طرف بازگشت کے لئے قائم کرے گا۔

یہ برہان ایک استثنائی قیاس ہے جس کا پہلا مقدمہ ایک قضیہ شرطیہ ہے جواس بات پردلالت کرتا ہے کہ اس دنیامیں انسان کے پیدا ہونے کا حکیمانہ مقصد اس وقت پورا ہوگا، جب اِس دنیا کی زندگی کے بعد انسان اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پلٹ کرجائے اورآخرت میں اپنے اعمال کے نتیجے کوحاصل کرے اورہم نے اس ملازمہ کو برہان حکمت کے ذیل میں بیان کیا تھا لہذادوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

....

۱۔مومنون ۱۱۵،

لیکن دوسرا مقدمہ (خدا بیکار اور بے مقصد کام انجام نہیں دیتا) یہ وہی حکمت الٰہی اوراس کے

کام کے عبث و بیہودہ نہ ہونے کا مسئلہ ہے جو خدا شناسی کے باب میں ثابت ہو چکا ہے اور بر ہان حکمت کے بیان میں جس کی وضاحت کی جا چکی ہے، لہٰذا مذکورہ آیہ شریفہ مذکورہ برہان پر پوری طرح قابل انطباق ہے۔

اب ہم مزید اس بات اضافہ کرتے ہیں کہ انسان کی پیدائش، اس دنیا کی پیدائش کے لئے ہدف غائی اور اصلی مقصد کی حیثیت رکھتی ہے اگر اس دنیا میں انسان کی زندگی بیکار اور بے ہدف ہو اور ایسی ہو جس میں کوئی حکیمانہ مقصد نہ پایا جائے تو اس دنیا کی پیدائش بھی بیکار رہے، بے مقصد ہے، اور وہ باطل ہو جائے گی اس نکتہ کا استفادہ ان آیتوں سے کیا جا سکتا ہے جو عالمِ آخرت کے وجود کو دنیا کی پیدائش کے حکیمانہ ہونے کا تقاضہ جانتی ہیں اور جیسا کہ عقلمندوں (اولوالالباب) کی صفتوں کے متعلق

ارشاد ہوتا ہے۔

(وَ یَتَفَکَّرُونَ فِی خَلقِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلاً سُبحانَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ)(۱)

اور وہ لوگ آسمانوں اور زمینوں کی خلقت کے بارے میں غور وفکر کرتے ہیں (اور پھر کہتے ہیں) پروردگار! تو نے ان چیزوں کو بیکار نہیں پیدا کیا تو پاک و پاکیزہ ہے (اس چیز سے کہ بیہودہ و بے مقصد کام کرے) پس مجھے آتش جہنم سے محفوظ رکھ۔

اس آیت سے یہ استفادہ ہوتا ہے دنیا کی خلقت کے بارے میں غور وفکر کرنا، انسان کو پروردگا رکی حکمت کی طرف متوجہ کر دیتا ہے یعنی اس عظیم کائنات کی خلقت کے وقت خدا کی نگاہ میں ایک حکیمانہ مقصد تھا اور اس نے اس کو بیکار و بے مقصد پیدا نہیں کیا لہذا اگر کوئی دوسرا عالم مو

جو نہ ہو جو اس دنیا کی خلقت کا آخری مقصد اور ہدف قرار پائے تو خدا کی خلقت کا بیکار بے مقصد ہونا لازم آئے گا

....

۱۔آل عمران ۱۹۱

قرآن حکیم کی آیات کا دوسرا گروہ جو قیامت کی ضرورت پر برہانِ عقلی کی طرف ایک اشارہ ہے اور جو برہان عدالت پر قابل تطبیق ہے(۱)

یعنی عدالتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ نیک اعمال انجام دینے والے کو اس کی جزا اور گنہگاروں کو ان کے کئے کا بدلہ دیا جائے اور ان دونوں کی عاقبت اور انجام کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا جائے نیز دونوں کے درمیان فرق کا قائل ہو جائے ،اور چونکہ اس دنیا میں ایسا کوئی فرق نہیں پایا جاتا لہٰذا ایک دوسرے عالم کو برپا کرنے کی ضرورت ہوگی ،تا کہ خداوند عالم اپنی عدالت کو عینی صورت میں پیش کر سکے جیسا کہ سورۂ جاثیہ میں ارشاد فرماتا ہے۔

(اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّئَاتِ اَن نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ٭ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ)(۲)

کیا برائی اختیار کرنے والوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ ہم انھیں ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کے برابر قرار دیں گے کہ سب کی موت وحیات ایک جیسی ہو یہ ان لوگوں نے نہایت بدترین فیصلہ کیا ہے، اور اللہ نے آسمان اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس لئے بھی کہ ہر نفس کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جا سکے اور یہاں کسی پر ظلم نہیں کیا جائیگا۔

یاد دہانی کے لئے ضروری ہے کہ جملہ (وَخَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ) سے برہان حکمت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ بنیادی طور سے برہانِ عدالت کو بھی برہانِ حکمت کی طرف پلٹایا جاسکتا ہے کیونکہ جیسا کہ ہم نے عدل الٰہی کی بحث کے ذیل میں وضاحت کی تھی کہ عدل حکمت کے مصادیق میں سے ہے۔

....

۱۔ص ۲۸ ،غافر ۵۸ قلم ۳۵ ،یونس ٤

۲۔جاثیہ ۲۱۔۲۲

سوالات:

۱۔قران کریم قیامت کو کیسے ثابت کررہاہےاورلوگوں پراپنی حجت کیسے تمام کرتا ہے؟

۲۔برہانِ حکمت کی طرف کونسی آیات اشارہ کررہی ہیں؟ان کے استقلال کو بیان کیجئے؟

۳۔برہانِ عدالت کی طرف کونسی آیات اشارہ کررہی ہیں ان کے استدلال کو بیان کیجئے؟

٤۔برہانِ عدالت کو برہانِ حکمت کی طرف کس طرح پلٹایا جاسکتا ہے؟

اڑتالیسواں درس

عالم آخرت کی خصوصیات (آخرت کی پہچان)

مقدمہ:
عقل کی روشنی میں آخرت کی خصوصیات

مقدمہ:

انسان جن چیزوں کے بارے میں تجربہ نہیں رکھتا اور جنکو باطنی دلیلوں اور علم حضوری کے ذریعہ نہیں سمجھ سکتا، یا پھر اپنے احساسات کی روشنی میں سے درک نہیں کرسکتا، اس کے بارے میں شناخت کامل حاصل کرن اس کے لئے محال ہے لہٰذا اس نکتہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہمیں اس بات کی توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم آخرت اوراس میں رونما ہونے والے حوادث کو صحیح معنوں میں پہچان سکتے ہیں یا ان کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں، بلکہ ایسے مسائل میں صرف عقل وروایات کے ذریعہ ثابت شدہ اوصاف اور مسلمات پر اکتفا کر لینا ضروری ہے اوراس سے اُوپر پرواز کرنا مناسب نہیں ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ بعض افراد نے یہ سمجھانے کی لا حاصل کوشش کی ہے کہ آخرت بھی اسی دنیا کے مانند ہے اوراس بارے میں یہاں تک آگے بڑھ گئے ہیں کہنے لگے بہشت اسی دنیا میں آسمان کے کسی کرّے یا سیارے میں ہے جدید علمی ترقی کے ذریعہ ایسے وسائل ایجاد کئے جاسکتے ہیں کہ جن کی مدد سے وہاں منتقل ہوا جا سکتا ہے جہاں نہایت راحت وآرام کے ساتھ زندگی گذارای جاسکتی ہے۔

اور دوسری جانب بعض لوگ توسرے سے ہی آخرت کا انکار کر بیٹھے ہیں اورانکے تصور میں آخر

ت اور جنت صرف اخلاقی قدر ومنزلت کا نام ہے یعنی قوم وملت کے خدمت گذار اور نیک افراد اُس سے لو لگائے ہیں اور ان کی نظر میں دنیا وآخرت کے درمیان فرق صرف فائدے اور قدر ومنزلت کی بنیاد پر ہے۔

ایسی صورت میں ہم سب سے پہلے گروہ اول سے سوال کرتے ہیں کہ بہشت آخر اگر آسمان کے کسی سیّارے پر ہے اور آنے والی نسل وہاں پہنچے گی تو قیامت کے دن انسانوں کا دوبارہ زندہ ہونا، اور ایک جگہ پر جمع ہونا جس کی قرآن مجید نے بھی تصریح فرمائی ہے اس کے کیا معنی ہوں گے؟ اور کیسے گذشتہ قوموں کے اعمال کی جزا اور سزا وہاں دی جائے گی؟ دوسرے گروہ سے بھی ہمارا یہی سوال ہے کہ جب جنت صرف اخلاقی اہمیت وضرورت کا نام ہے تو جہنم بھی خلافِ اخلاقی چیزوں کے علاوہ کوئی دوسری شئے نہیں ہوگی اور ایسی صورت میں قرآن مجید نے جو قیامت کے وقوع پر اور انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے پر اتنی تاکید کی ہے اس کا کیا ہوگا؟ کیا یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ انبیاء (ع) قیامت اور آخرت کے اسی مفہوم کو صراحت کے ساتھ بیان کردیتے تاکہ اپنے اُوپر ہونے والے تمام اعتراضات اور تہمتوں سے محفوظ رہتے اور ان پر دیوانگی اور افسانہ گوئی وغیرہ کے الزامات نہ لگتے؟

ان سب باتوں اور بحثوں کے بعد اختلافات اور مناظرات جو فلاسفہ اور متکلمین کے درمیان واقع ہوئے ہیں کہ آیا معاد (قیامت میں دوبارہ زندہ ہونا اور حساب وکتاب ہونا) جسمانی ہے یا روحانی؟ کیا یہ مادی دنیا بالکل فنا ہوجائے گی یا نہیں؟ کیا یہ اخروی جسم، وہی دنیاوی جسم ہے یا اس کے مثل و مانند کوئی دوسری شی ہے؟ اگر چہ یہ عقلی اور فلسفی کوششیں حقیقت جوئی کی

راہ میں قابل داد وتحسین ہیں اور انھیں کے سائے میں ضعیف وقوی نظریات بھی سامنے آئے ہیں لیکن ہمیں اس بات کی توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ان بحثوں سے ہم ابدی زندگی کی تہہ تک پہنچ جائیں گے اور اصل حقیقت ہمارے لئے اس طرح روشن ہوجائے گی کہ گویا ہم نے اسے پالیا ہے۔

واقعاً کیا ابھی تک اسی دنیائے فانی کے تمام حقائق پوری طرح سے کشف ہوگئے ہیں؟ کیا سائنس والوں نے اس حقیقت کو کشف کرلیا ہے کہ مادہ کیا چیز ہے؟ انرجی کیا ہے؟ یا مختلف موجود طاقتیں اور قوتیں کیا اور کیسی ہیں؟ کیا اس دنیا کے مستقبل کے سلسلے میں کوئی یقینی پیشین گوئی کرسکتے ہیں؟ کیا انھیں یہ معلوم ہے کہ اس دنیا کی مقناطیسی کیفیت ختم کردی جائے الکٹرون ذرات اپنی حرکت سے رک جائیں تو کیا ہوگا، یا ان چیزوں کا واقع ہونا ممکن ہے یا نہیں؟

کیا فلسفیوں نے اس دنیا سے متعلق سارے عقلی مسائل کو یقینی طور سے حل کرلیا ہے؟ اور کیا جسمی اور نوعی صورتیں جسم و روح کے درمیان رابطے کے سلسلے میں مزید حقائق جاننے کی تحقیقات کی ضرورت نہیں ہے؟

لہذا ہم اپنے ان ناقص علوم اور محدود علم ودانش کے ذریعہ اس دنیا کے حقائق تک کیسے پہچانیں جب کہ ہمارے پاس اس کے بارے میں کوئی تجربہ بھی نہیں ہے انسان کے علم کے ناقص ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے وہ قطعاً کسی چیز کو پہچانتا ہی نہیں، یا اس راہ میں اس کی تمام تر کوششیں بیکار رہیں۔

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اس خداداد عقل کے ذریعہ بہت سے اسرارِ طبیعت اور راز خلقت کو

کشف کر سکتے ہیں، البتہ ہمیں اپنے علوم اور تجربات کو بڑھانے کے لئے علمی اور فلسفی روش اور طریقوں سے مدد لینی چاہیے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ لازم ہے کہ اپنی عقلی طاقت کی حد اور سائنسی تجربات کی سطح کو ملحوظ رکھیں اور اپنی حد سے زیادہ پرواز کرنے کی کوشش نہ کریں، اور اس اصول کو بھی قبول کریں

(وَ مآ أُوتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلّا قَلِیْلاً)(۱)

اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

....

۱۔ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۵

ہاں، کبھی کبھی عالمانہ اور عمیق نظر، حکیمانہ تواضع وانکساری اور ذمہ دارانہ دینی احتیاط کے پیش نظر ہمیں قیامت کے حقائق کے متعلق یقینی رائے دینے، غیب کی باتیں اور بے جا تاویلات سے پرہیز کرنا اہیے، سوائے ان حقائق کے جنکے بارے میں خداوند عالم اور عقلی دلیلوں نے ہمیں اجازت دی ہے۔

بہر حال مومنین کے لئے کافی ہے کہ جو پروردگار نے نازل فرمایا ہے اسے صحیح تسلیم کرتے ہو ئے اس پر ایمان رکھے جن کے بارے میں صحیح تشخیص نہیں دے سکتا جن کی خصوصیات سے وا قف نہیں ہوسکتا خصوصاً وہ امور جن کے بارے میں ہمارے علم وتجربے ناقص ہیں۔

اب ہم اس بات کی کوشش کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کس حد تک ہم آخرت کی خصوصیات اور دنیا وآخرت کے فرق کو عقل کی روشنی میں بیان کر سکتے ہیں۔

عقل کی روشنی میں آخرت کی خصوصیات۔

قیامت کی ضرورت کے سلسلے میں جو دلائل ہم نے بیان کئے ہیں انھیں کے پیش نظر آخرت کی خصوصیات کو بیان کریں گے، ان میں سے چند اہم خصوصیات یہ ہیں،

۱۔آخرت کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ابدی اور جاودانی ہونا چاہیے، کیونکہ ہم نے پہلی دلیل میں ابدی حیات کے امکان اور انسانی فطرت کے مطابق ہونے سے بحث کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ حیات ابدی حکمت الٰہی کا تقاضہ ہے،

۲۔دوسری خصوصیت جو دونوں ہی دلیلوں سے ثابت ہے اور دلیل اول میں اس کی طرف اشارہ بھی ہوا ہے وہ یہ ہے کہ عالم آخرت کا نظام ایسا ہو کہ جس میں آخرت کی تمام نعمتیں اور رحمتیں بالکل خالص اور بغیر کسی رنج وزحمت کے حاصل ہوں تا کہ ایسے افراد جو کسی گناہ اور معصیت میں مبتلا ہوئے بغیر انسانی کمال کے اہم درجات تک پہنچے ہیں اس سعادت سے لطف اندوز اور نعمتوں سے سرفراز ہوں۔

دنیا کے برخلاف کہ جہاں ایسی خالص سعادت ممکن ہی نہیں ہے بلکہ دنیاوی خوشبختی نسبی ہے جو ہمیشہ رنج ومعصیت کے ساتھ ہوتی ہے۔

۳۔تیسری خصوصیت یہ ہے کہ جہانِ آخرت کے کم از کم دو الگ الگ حصے ہونے چاہیے تا کہ نیک اور بد یا مومن وکافر ایک دوسرے سے جُدا رہیں اور دونوں اپنے اپنے اعمال وکردار کے لئے تلافی کریں اور یہ دونوں مقام اور منزلیں شریعت الٰہی کی زبان میں جنت وجہنم کے نام

سے موسوم ہیں۔

٤۔ چوتھی خصوصیت جو برہانِ عدالت سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ابدی جہان کو اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ جس میں تمام انسانوں کو ان کے نیک اور برے اعمال کی جزا وسزا دینے کی گنجائش ہو، مثلاً اگر کسی نے لاکھوں انسانوں کو ناحق قتل کیا ہے تو اسے وہاں اس کی سزا ملے اور اگر کسی نے لاکھوں انسانوں کی حیات اور زندگی بچائی ہے تو اسے اس کی جزا ملنے کا امکان ہو۔

٥۔ سب سے مہم خصوصیت جو اسی برہان عدالت سے ثابت ہوتی ہے اس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے کہ آخرت صرف جزا وسزا کا مقام ہے نہ اعمال وکردار کا۔

توضیح:

دنیاوی زندگی ایک چیز ہے جس کا دار و مدار متضاد خواہشات اور آرزؤوں پر ہے اور ہمیشہ یہ خواہشات زندگی کے دوراہے پر ٹھہر جاتی ہیں اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے اور یہی انتخاب ان کے عمل کے راستے کو ہموار کرتا ہے اور عمر کے آخری لمحہ تک اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور حکمت وعدالتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے اوامر پر عمل کرنے والوں کو جزا اور اس سے منحرف افراد کو سزا کا مستحق قرار دے۔

اب ایسی صورت میں اگر ہم یہ فرض کریں کہ عالم آخرت بھی عمل انجام دینے کی جگہ ہے تو رحمت الٰہی اور اس کی فیاضی کا تقاضا یہ ہے کہ ان اعمال کی انجام دہی میں مانع نہ ہو اور انسان کو اتنا موقع دے کہ وہ اپنے راستے کا انتخاب خود کرے، تو ایسی صورت میں ضرورت پیش

آئیگی کہ اس کے علاوہ کوئی اور بھی عالم ہو جس میں ان اعمال پر جزا وعقوبت قرار دی جائے، پس ہم نے جس دنیا کو آخرت فرض کیا تھا وہ آخرت نہیں بلکہ دوسری دنیا شمار ہوگی اور آخرت صرف آخری جہان کو کہا جائے گا جہاں اعمال پر ثواب اور عقاب مترتب ہوں اور وہاں اعمال بجالانے کی گنجائش نہ ہو۔

بس یہیں سے دنیا اور آخرت کا اساسی اور بنیادی فرق سامنے آتا ہے یعنی دنیا اسے کہتے ہیں جہاں انسان کی آزمائش اور امتحان ہو اور اچھے یا برے اعمال بجالائے اور آخرت اس ابدی زندگی کا نام ہے جہاں صرف اپنے کئے کی اچھی یا بری جزا یا سزا ملے۔

(وَاِنَّ الیَوْمَ عَمَل وَلاَ حِساب وَغَدَ اُحِساب وَلاَ عَمَل (۱))

....

۱۔نہج البلاغہ خطبہ ۴۲

سوالات:

۱۔ہم کیوں آخرت کو صحیح اور مکمل طریقہ سے نہیں پہچان سکتے؟

۲۔آخرت کے بارے میں غلط تصور اور کج فکری کے دو نمونے ذکر کرتے ہوئے اس پر تنقید کیجئے؟

۳۔ہم آخرت کی خصوصیات کس طرح سمجھ سکتے ہیں؟

٤۔عقل کی روشنی میں عالم آخرت کی خصوصیات کو ذکر کرتے ہوئے اس کی مکمل شرح کیجئے؟

انچاسواں درس

موت سے قیامت تک

مقدمہ:

ہرایک کوموت آنی ہے

روح قبض کرنے والا

یہ موضوعات مندرجہ ذیل کی پر مشتمل ہیں

قبض روح آسان ہے یاسخت

موت کے وقت ایمان اورتوبہ کا قبول نہ ہونا

دنیامیں واپسی کی آرزو

عالم برزخ

مقدمہ:

ہمیں معلوم ہو چکا کہ ہم اس محدود علم کے ذریعہ آخرت اور مطلق عالم غیب کی حقیقت اوراس کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ ہم صرف عقلی براہین سے حاصل ہونے والے کلی مسائل اور وحی وروایات سے اخذ ہونے والی بعض خصوصیات کے ذکر پر اکتفا کریں گے،اگرچہ ممکن ہے کہ قرآن مجید میں عالم آخرت کی توصیف میں ذکر شدہ بعض الفاظ متشابہ ہوں اوران کو سننے کے بعد جو تصورات ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، شاید وہ واقعی مصداق کے مطابق نہ ہوں اور یہ خطا ہمارے قاصر ذہن کی ہے نہ بیان کی، کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن کریم نے ہمارے ذہنی ساخت وساز کے لحاظ سے بہترین الفاظ کا انتخاب کیا ہے

جو حقائق کو کما حقہ بیان کرتے ہیں۔

اور چونکہ قرآن کریم کا بیان آخرت کے مقدمات کو بھی شامل ہے لہذا اپنے کلام کا آغاز بھی انسان کی موت سے کرتے ہیں۔

ہر ایک کو موت آنی ہے۔

قرآن مجید اس بات پر بہت تاکید کرتا ہے کہ تمام انسان بلکہ تمام (ذی روح) کو ایک نہ ایک دن ضرور مرنا ہے اور کوئی بھی اس دنیا میں ہمیشہ زندہ رہنے والا نہیں ہے، (کل من علیہا فان) (۱) جو بھی روئے زمین پر ہے سب فنا ہو جانے والا ہے۔

(كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوتِ)(۲)

ہر ایک کو موت کا مزہ چکھنا ہے،

(إِنَّكَ مَيت وَإِنَّهُمْ ميّتُونَ)(۳)

بے شک تم بھی مرو گے اور یہ لوگ بھی مریں گے۔

(وَماَ جَعَلْناَ لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ أَفَإِينْ مِتَّ فَهُمُ الْخالِدُونَ)(۴)

اور ہم نے آپ سے پہلے بھی بشر کے لئے ہیشگی نہیں قرار دی تو کیا اگر آپ مر جائیں تو یہ لوگ ہمشہ باقی رہیں گے۔

نتیجتاً موت ایک قانون کلی اور نا قابل انکار حقیقت ہے جس سے کسی شی کو بھی فرار نہیں ہے۔

روح قبض کرنے والا:

قرآن مجید ایک طرف تو قبض روح کی نسبت خداوند عالم کی طرف دیتا ہے، اور فرماتا ہے:

(اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الاَنفُسَ حِینَ مَوتِہَا)(۵)

خدا موت کے وقت روح قبض کرتا ہے۔

....

۱۔رحمٰن۔آیت ۲۶

۲۔آل عمران۔آیت ۱۸۵۔انبیاء۔آیت ۳۵

۳۔زمر۔آیت ۳۰

۴۔انبیائ۔آیت ۳۴

۵۔زمر۔آیت ۴۲

اور دوسری طرف ملک الموت کو قبض روح پر مامور بتاتا ہے۔

(قُل یَتَوَفّٰاکُم مَلَکُ المَوتِ الَّذِی وُکِّلَ بِکُم)(۱)

آپ کہہ دیجئے کہ تم کو وہ ملک الموت زندگی کی آخری منزل تک پہنچائے گا جو تم پر تعینات کیا گیا ہے۔

اور ایک دوسرے مقام پر قبض روح کو فرشتوں اور رسولوں کی طرف نسبت دی ہے،

(حَتّٰی اِذَا جَاءَ اَحَدَکُمُ المَوتُ تَوَفَّتہُ رُسُلُنَا)(۲)

یہاں تک کہ جب کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے نمائندے اُسے اٹھا لیتے ہیں۔

اور یہ واضح چیز ہے کہ جب فاعل اپنے کسی کام کو دوسرے فاعل کے ذریعہ انجام دے تو اس

فعل کی نسبت دونوں کی طرف صحیح ہے اور اگر دوسرا فاعل کسی تیسرے شخص کے وسیلے سے کام انجام دے تو یہ تیسرا شخص بھی اس میں شامل ہوجاتا ہے، پس چونکہ خداوند عالم، ملک الموت کی روح قبض کرتا ہے اور ملک الموت بھی اپنی ماتحت فرشتوں کے ذریعے قبض روح کرتا ہے لہٰذا قبض روح کی نسبت تینوں کیطرف دینا صحیح ہے۔

قبض روح آسان ہے یا سخت؟

قرآن مجید سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ موت کے فرشتے سارے انسانوں کی روح کو ایک طریقہ سے قبض نہیں کرتے، بلکہ بعض افراد کی روح نہایت آسانی اور احترام کے ساتھ اور بعض افراد کی نہایت ہی سختی اور اہانت کے ساتھ قبض کرتے ہیں، اس دعوے کی شاہد مثال یہ آیہ شریفہ ہے

(اَلَّذِیْنَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِکَةُ طَیِّبِینَ یَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَیْکُمُ)(۳)

جنھیں ملائکہ اس عالم میں اٹھاتے ہیں کہ وہ پاک و پاکیزہ ہوتے ہیں اور ان سے ملائکہ کہتے ہیں کہ تم پر سلام ہو۔

....

۱۔سجدہ۔آیت ۱۱

۲۔انعام۔آیت ۶۱

۳۔نحل۔آیت ۳۲۔انعام۔آیت ۹۳

اور کافروں کے بارے میں یوں ارشاد ہوا:

(وَلَو تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ)(۱)

کاش تم دیکھتے جب فرشتے ان کی جان نکال رہے تھے اور انکے رخ اور پشت پر مار رہے تھے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مومنین اور کفار کے درمیان ان کے ایمان اور کفر کے درجات کے اعتبار سے قبض روح کے بھی درجات اور طبقات ہوں۔

موت کے وقت ایمان اور توبہ کا قبول نہ ہونا

کفار اور گناہگار، افراد جب اپنی موت کو سامنے دیکھتے ہیں اور اپنی نیوی زندگی سے مایوس ہو جاتے ہیں تو اپنے گذشتہ اعمال و کردار پر نادم و پشیمان ہو جاتے ہیں اور اپنے ایمان اور توبہ کا اظہار کرنے لگتے ہیں اگر چہ اس وقت یہ دونوں ہی چیزیں ان کے لئے عبث و بیکار ہیں:

اُس دن جب خدا کی کھلی آیات ظاہر ہوں گی تو اس شخص کا ایمان جو پہلے نہیں لا یا یا اُس نے اپنے ایمان کے دوران کوئی کار خیر انجام نہیں دیا تو اُس کا ایمان اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا:

(وَ لَيسَتِ التَوبَةُ لِلَّذينَ يعَمَلُونَ السِّياٰتِ حتَّى إِذا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الموتُ قَالَ إِنِّ تُبْتُ الآنَ...)(۳)

اور توبہ ان لوگوں کے لئے نہیں ہے جو پہلے برائیاں کرتے ہیں اور پھر جب موت سامنے نظر آتی ہے تو کہتے ہیں، کہ اب ہم نے توبہ کر لی ہے۔

....

۱۔انفال۔آیت ۰ ۵۔محمد۔آیت ۲۷

۲۔انعام۔آیت ۱۵۸۔اورصبا۔آیت ۵۱، ۵۳، غافر۔آیت ۸۵، سجدہ۔آیت ۲۹

۳۔نسائی۔آیت ۱۸

اور فرعون کے قول کو نقل کر رہا ہے جب وہ غرق ہو رہا تھا تو اس نے کہا

(آمَنت اَنَّه لا اِلٰه اِلّا الّذِی آمَنَت بِهِ بَنُو اِسرا ئیلَ وَ اَنَا مِنَ المُسلِمِینَ)[۱]

میں ایمان لایا اس پر کہ کوئی خدا نہیں ہے سوائے اس خدا کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں اہل اسلام میں سے ہوں، اس کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے۔

(ألآن وَ عَصَیتَ قَبلُ وَ کُنتَ مِنَ المُفسِدِینَ)(۲)

اب (مرنے کے وقت ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو اس سے پہلے نافرمانی کر چکا اور تو تو فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔

دنیا میں واپسی کی آرزو۔

اسی طرح قرآن کریم کفار اور گنہگاروں کے متعلق نقل کرتا ہے کہ جب موت کے بادل ان کے سر پر منڈلانے لگتے ہیں اور عذاب و ہلاکت کا سایہ ان کی آنکھوں کے سامنے چھا جاتا ہے، تب وہ آرزو کرتے ہیں کہ کاش ہم دنیا میں واپس چلے جاتے، اور اعمال صالحہ انجام دیتے، اور اہل ایمان میں سے ہو جاتے، یا پروردگار سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں دنیا میں واپس کر دے، تاکہ وہ تلافی مافات کر لیں لیکن ان کی یہ تمنائیں کبھی بھی پوری ہونے والی نہیں ہیں (۳)

....

۱۔ یونس۔آیت۹۰

۲۔ یونس۔آیت۹۱

۳۔ جان لینا چاہیے کہ قرآن کریم ان لوگوں کے پلٹنے کی آرزوؤں اور تمناوں کا انکار کرتا ہے جن کی ساری زندگی گناہ اور معصیت میں بیت چکی ہو اور موت کے وقت دنیا میں واپسی کی تمنا رکھتے ہوں تا کہ اپنے گناہوں کی تلافی کر سکیں لیکن قیامت سے واپسی کی قطعاً نفی کرتا ہے وہ اس معنی میں نہیں ہے کہ دنیا کسی طرح واپسی ممکن نہیں ہے کیونکہ ایسے افراد بھی تھے جو موت کے بعد دوبارہ اسی دنیا میں زندہ ہو چکے ہیں اور شیعوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت مہدی عج کے ظہور کے بعد کچھ لوگوں کی رجعت ہوگی۔

بعض آیات میں اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اگر انھیں واپس بھی کر دیا جاتا تو وہ بھی وہی فعل انجام دیتے جو پہلے انجام دیا کرتے تھے(۱)

اور روز قیامت بھی ان کی یہی آرزو اور تمنائیں ہونگی جو بدرجہ اولی قابل قبول نہ ہوں گی:

(حَتّیٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ* لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا...)(۲)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو کہنے لگے پروردگارا: تو مجھے ایک بار اس (دنیا) کو جسے میں چھوڑ آیا ہوں پھر واپس کر دے، تا کہ میں اس مرتبہ اچھے اچھے کام کروں (جو اب دیا

جائیگا) ہرگز نہیں یہ ایک لغو بات ہے جسے وہ بک رہا ہے۔

(أو تَقُولَ حِيْنَ تَرَىٰ العذابَ لَوْ أَنَّ لِي كَرَّةً فَأَكُونَ مِنَ المُحسِنِينَ)(۳)

یا جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو کہیں گے کاش پلٹا دیئے جاتے تو نیک بندوں میں سے ہو جاتے

(إِذْ وُقِفُوْا عَلَىٰ النارِ فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَ نَكُونَ مِنَ الْمُؤمِنِينَ)(۴)

(اے رسول اگر تم اِن لوگوں کو اُس وقت دیکھتے تو تعجب کرتے) کہ جب جہنم کے کنارے پر لا کر کھڑے کئے جائیں گے تو اُسے دیکھ کر کہیں گے اے کاش ہم دنیا میں دوبارہ لوٹا دئے جاتے اور اپنے پروردگار کی آیتوں کو نہ جھٹلاتے اور ہم مومنین میں سے ہوتے۔

....

۱۔انعام۔آیت ۲۷۔۲۸

۲۔مومنون۔آیت ۹۹۔۱۰۰

۳۔زمر۔آیت ۵۸، نیز شعراء۔آیت ۱۰۲

۴۔انعام۔آیت ۲۷۔۲۸ نیز اعراف۔آیت ۳۵

(إِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوا رُءُوسِهِم عِنْدَ رَبِّهِم رَبَّنَا أَبْصَرنَا وَ سَمِعْنَا فَارجِعنَا نَعمَلُ صالِحاً إِنَّا مُوقِنُونَ)(۱)

اور جب مجرمین حساب کے وقت اپنے پروردگا کی بارگاہ میں اپنے سر جھکائے کھڑے ہوں گے اور عرض کررہے ہوں گے کہ پروردگار ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے اور سن لیا ہے تو ہمیں دنیا

میں ایک بار پھر لوٹا دے، تا کہ ہم نیک کام کریں، اب تو ہم کو قیامت کا پورا پورا یقین ہے۔
ان آیات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت اعمال و انتخاب کی جگہ نہیں یہاں تک کہ وہ یقین جو دم مرگ یا آخرت میں حاصل ہوگا انسان کے تکامل (بتدریج کامل تک پہنچنے) کیلئے فائدہ بخش نہیں ہوگا، اور انعام کا مستحق نہیں قرار پائے، اسی لئے کفار اور گنہگار اس دنیا میں واپسی کی آرزو کریں گے تا کہ اس دنیا میں پلٹ آئیں اور اپنے اختیار سے ایمان لائیں اور عمل صالح انجام دیں۔

عالم برزخ

قرآنی آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ موت اور قیامت کے درمیان فاصلہ کو برزخ کہا جاتا ہے جو انسان موت کے بعد اور قیامت سے پہلے قبر میں گذارتا ہے کہ جس میں تھوڑا بہت رنج و مصیبت اور خوشی و مسرت کا بھی سامنا ہوتا ہے، بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گنہگار مومنین اس دوران بعض رنج و عذاب میں مبتلا ہونے کے ذریعہ پاک کردئے جائیں گے، اور ان کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔
چونکہ برزخ سے مربوط آیات تفسیر طلب ہیں لہذا ان سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف ایک آیہ شریفہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ وَمِن وَرائِهِم بَرزَخٌ اِلٰی یَومِ یُبعَثُونَ (۲) اور ان کے بعد (ان کی موت کے بعد) ایک برزخ ہے جب تک کہ اٹھانہ لئے جائیں۔

....

۱۔سجدہ۱۲، نیز فاطر ۳۷،

۲۔مومنون ۱۰۰

سوالات:

۱۔اس دنیا میں انسان کے ہمیشہ نہ رہنے کو قرآنی آیات سے واضح وروشن کیجئے؟

۲۔انسان کی روح کون قبض کرتا ہے مربوط آیتوں کے درمیان جو اختلاف ہے اسے پیش کیجئے؟

۳۔روحوں کے قبض کرنے کے سلسلے میں کیا فرق ہے؟

٤۔مرتے دم ایمان اورتوبہ کے بارے میں قرآنی بیان کومع آیات کے وضاحت کیجئے؟

٥۔قرآن کریم، دنیا میں کس طرح کی واپسی کا انکار کررہا ہے؟ آیااس واپسی کاانکار رجعت

کے عقیدے کے منافی ہے؟

٦۔عالم برزخ کی شرح کیجئے؟

پچاسواں درس

قرآن مجید میں قیامت کا نقشہ

مقدمہ:

زمین، دریا اور پہاڑوں کی حالت

آسمانوں اور ستاروں کی کیفیت

موت کا صور

زندگی اور آغاز قیامت کا صور

الٰہی حکومت کا ظہور اور سببی و نسبی رشتوں کا خاتمہ

خدائی عدالت

ابدی ٹھکانے کی طرف روانگی

جنّت

جہنّم

مقدمہ:

قرآن مجید سے یہ بات معلوم ہوتی ہے قیامت اور ابدی زندگی صرف انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے سے شروع نہیں ہوگی، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے، کہ اس دنیا کا نظام بھی تہ وبالا ہو جائے اور دوسری دنیا دوسری خصوصیات کے ساتھ عالم وجود میں آئے جس دنیا کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اس کے بارے میں کوئی نظریہ بھی نہیں دے سکتے اور اس کے بعد ابتداء خلقت سے لے کر اختتام دنیا تک کے تمام انسان زندہ کئے جائیں گے پھر اپنے اپنے اعمال کی جزاء وسزا انہیں ملے گی۔

چونکہ اس موضوع سے متعلق آیات قرآنی فراواں ہیں لہذا کتاب کے اختصار کے پیش نظر ان سے کنارہ کشی کرتے ہوئے صرف ان کے مضامین کا خلاصہ بیان کررہے ہیں۔

زمین دریا اور پہاڑوں کی حالت

زمین میں بہت ہی عظیم زلزلہ آئے گا(۱) زمین اپنے اندر تمام پوشیدہ خزانے اگل دے گی(۲) اور اس کے سارے اجزا بکھر جائیں گے(۳) دریا پھٹ جائیں گے(٤) اور سارے پہاڑ حرکت میں آجائیں گے(٥) اور ایک دوسرے سے ٹکرا دئے جائیں گے(٦) اور ریت کے ٹیلے کی

طرح ہوجائیں گے(۷) اور دھنی ہوئی روئی کے مانند بن جائیں گے(۸) اور پھر فضا میں بکھر جائیں گے(۹) اور اونچے اونچے آسمانوں سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑوں کو ریت کے چٹیل میدان میں تبدیل کردیا جائے گا(۱۰)

آسمانوں اور ستاروں کی کیفیت

چاند(۱۱) اور سورج(۱۲) اور وہ عظیم ستارے جو ہمارے سورج سے کروڑوں گنا بڑے اور چمکدار ہیں سب کی چمک دمک ختم ہوجائیگی اور سب تیرگی میں چلے جائیں گے(۱۳) اور ان کا ایک نظام کے مطابق حرکت کرنا ختم ہوجائے گا(۱٤) اور سورج و چاند آپس میں ٹکرا کر ایک ہوجائیں گے(۱٥) اور وہ آسمان جو اس دنیا پر مضبوط اور محفوظ چھت کی طرح ہے

متزلزل اور کمزور ہوجائے گا(١٦)اور پھٹ جائے گا اور اس میں دراڑیں پڑ جائیں گی (١٧) اور اس کی چادر لپیٹ دی جائے گی (١٨)اور سارے آسمانی ستارے پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہوجائیں گے(١٩)اور اس دنیا کی فضا دھوئیں اور بادل سے بھر جائیگی (٢٠)

....

١۔زلزال١حج١واقعہ٤مزمل١٤،٢۔زلزال٢،انشقاق٤،٣۔الحاقہ١٤،فجر٢١، ٤تکویر٦،انفطار٣ ٥٣۔کہف٤٧،نحل٨٨،طور١٠تکویر٢،٦۔الحاقہ ٤،واقعہ٥،٧۔مزمل ١٤،

٨۔معارج٩،قارعہ٥ ٩۔طٰہ١٠٥،مرسلات١٠،١٠۔کہف٨،نباء٢٠ ١١۔قیامت٨،١٢۔ تکویر١،١٣۔تکویر٢،١٤۔انفطار٢،١٥۔قیامت٩،١٦۔طور١،حاقہ١٦،١٧۔رحمٰن ٣٧،حاقہ١٦،مزمل١٨،مرسلات١٩،انفطار١،انشقاق١،۔انبیاء١٠٤،تکویر١١ ١٩۔معا رج٨،٢٠۔فرقان٢٥،دخان١٠،

موت کا صور۔

ایسی ہی حالت میں موت کا صور پھونک دیا جائے گا اور تمام زندہ موجودات مر جائیں گے(١)اور اس فطری دنیا میں زندگی کا کوئی اثر نہیں ملے گا،اور خوف واضطرار ہر ایک پر چھا جائے گا(٢)مگر وہ لوگ جو ہستی اور موجودات کے اسرار اور حقیقت سے واقف ہیں اور جن

کے دل خدا کی محبت اور معرفت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

زندگی اور آغاز قیامت کا صور۔

پھر وہ دوسرا جہان جس میں بقا اور ابدیت کی قابلیت پائی جاتی ہے معرض وجود میں آئے گا(۳)اور زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی(٤)اور زندگی کے صور کی آواز بلند ہوگی (٥)اور سارے انسان (بلکہ حیوانات بھی)(٦)ایک لمحے میں زندہ ہوجائیں گے(٧)اور پھر گھبرائے ہوئے اور پریشان حال(٨)ٹڈیوں اور فضا میں اڑتی ہوئی پتنگوں(٩)کے مانند تیز رفتاری (١٠) سے اپنے رب کے پاس حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوجائیں گے(١١)اور سب ایک میدان میں جمع ہوجائیں گے(١٢)اس وقت سوچیں گے کہ عالم برزخ میں ان کا توقف ایک دن یا ایک گھنٹہ کے برابر تھا(١٣)

....

١۔زمر ٦٨،حاقہ ١٣،یٰس ٤٩ ،٢۔نمل ٨٧،٨٩ ،٣۔ابراہیم ٤٨ ،زمر ٦٧ ،مریم ٣٨،ق ٢٢

٤۔زمر ٦٩ ،٥۔زمر ٦٨ ،کہف ٩٩،ق ٢٠ ،٤٢ ،نبا١٨،نازعات ١٣۔١٤،مدثر ٨،صافات ١٩

٦۔انعام ٣٨،تکویر ٥ ،٧۔کہف ٤٧،نحل ٧٧،قمر ٥٠ ،نبا١٨،٨۔ق ٢٠

٩۔قارعہ ٤،قمر ٧،١٠۔ق ٤٤۔معارج ٤٣

۱۱۔یٰس ۵۱، مطففین ۳۰، قیامت ۱۲۔۱۳ نیز آیات حشر ونشر

۱۲ کہف ۹۹، تغابن ۹ نساء ۷۸، انعام ۱۲، آل عمران ۹

۱۳۔روم ۵۵، نازعات ٤٦، یونس ٤۵، اسراء ۵۲ طٰہ ۱۰۳۔۱۰٤، مومنون ۱۱۳، احقاف ۳۵

الٰہی حکومت کا ظہور اور سببی و نسبی رشتوں کا خاتمہ۔

اُس جہان میں حقیقتیں کھل کر سامنے آجائیں گے،(۱) اور خدا کی حکومت اور سلطنت کا مکمل ظہور ہو جائے گا،(۲) اور مخلوقات پر ایک ہیبت طاری ہوگی کسی کو بھی بلند آواز میں گفتگو کرنے کی جرأت نہیں ہوسکتی (۳) اور ہر ایک کو اپنے انجام کی فکر ہوگی یہاں تک کہ اولاد اپنے والدین سے اور رشتہ دار وقرابت دار ایک دوسرے سے دور بھاگیں گے اور اپنا منھ چھپائیں گے(٤) اور سببی ونسبی رشتوں کی بنیاد ہی ختم ہوجائے گی (۵) اور وہ دوستیاں کہ جو دنیاوی اور شیطانی مفاد و معیار پر استوار تھی دشمنی میں بدل جائے گی (٦) اور اپنی گذشتہ غلطیوں اور گناہوں کی وجہ سے حسرت و یاس اور شرمندگی

، ہر دل پر چھائی ہوگی (۷)

....

۱۔ابراہیم ۲۱۔العادیات ۱۰، طارق ۹ ق ۲۲ الحاقہ ۱۸

۲۔حج ٦۵، فرقان ۲٦، غافر ۱٦، انفطار ۱۹

۳۔ہود ۱۰۵، طٰہٰ ۱۰۸، ۱۱۱، نبا ۳۸

٤۔عبس ۳٤۔۳۷، شعراء ۸۸، معارج ۱۰، لقمان ۳۳

٥۔بقرہ ۱٦٦، مومنون۔آیت/۱۰۱

٦۔زخرف ٦۷

۷۔انعام ۳۱، مریم ۳۹، یونس ٥٤

خدائی عدالت کا مقدمہ (محاکمہ)

اُس وقت خدا کی عدالت میں حاضری ہوگی، اور سارے بندوں کے اعمال حاضر کئے جائیں گے، (۱) اور نامہ اعمال تقسیم کیا جائے گا (۲) اور ہر نیک و بد کام کی نسبت اس کے فاعل کی طرف اتنی واضح اور روشن ہوگی، کہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی، کہ تم نے کیا کیا ہے؟ (۳) اس دادگاہ (عدالت) میں فرشتے پیغمبران الٰہی اور خدا کے منتخب بندے، گواہوں کے عنوان سے حاضر ہوں گے (٤) یہاں تک کہ انسان کے ہاتھ پیر اور بدن کی کھال تک اس کے خلاف گواہی دے گی (٥) اور سارے انسانوں کے حساب و کتاب میں بہت دقت اور غور سے کام لیا جائے گا، اور خدا کی میزان پر تولا جائے گا (٦) اور پھر عدل و انصاف کی

بنیاد پر ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا(۷) اور ہر ایک کو اس کی محنتوں کا پھل ملے گا(۸)نیک کام کرنے والوں کو دس گنا انعام دیا جائیگا(۹)اور کوئی بھی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا(۱۰)لیکن جن لوگوں نے دوسروں کو گمراہ کیا ہے وہ اپنے گناہوں کے علاوہ گمراہ ہونے والے افراد کے گناہوں کو بھی اپنے دوش پر اٹھاہیں گے(۱۱)(بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کچھ کمی کی جائے)اسی طرح کسی سے بھی کسی چیز کا عوض اور بدلہ قبول نہیں کیا جائیگا(۱۲)کسی کی سفارش قبول نہیں ہوگی(۱۳)مگر ان لوگوں کی شفاعت قبول ہوگی،جنکو خدا کی طرف سے اجازت دی گئی ہے اور وہ لوگ خدا کی مرضی اور معیار کے مطابق شفاعت کریں گے(۱٤)

....

۱۔آل عمران۳۰،تکویر۱٤،اسراء۴۹،

۲۔بنی اسرائیل۱۳۔۱٤۔۱۷،الحاقہ۱۹۔۲۵،انشقاق۱۰۷

۳۔رحمٰن۳۹،

٤۔زمر۶۹،بقرہ۱٤۳،آل عمران۱٤،نسائ۔۶۹،ہود۱۸۔حج۷۸،ق۲۱،نحل٤۸۔۸۹

۵۔نور۲٤،یٰس۶۵،فصلت۲۰۔۲۱،

۶۔اعراف۸۔۹،انبیاء٤۷،مومنوں۱۰۲۔۱۰۳،قارعہ۶۔۸

۷۔یونس٥٤۔۹۳،جاثیہ۱۷،نحل۷۸،زمر۶۹۔۷۵

۸۔النجم٤۰۔٤۱،بقرہ۲۸۶،۲۸۶،آل عمران۲۵۔۱۶۱،انعام۷۰،ہود۱۱۱،ابراہیم۵۱،

۹۔انعام ۱٦٠،

١٠۔النجم ٣٩،انعام ٤٦،فاطر ١٨ زمر ٧

١١۔نحل ٢٥،عنکبوت ١٣، یہاں پر یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ جولوگ دوسروں کی ہدایت کا سبب بنتے ہیں دو گنا

ثواب پائیں گے جیسا کہ روایات میں صاف واضح ہے۔

١٢۔بقرہ ٤٨، ١٣٢،آل عمران ٩١ لقمان ٣٣، مائدہ ٣٦،حدید ١٥

١٣۔بقرہ ٤٨، ١٢٣، ٢٥٤، مدثر ٤٨

١٤۔انبیاء ٢٨ بقرہ ٢٥٥، یونس ٣، مریم ٨٧،،طہ ١٠٩، سبا ٣٣، زخرف ٨٦ نجم ٢٦،

ابدی ٹھکانے کی طرف روانگی

اسکے فوراً بعد خدا کے حکم کا اعلان کیا جائے گا (١) نیک کام کرنے والے اور گنہگار ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے (٢) اور مومنین سرخرو، شاداب اور مسرتوں میں ڈوبے ہوئے جنت کی طرف (٣) اور کفار منافقین جنکے چہرے سیاہ ہو گئے ہوں گے غمگین و پریشان ذلت وخواری کے ساتھ جہنم کی طرف روانہ ہوں گے (٤) اور سب کے سب جہنم سے ہو کر گذریں (٥) اس حالت میں کہ مومنوں کے چہرے سے نور برس رہا ہوگا اور ان کے راستے روشن ہوں گے (٦) اور کفار و منافقین اندھیرے میں پھنسے ہوڈ گے اور منافقین جو اس دنیا میں

مومنین کے ساتھ گھلے ملے رہتے تھے مومنین کو آواز دیں گے کہ ہماری طرف اپنا چہرہ گھماو تا کہ تمھارے نور سے فائدہ اٹھائیں تو اس وقت وہ جواب سنیں گے کہ اس نور کو پانے کے لئے پچھلے پاؤں (دنیا میں) پلٹ جاؤ! پھر وہ منافقین اور کفار کہیں گے کہ کیا بھول گئے؟ کیا تمھارے ساتھ اس دنیا میں نہیں تھے؟ پھر جواب پائیں گے کیوں نہیں ظاہراً ہمارے ہی سا تھ تھے لیکن تم نے خود کو گرفتار کرلیا تمھارے دل میں شک پیدا ہو گیا اور تم سنگدل ہو گئے اور آج تمھارا فیصلہ ہو گیا آج تم سے اور کافروں سے کوئی قبول نہیں کیا جائیگا

اور آخر کار کفار و منافقین کو جہنم کے منہ میں جھونک دیا جائے گا (۷)

جس وقت مومنین جنت کے نزدیک پہنچیں گے تو اس کا دروازہ کھول دیا جائیگا اور رحمت کے فر شتے ان کا استقبال کریں گے ،سلام و احترام کے ساتھ ان کو ابدی سعادت کی خوش خبری سنا ئیں گے ،(۸) اور دوسری طرف جب کفار و منافقین جہنم کے نزدیک پہنچیں گے تو اس کا دروازہ کھل جائیگا اور عذاب کے فرشتے سختی سے ان کی مذمت کریں گے اور ان کو ابدی عذاب کی خبر دیں گے (۹)

....

۱۔اعراف ٤٤

۲۔انفال ۳۷ ،روم ۱٤،۱٦،٤۳ ،٤٤ ،شوریٰ ۷ ،ہود ۱۰٥،۱۰۸،یٰس ٥۹

۳۔زمر ۷۳ ،آل عمران ۱۰۷ مریم ۸٥ ،قیامت ٤۲ ،۲٤ ،مطففین ۲٤ ،غاشیہ ۸ عبس ۳۸ ۳۹۔

٤۔زمر ٦٠۔٧١،آل عمران ١٠٦،انعام ١٢٤،یونس ٢٧ مریم٨٦ طٰہٰ ١٠١،١٢٦،١٢٤،ابرا ہیم ٤٣،قمر ٨ معارج ٤٤،غاشیہ ٢ اسراء ٧٢،٩٧،عبس ٤٠،٤١

٥۔مریم ٧١،٧٢

٦۔حدید ١٢

٧۔حدید ١٣۔١٥،نساء ١٤٠

٨۔زمر ٧٣،رعد ٢٢،٢٤

٩۔زمر ٧١،٧٢،تحریم ٦،انبیاء ١٠٣

جنت۔

بہشت مین آسمانوں اورزمینوں کی وُسعت کے برابر لمبے چوڑے باغات ہونگے (١) ہرقسم کے پھلوں سے لدے ہوئے طرح طرح کے درخت جو ہر وقت انسان کی دسترس میں ہو ں گے(٢) اورعظیم وخوبصورت مکانات ہونگے اورصاف وشفاف پانی کی نہریں اورچشمے ہو نگے (٣) نیز دودھ وشہداور پاک و پاکیزہ،طیب وطاہرشراب(٤) اور ہروہ چیز جس کا دل چاہے یا بہشتیوں کوضرورت محسوس ہووہ موجودہوگی (٥) اوران کی خواہشات سے زیادہ چیزیں موجودہونگی (٦) اوربہشتی لوگ وہاں ریشم کےنرم ونازک لباس میں ملبوس اورمختلف قسم کی زینتوں سے آراستہ ہوں گے(٧) اورسجے ہوئے تخت پرنرم ولطیف بستر پرٹیک لگائے

ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے خدا کی حمد وثنا میں مشغول ہونگے (۸) اور کوئی بھی غلط بات نہ تو زبان پر جاری کریں گے اور نہ ہی کانوں سے سنیں گے (۹) نہ ٹھنڈک ان کو تکلیف پہنچائے گی اور نہ گرمی کا احساس ان کو اذیت دے گا (۱۰) اور نہ تو کسی طرح کا رنج وملال اور نہ ہی تھکن کا احساس ہوگا (۱۱) اور نہ تو کوئی غم ہوگا اور نہ ہی کوئی خوف، (۱۲)

....

۱۔آل عمران ۱۳۳، حدید ۲۱،

۲۔الحاقہ ۲۳، دہر ۶۔۱۸،۲۱ مطففین ۲۸

۳۔بقرہ ۲۵، آل عمران ۱۵، اور دسیوں دوسری آیتیں

٤۔محمد ۱۵، دھر ٦۔۱۸،۲۱ مطففین ۲۸

٥۔نحل ۳۱، فرقان ١٦ زمر ٣٤، فصلت ۳۱ شوریٰ ۲۲ زخرف ۷۰،۷۱، ق ٣٥

٦۔ق ٣٥، ۷۔کہف ۳۱، حج ۲۳، فاطر ۳۳ دخان ٥٣، دھر ۲۱۔اعراف ۳۲،

۸۔اعراف ٤٣، یونس ۱۰، فاطر ٣٤ زمر ٧٤

۹۔مریم ٦٢، نباء ٣٥، غاشیہ ۱۱

۱۰۔الدھر ۱۳، ۱۱۔مریم ٦٢، نباء ٣٥، غاشیہ ۱۱

۱۲۔اعراف ٣٥، حجر ٤٨،

اور نہ کسی کے دل میں کوئی کینہ ہوگا نہ دشمنی (۱) حسین وجمیل خدمت گزار ان کے چاروں طرف ٹہلتے ہوں گے (۲) اور جنتی شراب کا جام ان کو پلا رہے ہوں گے کہ جس کی لذت ونشاط

قابل توصیف نہیں ہے، اور کسی طرح کا نقصان نہ ہوگا (۳) کئی قسم کے پھل اور پرندوں کے گوشت نوش فرمارہے ہوں گے (٤) اور خوبصورت ومہربان نیز پاکدامن شریک حیات اور ساتھیوں سے لطف اندوز ہونگے (٥) اور ہر چیز سے بڑھ کر رضائے پروردگار کی روحانی نعمت سے سرفراز ہونگے (٦) اور خدکی ایسی مہربانی ان کے شامل حال ہوگی جوانھیں خوشیوں میں غرق کردیگی اور کوئی بھی خوشیوں کے اس مرتبے کوتصور بھی نہیں کرسکتا (٧) اور یہ بےنظیر سعادت اور ناقابل توصیف نعمتیں اور خدا کی رحمت، رضاوخوشنودی ہمیشہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہے گی (٨) جوکبھی ختم ہونے والی نہیں ہے (٩)

....

١۔اعراف ٤٣، حجر ٤٧

٢۔طور ٢٤، واقعہ ١٧، دھر ١٩

٣۔صافات ٤٥۔٤٧ ص ٥١، طور ٢٣، زخرف ٧١ واقعہ ١٨۔١٩ دھر ٥۔٦۔١٥، ١٩، نبا ٣٤ مطففین ٢٥، ٢٨

٤۔ص ٥١ طور ٢٢ رحمٰن ٥٢، ٦٨، واقعہ ٢٠۔٢١، مرسلات ٤٢، نبا ٣٢

٥۔بقرہ ٢٥ آل عمران ١٥، نساء ٥٧ صافات ٤٨۔٤٩ ص ٥٢ زخرف ٧٠ دخان ٥٤ طور ٢٠ رحمٰن ٥٦، ٧٠، ٧٤ واقعہ ٢٢۔٢٣، ٣٤، ٣٧، نبا ٣٣

٦۔آل عمران ١٥، توبہ ٢١، ٧٢ حدید ٢٠، مائدہ ١١٩ مجادلہ ٢٩ بینہ ٨

٧۔سجدہ ١٧

۸۔ بقرہ ۲۵ ،۸۲، آل عمران ۱۰۷، ۱۳٦، ۱۹۸، نساء ۱۳، ۵۷، ۱۲۲، مائدہ ۸۵، ۱۱۹، اعراف ۴۲، توبہ ۲۲، ۷۲، ۸۹، ۱۰۰، یونس ۲٦، ھود ۲۳، ۱۰۸، ابراہیم ۲۳، حجر ٤۸، کہف ۳، ۱۰۸، طٰہ ۷٦، انبیاء ۱۰۲، مومنون ۱۱ فرقان ۱٦، ۷٦، عنکبوت ۵۸، لقمان ۹، زمر ۷۳، زخرف ۷۱، احقاف ۱٤، ق ۳٤، فتح ۵، حدید ۱۲، مجادلہ ۲۲، تغابن ۹ طلاق ۱۱، بینہ ۸،

۹۔ دخان ۵٦، فصلت ۸، انشقاق ۲۵، تین ٦،

جہنم

جہنم ان کافروں اورمنافقوں کاٹھکانہ ہےجن کے دلوں میں ایمان کانور بالکل نہیں پایاجاتا (۱)اور جہنم کے اندراتنی وسعت اور گنجائش پائی جاتی ہے کہ سارے گناہ گاروں کواپنے اندر بھر لینے کے بعد بھی (ہل من مزید) (کیاکوئی اور بھی ہے) کی آواز بلند کریگا(۲)اس میں صرف آگ ہےاوربس،عذاب ہےاوربس!!

چاروں طرف اس کے شعلے بلند ہونگے اورکانوں کو پھاڑ دینے والی غصہ سے بھری آوازیں خوف واضطراب میں اضافہ کریں گی (۳) وہاں لوگوں کے چہرے سکڑے ہوئے، سیاہ، کریہ

المنظر، اور جھریوں سے بھرے ہوں گے (٤) یہاں تک کہ دوزخ کے فرشتوں کے چہرے پر بھی مہربانی، محبت اور نرمی کے آثار نہیں دکھائی دیں گے (٥) جہنم کے لوگ لوہے کے طوق و سلاسل نیز ہتھکڑیوں بیڑیوں سے باندھے جائیں گے، (٦) اور آگ انھیں سر سے پیر تک اپنے قبضے میں لئے ہوگی (٧) اور خود وہی لوگ آگ بنانے اور لگانے والے ہوں گے (٨) جہنم کی فضا میں سوائے آہ وفغاں، فریاد وبکا اور نالہ وشیون اور جہنم کے اوپر تعینات فرشتوں کی خوفناک اور گرجدار آواز کے اور کچھ سنائی نہیں دیگا (٩) اور گنہگاروں کے اوپر کھولتا ہوا گرم پا نی انڈیلا جائے گا، جوان کو اندر سے پگھلا دیگا (١٠)

....

١۔نساء، ١٤٠، اور دوسری دسیوں آیتیں۔

٢۔ق، ٣٠، ٣۔ھود ١٠٦، انبیاء، ١٠٠، فرقان ١٢، ملک ٧، ٨

٤۔آل عمران ١٠٦، ملک ٢٧، مومنون ١٠٤، زمر ٦٠

٥۔تحریم ٩١، ٦۔رعد ٥، ابراہیم ٤٩، صبا ٣٣ غافر ٧١، ٧٢، الحاقہ ٣٢ دھر ٤،

٧۔ابراہیم، ٥٠ فرقان ١٣، انبیاء ٩٨، جن ١٥، تحریم ٦

٨۔بقرہ ٢٤، آل عمران ١٠، انبیاء ٩٨، جن ١٥، تحریم ٦

٩۔فرقان ١٣، ١٤ انشقاق ١١،

١٠۔حج ١٩، ٢٠ دخان ٤٨،

اور جب کبھی گرمی اور پیاس کی شدت کی وجہ سے پانی کی درخواست کریں گے تو انھیں گرم جلتا

ہوااور نجس و بدبودار پانی دیا جائے گا، جسے وہ لوگ بہت ہی شوق سے پئیں گے(۱)اوران لو
گوں کی غذا درخت (زقوم) ہے جو آگ سے اگتا ہے جس کو کھانے سے اندرونی سوزش و
جلن میں اضافہ ہوجائیگا(۲)اوران کا لباس ایک سیاہ اور چپکنے والے مادے سے بنا ہوا ہوگا
جو ان کے لئے ایک عذاب کا باعث ہوگا (۳)اور شیاطین و جنات کے گنہگار بھی ان کی
ہمنشینی سے دور بھاگیں گے(٤)اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور مذمت کریں گے
(٥)اور جس وقت وہ لوگ خدا کی بارگاہ میں معذرت خواہی کے لئے اپنی زبان کھولیں گے
اس وقت دور ہوجاؤ خاموش ہوجاؤ ایسے الفاظ سے انھیں خاموش کردیا جائے گا(٦) پھر وہ لو
گ جہنم کے دربان کے پاس پناہ لیں گے، اوران سے درخواست کریں گے کہ تم ہی خدا سے
ہمارے عذاب میں کمی کے لئے سفارش کرو،تو وہ جواب پائیں گے کہ کیا خداوند عالم نے
اپنے پیغمبروں کو مبعوث نہیں کیا تھا، اور تمھارے اوپر اس نے اپنی حجت تمام نہیں کی تھی
؟(۷) دوبارہ مرنے کی تمنا کریں گے اور جواب پائیں گے کہ اب تم ہمیشہ اسی جہنم میں رہو
گے(۸)اگر چہ موت انکے اوپر چاروں طرف سے برس رہی ہوگی مگر اس کے باوجود نہیں مر
یں گے(۹)اور انکے بدن کی جتنی کھال آگ میں جلتی جائیں گی اتنی ہی نئی کھال اگتی جائیں
گی(۱۰)اوران پر عذاب ہوتا رہے گا۔

....

۱۔انعام۷۰، یونس٤ کہف۲۹،واقعہ ٤٢، ٤٤، ٥٥، محمد ١٥

۲۔صافات ٦٢، ٦٦،ص ٥٧،دخان ٤٥، ٤٦،واقعہ ٥٢، ٥٣ نباء ٢٥،غاشیہ ٦، ٧

٣۔ابراہیم ١٧، طٰہٰ ٧٤ فاطر ٣٦ ٤ ۔زخرف ٣٨ ۔٣٩،شعراء ٩٤ ۔٩٥،ص ٨٥،

٥۔اعراف ٣٨ ۔٣٩،عنکبوت ٢٥ ،مرسلات ٣٥ ۔٣٦،

٦۔مومنون ١٠٨ ،روم ٥٧ ،غافر ٥٢ ،مرسلات ٣٥ ۔٣٦

٧۔غافر ٤٩ ۔٥٠ ،٨۔زخرف ٧٧ ،٩۔ابراہیم ١٧، طٰہٰ ٧٤ ، فاطر ٣٦

١٠۔نساء۔٥٦،

بہشتیوں سے تھوڑے کھانے پانی کی بھیک مانگیں گےتو جواب سنیں گے کہ خدا نے بہشتی نعمتوں کوتمھارے اوپرحرام کردیا ہے(١)اور بہشتی لوگ ان سے پوچھیں گے کہ کونسی چیزتمھا ری بدبختی کا سبب ہےاور تمھیں جہنم میں کھینچ لائی ہے؟ تو لوگ کہیں گے کہ ہم نمازیوں اور خدا کے عبادت گذار بندوں میں سےنہیں تھےاور غریبوں کی مدد نہیں کرتے تھےاور فسادیوں کے ساتھ مل کر رہتے تھے اور روز قیامت کوجھٹلاتے تھے(٢)اس وقت آپس میں ایک دوسرے سے الجھ جائیں گے،اورلڑنے لگیں گے(٣) گمراہ ہونے والے گمراہ کرنے والوں سے کہیں گے، کہ تم ہی لوگوں نےہمیں گمراہ کیا ہے وہ لوگ جواب دیں گے کہ تم لوگوں نے اپنی رضا اور خواہش سے ہماری پیروی کی ہے(٤) نیچے کام کرنے والے اپنے اوپر کام کرنے والے(رعایا اپنے حاکم یا ارباب) سے کہیں گے کہ تم ہی نےہمیں اس سختی تک پہچایا ہے وہ جواب دیں گے کہ کیا ہم نے زبردستی اور جبراً تم کوراہ راست سے روکا تھا(٥) بالاخر وہ لوگ شیطان سے کہیں گے کہ ہم لوگوں کی گمراہی کا سبب بنا ہےتو وہ جواب دے گا کہ خدا نے تم سے سچا وعدہ کیا لیکن تم لوگوں نے قبول نہیں کیا اور میں نے جھوٹا وعدہ کیا توتم نے قبول کرلیا،

لہٰذا میری مذمت کے بجائے خود اپنی مذمت کرو، اور آج ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی مدد نہیں کر سکتا (٦) لہٰذا اپنی نافرمانی اور کفر کی سزا بھگتنے کے اور کوئی چارہ نہیں ہے لہذا ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے (٧)

....

١۔اعراف ٥٠، ٢۔مدثر ٣٩۔٤٧، ٣۔ص ٥٩، ٦٤

٤۔اعراف ٣٨، ٣٩ صافات ٢٧۔٣٣،

٥۔ابراہیم ٢١، سباء ٣١، ٣٣،

٦۔ابراہیم ٢٢،

٧۔بقرہ ٣٩، ٨١، ١٦٢، ٢١٧، ٢٥٧، ٢٧٥، آل عمران ٨٨، ١١٦، نساء ١٦٩، مائدہ ٣٧، ٨٠ انعام ١٢٨، اعراف ٣٦، توبہ ١٧، ٦٣، ٦٨، یونس ٢٧، ٥٢، ھود ١٠٧، رعد ٥، نحل ٢٩، کہف ١٠٨، طٰہٰ ١٠١، سجدہ ٢٠، مومنون ١٠٣، احزاف ٦٥، زمر ٧٢، غافر ٧٦، زخرف ٧٤ مجادلہ ١٧، تغابن ١٠، جن ٢٣، بینہ ٦

سوالات:

١۔قیامت کے وقت زمین و آسمان کی کیفیت کو تفصیل سے بیان کیجیے؟

٢۔قیامت کے آغاز کی کیفیت اور اس کے اوصاف کو بیان کریں؟

۳۔الٰہی عدالت کے محاکمہ (مقدمہ) کی شرح وتفصیل پیش کریں؟

٤۔مومنین اور کفار کے متعلق ابدی ٹھکانوں کی طرف روانگی کی وضاحت کیجئے؟

٥۔بہشتی نعمتوں کو تفصیل سے بیان کیجئے؟

٦۔جہنم اور جہنمیوں کی کیفیت اور حالت کو تحریر کریں؟

٧۔جہنمیوں کی گفتگو کو تفصیل سے بیان کیجئے؟

درس عقائد

اِکیاونواں درس

دنیا کا آخرت سے مقابلہ

مقدمہ:

دنیا کا فنا ہو جانا اور آخرت کا ہمیشہ باقی رہنا

یہ گفتگو ذیل کے موضوعات پر مشتمل ہے

آخرت میں نعمت اور عذاب کے مابین جدائی

آخرت کا اصل ہونا

دنیاوی زندگی کو انتخاب کرنے کا نتیجہ

مقدمہ:

ہم نے عالم آخرت کے بارے میں عقل اورنقل (آیات وروایات) کے ذریعہ جو معلومات حاصل کی ہیں، اس کی روشنی میں دنیا وآخرت کے درمیان مختلف زاویہ سے تقابل کر سکتے ہیں، خوش قسمتی سے یہ تقابل (موازنہ) خود قرآن مجید کے اندر موجود ہے اور ہم قرآنی بیانات کے ذریعہ دنیا وآخرت کو صحیح طریقہ سے تصور کر سکتے ہیں۔

دنیا کا فانی ہونا اور آخرت کا ابدی ہونا (ہمیشہ باقی رہنا)

دنیا وآخرت کے درمیان سب سے پہلا اور واضح ترین اختلاف دنیاوی زندگی کا محدود ہونا اوراخروی زندگی کا ہمیشہ باقی رہنا ہے، ہر انسان کی عمر کے لئے اس دنیا میں ایک حد معین ہے کہ حدتک ہر ایک کو جلد یا دیر پہنچنا ہے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص سیکڑوں یا ہزاروں سال بھی اس دنیا میں زندگی بسر کرلے بالاخر اس کو ایک روز اس مادی عالم کے تغیر کے ساتھکہ جب پہلا صور پھو نکا جائے گا ختم ہوجانا ہے، جیسا کہ گذشتہ درس میں بیان کیا جاچکا ہے۔

دوسری طرف قرآن مجید کی تقریباً، اسی، آیتیں آخرت کے ابدی ہونے پر دلالت کرتی ہیں

(۱) اور ظاہر ہے کہ محدود چاہے جس قدر بھی طولانی مدت ہولا محدود سے مقابلہ نہیں کر سکتا، صرف عالم آخرت بقا اور دوام کے لحاظ سے دنیا کے اوپر عظیم فضیلت کا حامل ہے اور یہ ایسا مطلب ہے جو مختلف آیتوں میں آخرت کو (ابقیٰ) (۲) اور دنیاوی زندگی کو (قلیل) (۳) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور دوسری آیتوں میں دنیاوی زندگی کو اس سبزہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو چند روز سرسبز و شاداب رہنے کے بعد زردی کی طرف مائل ہوتا ہے اور پھر (پژمردگی) کملا ہٹ شروع ہو جاتی ہے اور آخرت میں بالکل خشک ہو کر ختم ہو جاتا ہے (٤) اور خداوند عالم ایک آیت میں کلی طور سے ارشاد فرماتا ہے کہ صرف وہ شی جو خدا کے نزدیک ہے ہمیشہ باقی رہنے والی ہے (٥)

آخرت میں نعمت اور عذاب کے مابین جدائی

دنیا اور آخرت کی زندگی میں ایک دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ دنیا کی زندگی اور اسکی تمام خوشیاں رنج و مشکلات کے ساتھ ملی جلی ہیں اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ کچھ لوگ ہمیشہ ہر لحاظ سے خوشحال، بے فکر، اور آسودہ خاطر ہوں گے اور کچھ افراد ہمیشہ عذاب اور پریشانیوں میں مبتلا ہوں گے اور غم و مصیبت سے دوچار ہوں گے بلکہ تقریباً سارے لوگ ہر طرح کی خوشیوں، لذتوں اور عیش و آرام سے مالا مال بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ رنج و مصیبت اور غم و غصہ سے بھی دست و گریباں ہیں۔

....

۱۔بہشت میں دوزخ کی جاودانی اور خلود سے متعلق آیتوں کی طرف رجوع کریں
۲۔کہف ٤٦ ،مریم ٧٦ ،طٰہ ٧٣ ،١٣١،قصص ٦٠ ،شوریٰ ٣٦ ،غافر ٣٩ ،اعلیٰ ١٧
۳۔آل عمران ١٩٧،نساء ٧٧،توبہ ٣٨ نمل ١١٧،
٤۔یونس ٢٤ ،کہف ٤٥ ،٤٦ حدید ٢٠ ،نمل ٩٦،
٥۔آل عمران ١٥،نساء ٧٧ ،انعام ٣٢ ،اعراف ٣٢ یوسف ١٠٩ ،نحل ٣٠ ،کہف ٤٦ ،مریم ٧٦ ،طٰہ ٧٣ ،١٣١،قصص ٦٠ ،شوریٰ ٣٦ ،اعلی ١٧،

لیکن عالم آخرت کے دو الگ الگ حصے (جنت وجہنم) پائے جاتے ہیں،جس میں سے پہلا حصہ وہ ہے کہ جس میں کسی قسم کی کوئی پریشانی عذاب،خوف اورغم کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، جب کہ دوسرے حصے میں آگ، دردمصیبت، حیرت ویاس اور غم کے علاوہ کچھ اور ہاتھ آنے والا نہیں ہے کہ جو دنیاوی لذت کا اثر ہے۔

یہ تقابل بھی خود قرآن مجید کے اندر پایا جاتا ہے اور آخرت کی نعمتوں اور تقرب پروردگار کی بر تری کو دنیاوی نعمتوں کے اوپر صاف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے(١) جس طرح آخرت کے عذاب کو دنیاوی مشکلات اور مصیبتوں سے سخت تر بیان کیا گیا ہے(٢)

آخرت کا اصل ہونا۔

دنیا وآخرت کے درمیان ایک اہم فرق یہ ہے کہ دنیاوی زندگی آخرت کے لئے مقدمہ ہے اورابدی سعادت کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور آخرت کی زندگی آخری اور اصل زندگی ہے،

اگر چہ دنیوی حیات اوراس کی مادی ومعنوی نعمتیں انسان کو بہت پسند ہیں ،لیکن اس کے با وجود کہ یہ ساری نعمتیں صرف امتحان کا ذریعہ ہیں اور حقیقی نشوونما اورترقی نیز ابدی سعادت کوحا صل کرنے کے لئے ایک وسیلہ ہے لہٰذا اصل نہیں ہوسکتی اوراس کی واقعی قدرو قیمت ایک زاد راہ اورتوشہ کی سی ہے جوانسان اپنی ابدی زندگی کے لئے آمادہ کرتا ہے(۳)اس لئے اگرکوئی شخص آخرت کوفراموش کرکے دنیا کےحسن وجمال میں گرفتار ہوجائے ،اوراس کی لذتوں کو اپنا آخری مقصد سمجھ بیٹھےتو گویا وہ اس کی واقعی قدرو قیمت کونہیں پہچان سکا،اوراس کے لئے فر ضی اہمیت کا قائل ہوگیا کیونکہ اس نے وسیلہ کو

....

۱۔آل عمران ۱۵،نساء ۷۷،انعام ۳۲،اعراف ۳۲،یوسف ۱۰۹،نحل ۳۰،کہف ۴۶،مریم ۷۶،طٰہٰ ۷۳،۱۳۱،قصص ۶۰،شوریٰ ۳۶،اعلیٰ ۱۷،

۲۔رعد ۳۴،طٰہٰ ۱۲۷،سجدہ ۲۱،زمر ۲۶،فصلت ۱۶،قلم ۳۳،غاشیہ ۲۴،

۳۔قصص ۷۷

مقصد سمجھ لیا ہے اگر ایسا ہےتو سوائے فریب اورکھیل اورمشغولیت کےاور کچھ نہیں ہے،اسے لئے قرآن مجید نے دنیا کی زندگی کوکھیل مشغولیت اوروسیلہ فریب کے نام سے یاد کیا ہے(۱) اورآخرت کی زندگی کوایک حقیقی حیات جانا ہے(۲)لیکن توجہ کا مقام ہے کہ وہ تمام مذمتیں جو دنیا کےسلسلے میں بیان کی گئی ہیں وہ دنیا طلب انسانوں اوراس کوھدف ومقصد بنا کے زندگی گذارنے والوں سے متعلق ہیں،ورنہ زندگانی دنیا خدا کےاُن نیک بندوں کے لئے جواس کی

حقیقت کو پہچانتے ہیں، اوراس کوایک وسیلہ کی حثیت سے دیکھتے ہیں، اوراپنی زندگی کے تمام لمحات، ابدی سعادت کے حصول میں صرف کرتے ہیں نہ صرف یہ کہ ان کی مذمت نہیں کی گئی بلکہ وہ غیر معمولی قدرو قیمت کے مالک ہیں۔

دنیاوی زندگی کوانتخاب کرنے کا نتیجہ۔

عالم آخرت کی فضیلت اور غیر قابل توصیف بہشتی نعمتوں اور خدا کی مرضی وخوشنودی کو دنیاوی لذتوں کے اُوپر ترجیح دینے میں کسی بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے لہذا دنیاوی زندگی کوانتخاب کرنا، اوراس کوآخرت کے اُوپر ترجیح دینا، ایک غیر حکیمانہ اقدام ہے(۳) کہ جس کا نتیجہ حسرت اور شرمندگی کے علاوہ کچھ اورنہیں ہے لہذا اس کوانتخاب کرنا اوراس کی لذتوں پر دل و جان سے قربان ہوجانا نہ یہ کہ صرف ابدی سعادت سے محرومی کا سبب ہے بلکہ ہمیشہ کی بدبختی کا بہت بڑا ذریعہ بھی ہے۔

وضاحت۔

یہ کہ اگر انسان، ابدی سعادت کے بجائے دنیا کی جلد گذر جانے والی لذتوں کا انتخاب کرے اس طرح کہ اس کی اخروی زندگی کا کوئی نقصان نہ ہوتو ایسا اقدام اخروی سعادت کے غیر

....

۱۔آل عمران ۱۸۵،عنکبوت ٦٤،محمد ٣٦،حدید٢٠،

۲۔عنکبوت ٦٤،فجر ٢٤،

۳۔اعلیٰ١٦،فجر ٢٤ ،ھود ٢٢ ،کہف ١٠٤، ١٠٥، نمل، ٤، ٥

معمولی رجحان کو دیکھتے ہوئے ایک غیر عاقلانہ کام ہے لیکن کیا کیا جائے کہ کسی کو بھی عالم ابد یت سے مفرنہیں ہے اور وہ کہ جس نے اپنی ساری قوّتوں کو دنیا کی زندگی کے اُوپر صرف کرد ے اور عالم آخرت کو بھلا بیٹھے یا بالکل سرے سے اس کا انکار کردے تو نہ صرف یہ ہے کہ بہشتی نعمتوں سے محروم ہو گیا بلکہ ہمیشہ کے لئے جہنم کے عذاب میں گرفتار ہو جائے گا ،اور اُس کا دوگنا نقصان ہو گا(۱) اسی لئے قرآن مجید ایک طرف تو آخرت کی نعمتوں کی برتری اور فضیلت کو گوش گذار اور ہوشیار کررہا ہے کہ خبر دار کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیاوی زندگی تم کو دھوکا دیدے(۲) اور دوسری طرف دنیا سے قلبی لگاؤ اور آخرت کو بھول جانے ، جہان ابدی سے انکار یا اس کے بارے میں شک وشبہ کے نقصانات کو گنوار ہا ہے اور اس بات کی تاکید کررہا ہے کہ ایسے امور ہمیشہ کی شقاوت اور بدبختی کا سبب ہیں اور ایسا بھی نہیں ہے کہ دنیا کو ترجیح دینے والا صرف آخرت کی جزا سے محروم رہے گا بلکہ ہمیشہ کی سزا اُس کا مقدر بن جائے گی (۳) اور اس کا راز وسبب یہ ہے کہ دنیا پرست انسان نے خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کو ضائع کردیا اور وہ درخت جو ابدی سعادت کا پھل دینے والا تھا اسکو خشک و بے پھل کر دیا ،اور اس نے حقیقی نعمت عطا کرنے والے (خدا) کے حق کا لحاظ نہیں کیا ،اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اسکی مرضی کے خلاف استعمال کیا اور ایسا شخص جب اپنے برُے انتخاب کے نتیجے کو دیکھے گا تو یہ آرزو کرے گا کہ اے کاش میں مٹی ہو جاتا ،اور ایسی بری عاقبت میں مبتلا نہ ہوتا (٤)

....

١۔ھود/ ٢٢، کھف/ ١٠٢۔١٠٥، نمل/ ٤۔٥

٢۔بقرہ ١٠٢، ٢٠٠، توبہ ٣٨، روم ٣٣ فاطر ٥، شوریٰ ٢٠، زخرف ٣٤، ٣٥،

٣۔اسراء ١٠، بقرہ ٨٦، انعام ١٣٠، یونس ٧، ٨، ھود ١٥، ١٦، ابراہیم ٣، نحل ٢٢، ١٠٧، مومنون ٧٤، نمل ٤، ٥، ٦٦ روم ٧، ١٦، لقمان ٤، سبا ٨، ٢١، زمر ٤٥، فصلت ٧، نازعات ٣٨، ٣٩،

٤۔نبا ٤٠،

سوالات:

١۔دنیاوآخرت کے درمیان کیا فرق ہے؟

٢۔دنیا کی مذمت کیوں کی گئی ہے؟ وضاحت کیجئے؟

٣۔دنیا سے لگاؤ کے کیا نقصانات ہیں؟

٤۔آخرت پر ایمان نہ رکھنا ابدی عذاب کا سبب کیوں ہے؟

باونواں درس

دنیا آخرت کی کھیتی ہے

مقدمہ:

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے
دنیا آخرت کی کھیتی ہے ۱۔ دنیاوی نعمتیں آخرت کی سعادت کا سبب بن سکتی ہیں
۲۔ دنیا کی نعمتیں اخروی شقاوت (بدبختی) کا سبب نہیں بن سکتی۔

۳۔ نتیجہ گفتگو

مقدمہ:

ہمیں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ انسانی زندگی اس جلد گذر جانے والی دنیاوی حیات پر منحصر نہیں ہے، بلکہ دوبارہ عالم آخرت میں زندہ ہونا ہے اور وہاں ہمیشہ زندہ رہنا ہے اور ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ آخرت کی زندگی ہی عینی اور حقیقی حیات ہے، حد تو یہ ہے کہ دنیاوی زندگی کو خروی حیات کے سامنے زندگی کہنا مناسب ہی نہیں ہے ایسا نہیں ہے کہ اخروی زندگی کا مطلب فقط نیک و بد ہونا یا ایک فرضی وخیالی امر ہونا ہے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم دنیا و آخرت کی زندگی کے درمیان موجودہ رابطے کو بیان کرتے ہو ئے اس کی نوعیت واضح کریں اگر چہ گذشتہ بحثوں میں کسی حد تک اس رابطہ کے بارے میں بیان کیا جا چکا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مزید اور وضاحت کر دی جائے اور عقلی دلیلوں اور قرآنی بیانات کی روشنی میں دنیا و آخرت کے مابین رابطہ کو واضح کیا جائے۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے

یہاں پر سب سے پہلے جس بات کی تاکید کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آخرت کی خوشبختی اور بد بختی دنیا میں انجام پانے والے انسانی رفتار و کردار کی تابع ہے اور ہر گز ایسا نہیں ہے کہ آخر ت کی نعمتوں کو حاصل کرنے کے لئے آخرت ہی میں کوشش کرے، اور جس کے پاس جتنی زیا

دہ جسمانی اور فکری قوت پائی جائے گی وہ اتنا ہی زیادہ نعمتوں سے سرفراز ہوگا، یا فریب اور دھوکا، دھڑی کے ذریعہ دوسروں کی ایجادات سے غلط فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں جیسا کہ بعض نا دان افراد کے ذہنوں میں یہ غلط تصور پایا جاتا ہے اور وہ آخرت کی زندگی کو دنیا سے بالکل علیحدہ اور مستقل تصور کرتے ہیں۔

قرآن کریم بعض کفار کے قول کو اس طرح نقل کر رہا ہے۔

(وَما اَظُنُّ السّاعَۃَ قائِمَۃً وَلَئِن رُدِدتُ اِلیٰ رَبّیِ لَاَجِدَنَّ خَیراً مِنهَا مُنقَلَباً)(۱)

(دنیا پرست انسان نے کہا) کہ مجھے تو اس بات کا گمان بھی نہیں ہوتا کہ کبھی قیامت آئے گی اور اگر آ بھی گئی تو جب میں اپنے پرورگار کی طرف لوٹا یا جاؤں گا تو یقیناً اس دنیا سے کہیں بہتر پاؤں

گا اور دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے۔

(وَمَا اَظُنُّ السّاعَۃَ قَائِمَۃً وَلَئِن رُجِعتُ اِلیٰ رَبّیِ اِنَّ لِی عِندَہُ لَلحُسنیٰ)(۲)

قیامت کا آنا تو میرے وہم و گمان میں نہیں ہے لیکن اگر آ گئی، تو جب میں اپنے رب کی طرف لوٹا یا جاؤں گا تو خدا کے نزدیک سب سے بہترین نعمتیں پاؤں گا ایسے لوگوں کا، یا تو یہ خیال تھا، کہ آخرت میں بھی سعی و کوشش کے ذریعہ نعمتوں کو حاصل کیا جا سکتا ہے یا تو یہ گمان تھا، کہ دنیا میں ان لوگوں کا مالدار ہونا، خدا کی جانب سے ایک خاص کرم اور احسان ہے، بس آخرت میں بھی خدا کے یہ احسانات اور الطاف ان کے شامل حال ہوں گے۔

....

۱۔ کہف ۳۶

۲۔فصلت، ۵،

بہرحال اگرکوئی انسان آخرت کی زندگی کو دنیاوی زندگی سے بالکل الگ اور مستقل حیثیت جا نتا ہے اور دنیا میں انجام دئے ہوئے نیک و بداعمال کو آخرت کی نعمتوں اور عذاب کے او پر مو ثر تصور کرتا ہے تو گویا، وہ قیامت پر جو آسمانی ادیان کے اعتقادی اصول میں سے ایک ہے ایمان نہیں رکھتا، کیونکہ اس اصل کا وجود دنیاوی اعمال کی جزاوسزا کے عنوان سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کو بازار، محل تجارت یا کھیتی کا نام دیا گیا ہے، یہی وہ جگہ ہے کہ جہاں انسان کام کرے، زراعت کرے، محنت وکوشش کرے تو اس کی درآمد (اس کا فائدہ) وہاں (قیامت میں) حاصل کرے گا (۱) قیامت کے متعلق موجودہ دلیلیں اور قرآنی بیانات کا تقاضا بھی یہی ہے جس میں کسی قسم کی شرح وتوضیح کی ضرورت نہیں ہے۔

دنیا کی نعمتیں آخرت کی سعادت (خوشبختی) کا سبب نہیں

بعض دیگر افراد کا خیال یہ تھا کہ دنیا میں دولت، فرزند، اور دیگر تمام اسباب عیش وآرام آخرت میں بھی راحت وسکون کا باعث ہوں گے اور شاید یہی وجہ ہے کہ میت کے ہمراہ زروجواہر اور قیمتی موتیوں یہاں تک کہ خوردنوش کے سامان بھی دفن کردیتے تھے، اور یہ غلط رسم اسی تصور کا نتیجہ تھی (ان سے مربوط رفتار سے قطع نظر) قرآن کریم اس بات کی تاکید کررہا ہے مال وفر زند خود بخود (قطع نظر اس سے کہ اس کے اعمال کیسے ہیں؟) تقرب الٰہی کا ذریعہ نہیں بن سکتے (۲) اور نہ آخرت میں کسی کو نفع پہنچائیں گے (۳) اور بنیادی طور سے ایسے روابط اور اسباب

کوایک دن ختم ہونا ہے(٤)اور ہر انسان اپنا سرمایہ اور اپنے سے متعلق تمام اشیا کو یہیں چھوڑ جائیگا(٥)اور بالکل تنہا خداوند عالم کی

....

١۔قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں دنیاوی جزااور سزا کا بھی ذکر موجود ہےلیکن مکمل جزااور سزا آخرت سے مخصوص ہے

٢۔سبا٣٧، ٣۔شعراء٨٨،لقمان ٣٣،آل عمران ١٠،١١٦،مجادلہ ١٧، ٤۔بقرہ١٦٦،مومنون١٠١، ٥۔انعام٩٤،

بارگاہ میں جائیگا(١)اورصرف خدا سے معنوی روابط میں استحکام پایا جائیگا،اسی لئےصرف وہی مومنین جو اپنے شریک حیات،اولاد،اور قرابت داروں سے ایمانی رشتہ جوڑے ہوئے ہیں بہشت میں ایک ساتھ رہیں گے(٢)۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ دنیاوآخرت کے مابین ارتباط،دنیاوی موجودات کے درمیان پائے جانے والے تعلقات کی طرح نہیں ہیں اور ہرگز ایسا نہیں ہے کہ جو اس دنیا میں سب سے زیادہ قوی،حسین،خوشحال اور مالدار ہوگا،وہ آخرت میں بھی ویسا ہی محشور ہوگا ورنہ فرعون،قارون،وغیرہ آخرت میں زیادہ سعادت کے حق دار ہوں گے،بلکہ ممکن ہے کہ وہ لوگ جو اس دنیا میں تنگ دستی ناتوانی اور رنج ومصبت کی زندگی گذار رہے ہیں وہ پرورگار عالم کے احکام پرعمل کرنے کے نتیجے میں بالکل سالم قوی اور حسین وجمیل محشور ہوں اور ابدی نعمتوں سے سرفراز ہوں۔

بعض نادان افراد کا خیال یہ ہے کہ آیہ شریفہ

(وَمَن كَانَ فِي هٰذِهِ أَعمىٰ فَهُوَ فِ الآخِرَةِ أَعمىٰ وَأَضَلُ سَبِيلًا)(۳)

کا مفہوم یہ ہے کہ دنیاوی سلامتی اور فائدہ اور آخرت کی سلامتی اور فائدے کے درمیان براہ راست رابطہ پایا جاتا ہے درآن حالیکہ یہ لوگ اِس بات سے غافل ہیں کہ اس آیت میں (اند ھا) سے مراد ظاہری نابینا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد دل کا اندھا ہونا ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

(فَإِنَّهَا لا تَعمَى الابصَارُ وَلَكِن تَعمِ القُلُوبُ الَّت فِ الصُّدُورِ)(۴)

آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینوں میں موجود دلوں میں اندھا پن پایا جاتا ہے، اور ایک دو سرے مقام پر اس طرح ارشاد ہے:

....

۱۔مریم ۸۰، ۹۵،

۲۔رعد ۳۳، غافر ۸، طور ۲۱،

۳۔اسراء ۷۲، (جو اس دنیا میں اندھا ہوگا وہ آخرت میں اندھا اور گمراہ رہیگا)

٤۔حج ٤٦

(وَمَن أَعرَضَ عَن ذِكرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكاً وَنَحشُرُهُ يَومَ القِيامَةِ أَعمى. قالَ لِمَ حَشرتنِي أَعمىٰ وَقَد كُنتُ بَصيراً. قال كَذَالِكَ أَتَتكَ آياتُ رَبّك فَنَسِيتَهَا وَكَذَالِكَ اليَومَ تنسىٰ)(۱)

جو میری یاد (کتاب) سے اعراض کریگا اس کو اپنی زندگی میں سختیوں، پریشانیوں کا سامنا کرنا

پڑے گا اور ہم اسے قیامت میں اندھا محشور کریں گے (کہنے والے نے کہا) مجھے اندھا کیوں محشور کیا گیا باوجودیکہ میں بینا تھا خدا کہیگا جس طرح میری نشانیاں تجھ تک پہنچیں لیکن تونے اسے فراموش کر دیا اسی طرح آج تجھے بھلا دیا گیا، بس دنیا وآخرت کا رابطہ اس رابطے سے جدا ہے جو دنیاوی سبب ومسبب (علت ومعلول) کے درمیان ہوتا ہے۔

دنیا کی نعمتیں آخرت کی شقاوت (بد بختی) کا سبب بھی نہیں ہوسکتیں

دوسری طرف: بعض لوگوں کا گمان ہے کہ دنیا کی نعمتوں اور آخرت کی نعمتوں میں برعکس رابطہ برقرار ہے یعنی وہ لوگ آخرت کی سعادت تک پہنچ سکتے ہیں جنھوں نے دنیا کی نعمتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھا ہے اور اس کے برعکس یعنی وہ لوگ جو دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز ہیں وہ آخرت کی خوشبختی سے محروم رہیں گے اور (ان لوگوں نے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے) آیات وروایات کا سہارا بھی لیا ہے جو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ دنیا پرستوں کے حصے میں آخرت کا کوئی حق نہیں ہے درآں حالیکہ یہ لوگ اس بات سے غافل ہیں (۲)(کہ یہ ان کے مدعیٰ پر دلیل نہیں ہے) دنیا طلبی دنیا کی نعمتوں سے استفادہ کے معنی میں نہیں ہوسکتا، بلکہ دنیا طلب وہ ہے جو دنیا کی لذتوں کو اپنا نصب العین بنالے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے

اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اگر چہ ممکن ہے
اس تک نہ پہنچ سکے اور آخرت طلب وہ ہے جو دنیا کی سرمستیوں میں نہ کھو جائے بلکہ اس کا مقصد آخرت کی خوشگوار زندگی ہو، اگر چہ ممکن ہے دنیاوی نعمتوں سے جی بھر کے فائدہ اٹھا چکا ہو جیسے حضرت

....

١۔ طٰہٰ ١٢٤۔١٢٦

٢۔ بقرہ ٢٠٠، آل عمران ٧٧، اسراء ١٨، شوریٰ ٢٠، احقاف ٢٠،

سلیمان اور دیگر بہت سارے انبیا کرام اور اولیاء خدا (ع) کہ جو دنیا کی بے پناہ نعمتوں سے مالا مال تھے لیکن ان نعمتوں کے ذریعہ آخرت کی سعادت اور تقرب الٰہی کو حاصل کرنے میں کوشاں رہے۔

بس دنیا و آخرت کی نعمتوں کے درمیان نہ ہی براہ راست رابطہ پایا جاتا ہے اور نہ ہی برعکس (بہ صورت منفی) بلکہ دنیا کی نعمتیں بھی اور مصیبتیں بھی خداوند متعال کی حکیمانہ تدبیر کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تقسیم کی گئی ہیں (١) اور ساری چیزیں انسانوں کی آزمائش کا ذریعہ ہیں (٢) اور دنیا کی فانی نعمتوں سے دامن بھرا ہوا ہونا، یا اس سے محروم ہونا خود بخود رحمت الٰہی سے دوری یا نزدیکی کی علامت نہیں ہے اور سعادت (خوشبختی) یا شقاوت (بدبختی) کا سبب بھی نہیں ہے (٣)

نتیجہ کلام:

اس پوری گفتگو سے جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا وآخرت کے درمیان ہر قسم کے را بطے کا انکار کر دینا خود قیامت کے انکار کے حکم میں ہے، لیکن نہ آخرت کی نعمتوں کے درمیان کوئی رابطہ ہے اور نہ دنیا کی نعمتوں اور آخرت کے عذاب کے درمیان اور نہ اس کے برعکس۔
اور بطور کلی دنیا وآخرت کے درمیان رابطہ، دنیاوی موجودات کے مابین پائے جانے والے را بطے کے جیسا نہیں ہے اور اس پر فیزیکس اور بیالوجی کے قوانین کا حکم نہیں لگایا جا سکتا ، بلکہ وہ جو نعمت یا عذاب آخرت کا سبب ہے وہ اِسی دنیا میں انسان کے اپنے اختیاری اعمال ہیں، لیکن اس لحاظ سے نہیں کہ قوت کا خروج کرنا اور مواد میں تغیرات پیدا کرنا بلکہ اس لحاظ سے کہ نعمت اور عذاب کے سبب کا سرچشمہ ایمان اور باطنی کفر ہے۔

....

١۔زخرف ٣٢،

٢۔انفال ٢٨ ،انبیاء ٣٥ ،تغابن ١٥ اعراف ١٦٨، کہف ٧ مائدہ ٤٨ ،انعام ١٦٥، نمل ٤٠ ، آل عمران ١٨٦،

٣۔آل عمران ١٧٩،مومنون ٥٦ ،فجر ١٥، ١٦،

اور سیکڑوں آیاتِ قرآنی سے اس مفہوم کو اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کے نزدیک آخرت کی ابدی خوشختی تک پہنچنے کا سبب خدا روز قیامت نیز انبیاء الٰہی پر ایمان رکھنا ہے اور خدا کے پسند یدہ اعمال جیسے نماز، روزہ، حج وزکواۃ، اور بندگان خدا کے ساتھ احسان (نیکی) اور امر بہ معرو

ف (نیکیوں کا حکم دینا) نہی از منکر (برائیوں سے روکنا) کفار اور ستمگروں سے جہاد اور عدل و انصاف کرنا ہے۔

اور عذاب ابدی میں مبتلا ہونے کا سبب کفر، شرک، ونفاق قیامت کا انکار انبیائ (ع) کو جھٹلا نا نیز گناہوں کا مرتکب ہونا، اور ظلم کرنا ہے اور بہت ساری قرآنی آیات میں اجمالی طور سے ایمان اور عمل صالح (۱) کو آخرت کی سعادت کا سبب جانا گیا ہے اور کفر و گناہ (۲) کو آخرت کی بدبختی کا باعث تصور کیا گیا ہے۔

....

۱۔ بقرہ ۲۵، ۳۸، ۶۲، ۸۲، ۱۰۳، ۱۱۲، ۲۷۷، آل عمران ۱۵، ۵۷، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۳۳، ۱۷۹، ۱۹۵، ۱۹۸، نساء ۱۳، ۵۷، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۴۶، ۱۵۲، ۱۶۲، ۱۷۳، مائدہ ۹، ۶۵، ۶۹، انعام ۴۸، توبہ ۷۲ یونس ۴، ۹، ۶۳، ۶۴، رعد ۲۹، ابراہیم ۲۳، نحل ۹۷، کہف ۲، ۲۹، ۳۰، ۱۰۷، طٰہ ۷۵، حج ۱۴، ۲۳، ۵۰، ۵۶، فرقان ۱۵، عنکبوت ۷، ۹، ۵۸، روم ۱۵، لقمان ۸، سجدہ ۱۹، سبا ۴، ۳۷، فاطر ۷، ص ۴۹، زمر ۲۰، ۳۳، ۳۵، غافر ۴۰، فصلت ۸ شوریٰ ۲۲، ۲۶، جاثیہ ۳۰، فتح ۱۷، حدید ۱۲، ۲۱، تغابن ۹، طلاق ۱۱، انشقاق ۲۵، بروج ۱۱، تین ۶، بینہ ۷، ۸،

۲۔ بقرہ ۲۴، ۳۹، ۸۱، ۱۶۱، ۱۶۲، آل عمران ۲۱، ۵۶، ۸۶، ۸۸، ۹۱، ۱۱۶، ۱۳۱، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۹۶، ۱۹۷، نساء ۱۴، ۵۶، ۱۲۱، ۱۴۵، ۱۵۱، ۱۶۱، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۳، مائدہ ۱۰، ۳۶، ۷۲، ۸۶، انعام ۴۹، توبہ ۳، ۶۸، یونس ۴، ۸، رعد ۵، کہف ۳۲، غافر ۶، شوریٰ ۲۶، جاثیہ ۱۱، فتح ۱۳، ۱۷، حدید ۱۹، مجادلہ ۵، تغابن ۱۰، ملک ۶، انشقاق ۲۲، ۲۴، غا

شیہ ۲۳،۲٤، بینہ ٦

سوالات:

۱۔دنیاوآخرت کے درمیان رابطے کے انکار میں کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟

۲۔آخرت کے لئے دنیا کے کھیتی ہونے کا کیا مطلب ہے وضاحت کیجئے ؟

۳۔دنیااورآخرت کی نعمتوں کے درمیان کون سی نسبت پائی جاتی ہے؟

٤۔دنیا کی نعمتوں اورآخرت کے عذاب کے درمیان کیا رابطہ ہے؟

٥۔دنیا کے وہ کون سے امور ہیں جن کا آخرت کی سعادت یا شقاوت سے حقیقی رابطہ ہے؟

ترپنواں درس

دنیاوآخرت کے درمیان رابطہ کی قسم

مقدمہ:

جوحسب ذیل بحثوں پر مشتمل ہے

رابطہ حقیقی ہے یا فرضی

قرانی دلیلیں

مقدمہ:

ہم کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ایک طرف تو ایمان اور عمل صالح کے درمیان اور دوسری طرف تقرب پروردگار اور آخرت کی نعمتوں کے درمیان اور اسی طرح سے ایک طرف تو کفر اور گناہ کے درمیان اور دوسری طرف خدا سے دوری اور ابدی نعمتوں سے محرومی کے درمیان مناسبت اور براہ راست ابطہ پایا جاتا ہے۔

اور اسی طرح ایمان وعمل صالح اور عذابِ آخرت کے درمیان اور کفر وگناہ اور ابدی نعمتوں کے درمیان برعکس نسبت پائی جاتی ہے۔

اور قرآن کریم کی روشنی میں ان نسبتوں کے اصول ہونے کے بارے میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے اور اُن کا انکار کرنا گویا خود قرآن کا انکار کرنا ہے۔

لیکن اس اہم اور ضروری گفتگو کے متعلق کچھ ایسے مسائل سامنے آتے ہیں کہ جس کے بارے میں بحث اور وضاحت کی ضرورت ہے، بطور مثال یہ کہ آیا مذکورہ روابط حقیقی ہیں یا تکوینی؟ اور کیا یہ روابط، وضع واعتبار (معاہدے) کے تابع ہے؟ ایمان اور عمل صالح کے درمیان کیا را بطہ ہے؟ اور کفر وگناہ کے درمیان کیا نسبت ہے؟ اور کیا خود اعمال صالح اور برے اعمال کے درمیان موثر اور متاثر ہونے کے اعتبار سے کوئی رابطہ پایا جاتا ہے یا نہیں؟

اس درس میں ہم سب سے پہلے، مسئلہ سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کرنا چاہیں گے کہ مذکورہ روابط فرضی اور قراردادی امور میں سے نہیں ہیں۔

رابطہ حقیقی ہے یا قراردادی (فرضی)

جیسا کہ ہم نے بارہااس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دنیاوی اعمال اور نعمتوں یا آخرت کے عذاب کے درمیان کوئی معمولی یا مادی روابط نہیں پائے جاتے کہ جن کو فیزیکی یا کیمیاوی قوانین کی بنیاد پر بیان کرتے ہوئے اس کی تفسیر کی جائے، حتیٰ یہ تصور جو بعض لوگوں کا ہے، کہ انسانی اعمال میں جو قوت صرف ہوتی ہے وہ ان لوگوں کے نظریہ کی بنیاد پر جو اس بات کے قائل ہیں، کہ مادہ اور قوت ایک دوسرے سے تبدیل ہو کر مجسم ہو جاتا ہے اور آخرت کی نعمتوں یا عذابوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں یہ ایک غلط تصور ہے کیونکہ۔

۱۔ایک انسان کی گفتار اور کردار میں استعمال ہونے والی قوت کی مقدار اتنی بھی نہیں ہے کہ جو مجسم ہونے کے بعد ایک سبب کے برابر ہو سکے، چہ جائے کہ جنت کی بے شمار نعمتوں میں تبدیل ہو جائے

۲۔ یہ کہ مادہ اور قوت کا ایک دوسرے میں تبدیل ہونا کسی خاص عوامل و اسباب کے مطابق ہوتا ہے جس کا اعمال کی نیکی یا برائی اور فاعل (انسان) کی نیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور کسی بھی طبیعی (فطری) قانون کی بنا پر خالص اعمال اور دکھاوے کے اعمال میں امتیاز قائم نہیں کیا جا سکتا تا کہ یہ کہا جا سکے کہ ایک کی قوت نعمت میں تبدیل ہو گئی ہے اور دوسرے کی قوت عذاب میں بدل گئی ہے۔

۳۔وہ قوت اور طاقت جو ایک مرتبہ کسی عبادت میں کام آ چکی ہے ممکن ہے دوسری مرتبہ کسی گناہ میں استعمال ہو۔

لیکن ایسے رابطے کا انکار کرنا حقیقی رابطے کے مطلقاً انکار کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ حقیقی ارتبا

طات کا دائرہ ناشناختہ اور غیر مجرب روابط کو بھی شامل ہے اور جس طرح علوم تجربی (تجر بیاتی علوم) دنیوی اور اخروی علوم، موجودات کے درمیان رابطہ سببیت کو ثابت نہیں کرسکتا اسی طرح ان

کے درمیان سببیت اور مسببیت کے رابطے کے باطل کرنے کے اُو پر بھی قادر نہیں ہیں، اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اچھے اور بُرے اعمال انسانی روح پر واقعی اثر رکھتے ہیں اور وہی روحی اثر ہے جو آخرت کی نعمت یا عذاب کا سبب ہے جسے دنیا کی خارق عادت (غیر معمولی) موجودات میں بعض نفسوں کے اثر انداز ہوتے ہیں ایسا فرض غیر معقول نہیں ہوگا بلکہ فلسفہ کے خاص اصول کی مدد سے اس کو ثابت بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کتاب میں اس بیان کی گنجائش نہیں ہے۔

قرآنی دلیلیں:

اگرچہ قرآنی بیانات اکثر مقامات پر فرضی اور قرادادی رابطے کو ذہن سے نزدیک کرتے ہیں، جسے وہ آیات شریفہ جو اجر و جزا کی تعبیر پر مشتمل ہے (۱) لیکن دوسری آیتوں سے انسان کے اعمال اور آخرت کے ثواب وعقاب کے درمیان فرضی اور قراردادی رابطہ کے علاوہ دوسرے رابطے کا بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے گروہ کی آیتوں کی تعبیر سمجھنے میں آسانی کے لئے اور اکثر لوگوں کی فکری سطح کی مناسبت سے ہے کہ جن کا ذہن ایسے مفاہیم سے زیادہ مانوس ہوتا ہے۔

اسی طرح احادیث شریفہ میں بھی بے شمار دلیلیں موجود ہیں جو یہ بیان کررہی ہیں کہ انسان کے اختیاری اعمال کی کئی ملکوتی اور مثالی شکلیں جو عالم برزخ اور قیامت میں ظاہر ہوں گی۔

اب ہم ان آیات شریفہ کو جو انسان کے اعمال اور آخرت کے نتیجوں کے درمیان حقیقی رابطے پر دلالت کرتی ہیں سامنے رکھتے ہیں

۱۔(وَمَا تُقَدِّمُوا لِاَنفُسِکُم مِن خَیرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللّٰہِ)(۲)

ہر وہ نیکی جس کو تم نے پہلے سے بھیج دیا ہے خدا کے پاس اُسے پاؤ گے۔

....

۱۔اجر کی تعبیر تقریباً نوے (۹۰) مرتبہ اور جزا کی تعبیر اور اس کے مشتقات کی تعبیر ایک سو سے زیادہ قرآن مجید میں استعمال ہوتی ہے۔

۲۔بقرہ۔۱۱۰،اور سورہ مزمل آیت نمبر ۲۰ کا بھی مطالعہ کریں

۲۔(یَومَ تَجِدُ کُلُّ نَفسٍ مَا عَمِلَت مِن خَیرٍ مُحضَراً وَمَا عَمِلَت مِن سُوءٍ تَوَدُّ لَو اَنَّ بَینَهَا وَبَینَهُ اَمَداً بَعِیداً)(۱)

اس دن جب ہر شخص اپنے انجام دئے ہوئے ہر اعمال خیر کو اپنے سامنے حاضر دیکھے گا، اور اپنے برے اعمال کو بھی دیکھے گا تو اس بات کی تمنا کرے گا کہ اس کے اور اعمال کے درمیان دوری اور فاصلہ ہو جائے۔

۳۔(یَومَ یَنظُرُ المَرءُ مَا قَدَّمَت یَدَاهُ)(۲)

اُس دن جب انسان دیکھے گا کہ اس کے ہاتھوں نے پہلے کیا بھیجا ہے

۴۔(فَمَن یَعمَل مِثقَالَ ذَرَّةٍ خَیراً یَرَهُ ۔ وَمَن یَعمَل مِثقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً یَرَهُ)(۳)

بس اگرکسی ایک نے ذرہ برابر بھی کارخیر انجام دیا ہے تو اسے (ضرور) دیکھے گا اور اگر کسی نے ایک ذرہ برابر بھی بُرا کام کیا ہے تو وہ بھی اسے دیکھے گا۔ ٥۔

(هَل تجزَونَ اِلّا مَا کُنتُم تعمَلُونَ)(٤)

کیا وہ جزا جو تمکو دی جائے گی ان اعمال کے علاوہ ہے جو تم نے (دنیا میں) انجام دیا ہے۔

٦۔(اِنَّ الَّذِینَ یَاکُلُونَ اَموَالَ الیَتَامیٰ ظُلماً اِنَّمَا یَاکُلُونَ فِ بُطُونِہِم نَاراً)(٥)

بے شک وہ لوگ جو یتیموں کا مال ناحق (چھین) کر کھاتے ہیں گو یا وہ لوگ اپنے شکم کو آگ سے بھرتے ہیں۔

....

١۔آل عمران۔ ٣٠

٢۔نبا۔ ٤٠

٣۔زلزال ٧،٨

٤۔نمل۔ ٩٠،اورسورہ قصص آیہ نمبر ٨٤ کی طرف رجوع کریں۔

٥۔نساء،١٠

ظاہر ہے کہ قیامت کے روز انسان کے لئے اس دنیا میں انجام دئے ہوئے اعمال کا دیکھ لینا ،اس کی جزا یا سزا نہیں ہوسکتی بلکہ یہ اس کی ملکوتی اور مثالی صورتیں ہیں جو مختلف نعمتیں اور قسم قسم کے عذاب کی شکل میں ظاہر ہونگی اور انسان انھیں شکلوں کے ذریعہ نعمت سے سرفراز ہوگا

یا عذاب میں مبتلا ہوگا جیسا کہ اس آخری آیہ شریفہ سے استفادہ ہوتا ہے کہ یتیم کے مال کو کھانے کی باطنی صورت آگ کا کھانا ہے اور جس وقت دنیا (قیامت) میں حقیقتیں کھل کر سامنے آئیں گی تب معلوم ہوگا کہ فلاں حرام غذا کا باطن آگ ہی تھی، اور پھر اس کے اندر جلنے کی تکلیف کو محسوس کرے گا اور پھر اس سے کہا جائے گا کیا یہ آگ اس حرام مال کے سوا کچھ اور ہے جو تو نے کھایا تھا؟

سوالات:

۱۔اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ اعمال کے مجسم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قوت (انرژی) جو کام کو انجام دینے میں کام آئی ہے وہ مواد میں تبدیل ہوتی ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟

۲۔انسان کے اعمال اور اس کے آخروی نتائج کے درمیان کیا رابطہ ہے؟ اس رابطے کو عقلی طور سے کیسے تصور کیا جاسکتا ہے؟

۳۔اعمال کے مجسم ہونے پر کون سی آیات دلالت کرتی ہیں اور اجر و جزا جیسی تعبیر کے استعمال کرنے کا سبب کیا ہے؟

٤۔کیا اعمال کے مجسم ہونے کی تفسیر یہ ہوسکتی ہے کہ خود اعمال اپنی اسی دنیاوی شکل میں ظاہر ہونگے اور کیوں؟

چوّنواں درس

ابدی خوشبختی یا بدبختی میں ایمان کا دخل

مقدمہ:

ایمان اور کفر کی حقیقت

جو مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے

ایمان اور کفر کا نصاب (حد)

ابدی خوشبختی یا بدبختی میں ایمان کی تاثیر

قرآنی دلیلیں

مقدمہ:

ایک اور مسئلہ جو پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا ایمان اور عمل صالح میں سے ہر ایک (الگ الگ) مستقل طور سے ابدی سعادت کا سبب ہیں، یا دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر سعادت کا سبب بنتے ہیں؟ اور اسی طرح کیا کفر اور عصیان (گناہ) میں سے ہر ایک مستقل طور سے عذاب ابدی کا باعث ہیں یا دونوں باہم ایک ساتھ یہ اثر رکھتے ہیں؟ اگر ان دونوں مسئلوں میں ہم دوسری حالت کو مان لیں (یعنی دونوں مل کر سعادت یا شقاوت کا سبب ہیں) تو ایسی صورت میں اگر کوئی شخص صرف ایک چیز ایمان یا عمل صالح رکھتا ہو تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ اسی کے مانند اگر کوئی انسان صرف کفر اختیار کرے یا صرف کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہو، تو اس کی عاقبت کا کیا ہوگا؟ اور اگر ایک باایمان شخص حد سے زیادہ گناہوں کا ارتکاب کرے، یا ایک کافر انسان بے شمار کار خیر انجام دے تو کیا اس کی عاقبت بخیر ہوگی یا اس کے بھی بُرے انجام ہوں گے؟ اور کسی بھی صورت میں اگر کوئی انسان اپنی زندگی کے کچھ حصے ایمان اور عمل صالح کے ساتھ گذارے، اور زندگی کے کچھ حصّہ کفر اور گناہ سے آلودہ بسر کرے تو ایسے شخص کا کیا حشر ہوگا؟

یہ وہ مسائل ہیں جن کے سلسلے میں اسلام کے ظہور کی پہلی صدی سے بحث ہوتی چلی آ رہی ہے، اور خوارج جیسے گروہ کے افراد کا عقیدہ یہ ہے کہ صرف گناہ کا ارتکاب ابدی شقاوت کا ایک مستقل سبب ہے اور صرف یہی نہیں، بلکہ کفر اور ارتداد کا باعث بھی ہے، اور دوسرا گروہ جیسے مُرجِئہ کہتے ہیں، اس گروہ کے افراد کا عقیدہ یہ ہے کہ صرف ایمان کا پایا جانا ابدی نجات کے لئے کافی ہے، اور گناہوں کا ارتکاب مومن کی سعادت کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا،

لیکن حق بات یہ ہے کہ ہر گناہ ابدی شقاوت (بدبختی) کا سبب نہیں ہوتا، اگرچہ ممکن ہے گناہوں کی زیادتی ایمان کے سلب ہونے کی وجہ بن جائے،اور دوسری طرف ایسا بھی نہیں کہ ایمان رکھنے کی صورت میں سارے گناہ بخش دیئے جائیں، اور کوئی گناہ اپنا بُرا اثر نہ رکھے۔

اس درس میں ہم سب سے پہلے ایمان اور کفر کی وضاحت کریں گے اور پھر یہ بیان کریں گے کہ ابدی سعادت اور بدبختی میں ایمان و کفر کا کیا دخل ہے اور دوسرے مسائل کو انشاء اللہ آئندہ، درسوں میں بیان کریں گے۔

ایمان اور کفر کی حقیقت

ایمان ایک قلبی اور نفسیاتی حالت کا نام ہے جو کسی ایک مفہوم کو جاننے اور اس کی طرف میلان کے اثر سے پیدا ہوتی ہے،اور انہیں دونوں اسباب میں شدت اور ضعف کی بنا پر کمال یا نقص پیدا ہوتا ہے،اور اگر انسان کسی شئی کے وجود سے، چاہے وہ غیر یقینی ہی کیوں نہ ہو، آگاہ نہ ہو تو اس پر ایمان بھی نہیں لاسکتا، لیکن فقط آگاہ ہونا، یا اطلاع حاصل کر لینا کافی نہیں ہے، اس لئے کہ ممکن ہے جس سے آگاہی حاصل ہوئی ہے یا وہ اس کے بعض لوازمات انسان کی خواہش کے خلاف ہوں اور وہ اس کے برخلاف رجحان رکھتا ہو، اس بناء پر وہ اس کے لوازمات پر عمل کرنے کا فیصلہ نہ کرے، بلکہ اس کے خلاف عمل کرنے کا فیصلہ کر لے، جیسا کہ قرآن کریم فرعونیوں کے بارے میں فرما رہا ہے،

(وَ جَحَدُوا بِهَا وَاستَقَينَتهَا اَنفُسُهُم ظُلمًا و عُلُواً)(۱)

ظلم اور منزلت طلبی کے نشہ میں آیات الٰہی کا انکار کر دیا باوجود یکہ اس کا یقین کر چکے تھے اور جناب موسیٰ نے فرعون کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا،

(لَقَد عَلِمتَ مَا اَنزَلَ هٰؤُلاءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰواتِ وَالارضِ)(۲)

بے شک تم جانتے ہو کہ ان آیات اور معجزات کو سوائے زمین وآسمان کے پروردگار کے کسی اور نے نہیں نازل کیا۔

باوجود یکہ وہ (فرعون) ایمان نہیں لایا تھا لوگوں سے کہتا تھا، (مَا عَلِمتُ لَکُم مِن اِلٰہ غَیرِ) (۳) میں تمہارے لئے اپنے علاوہ کسی کو خدا نہیں جانتا، اور صرف اس وقت جب ڈوبنے لگا ،تب اس نے کہا،

(آمَنتُ اُنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا الَّذِی آمَنَت بِهِ بَنُو اِسرائیلَ) (۴)

میں ایمان لایا اس خدا پر جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور اس سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ مجبوری میں ایمان لانا قابل قبول نہیں ہے (۵) اگر چہ اس کو ایمان کا نام دیا جائے۔

پس ایمان کا دار و مدار قلبی رجحان اور اختیار پر ہے، علم وآگاہی کے برخلاف کہ جو بے اختیار بھی حاصل ہو جاتا ہے، اس بناء پر ایمان ایک قلبی اور اختیاری عمل تصور کیا جا سکتا ہے، یعنی عمل کے مفہوم کو وسعت دے کر ایمان کو بھی عمل ہی کے مقولے میں شمار کیا جا سکتا ہے، لیکن لفظ ،،کفر،، کبھی عدم ایمان کے عنوان سے تعبیر ہوتا ہے اور ایمان کا نہ ہونا، چاہے شک اور جہل بسیط کی وجہ سے ہو، یا جہل مرکب کے سبب، مخالف رجحان کی وجہ سے ہو، یا عمداً انکار اور دشمنی

کی وجہ سے، بہر حال کفر کہا جائے گا، اور کبھی صرف آخری قسم یعنی (انکار خدا) اور دشمنی سے مخصوص ہوجاتا ہے کہ جو ایک وجودی امر ہے اور ایمان کی ضد شمار کیا جاتا ہے۔

....

۱۔نمل ۱٤،

۲۔اسراء ۱۰۲،

۳۔قصص ۳۸،

٤۔یونس ۹۰،

٥۔درس نمبر ۹ نو کا، مطالعہ کریں

ایمان اور کفر کی حد (نصاب)

قرآنی آیات کریمہ اور روایات سے جو مطلب نکلتا ہے اس کی روشنی میں کم سے کم ایمان جو ابدی سعادت کے لئے درکار ہے وہ خدا کی وحدانیت اور اسکی اخروی جزا وسزا پر ایمان اور انبیاء علیہم السلام پر جو کچھ نازل ہوا اُس کی صحت پر ایمان لانا ہے اور پھر اس کا لازمہ یہ ہے کہ خداوند عالم کے احکام پر عمل کرنے کا اجمالی ارادہ ہے، اور کم سے کم کفر جو ابدی بدبختی کے لئے کافی ہے وہ توحید میں شک یا نبوت، قیامت، میں شک کرنا ہے یا ان چیزوں کا انکار کرنا جن کے بارے میں جانتا ہو کہ یہ انبیاء (ع) پر نازل ہوئی ہیں۔

اور کفر کا بدترین مرتبہ اور آخری حد از روئے دشمنی تمام مذکورہ حقائق کا انکار کر دینا باوجودیکہ اس کی صحت کا علم رکھتا ہو اور دین حق سے جنگ وجدال کرنا ہے۔

اسی طرح شرک (توحید کا انکار) بھی کفر کے مصادیق میں ایک مصداق ہے، اور نفاق جو کفر باطنی کا نام ہے جس میں ہمیشہ دھوکا بازی پائی جاتی ہے اور اسلام کا اظہار کیا جاتا ہے، اور منافقین (نقاب پوش کافر) کا انجام سارے کفار سے برا ہوگا جیسا خود قرآن کریم کا ارشاد ہے، (اِنَّ المُنافِقِینَ فِی الدَّرکِ الاَسفَلِ مِنَ النَّارِ)(۱) ترجمہ: اس میں تو شک ہی نہیں کہ منافقین جہنّم کے سب سے نیچے طبقے میں ہونگے۔

ایک خاص نکتہ جس کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسلام اور کفر فقہی مسائل جیسے طہارت، حلیت ذبیحہ کا حلال ہونا نکاح کا جائز ہونا، میراث وارث ہونا یا نہ ہونا ایمان کے ملازم ہے، لیکن یہ ایمان اس ایمان اور کفر سے جو اصول دین میں موضوع بحث واقع ہوتے ہیں کوئی نسبت اور ملازمت نہیں رکھتے اس لئے کہ ممکن ہے کہ کوئی شخص شھادتین پڑھے (خود پیغمبر کی گواہی دے)

....

۱۔نساء ۱۴۵،

اور فقہی مسائل اس کے لئے ثابت ہوں درآن حالیکہ قلبی طور سے اس کے مضامین اور لوازم توحید اور نبوت پر ایمان نہ رکھتا ہو۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر کوئی انسان اصول دین کو پہنچاننے پر قادر نہ ہو اور بعنوان مثال وہ دیوانہ اور بے عقل ہو یا سماج کے ماحول کی وجہ سے دین حق کو نہ پہچان سکے تو وہ اپنی کوتاہی کے لحاظ سے معذور مانا جائے گا، لیکن اگر کوئی شخص تمام امکانات اور شناخت کی تمام سہولتوں کے باوجود کوتاہی کرے اور شک کی حالت میں باقی رہ جائے یا بغیر کسی دلیل کے اصول اور ضروریات دین کا انکار کر دے تو ایسا شخص معذور نہیں سمجھا جائے گا (اس کا عذر قبول نہ ہوگا) اور ابدی عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔

ابدی خوشبختی یا بد بختی میں ایمان اور کفر کا دخل

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ انسان کا حقیقی کمال تقرب الٰہی کے زیر سایہ متحقق ہوتا ہے، اس کے برخلاف انسان کی بدبختی خدا سے دوری کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے، لہذا، خداوند عالم پر ایمان اور اس کی تکوینی وتشریعی ربوبیت پر ایمان رکھنا کہ جس کا لازمہ قیامت اور نبوت پر عقیدہ رکھنا ہے، انسان کے حقیقی کمال کا شجر جانا جا سکتا ہے کہ جس کے شاخ و برگ خدا کے پسندیدہ اعمال ہیں اور ابدی سعادت اس کا پھل ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا، پس اگر کوئی انسان اپنے دل میں ایمان کے بیج کو نہ بوئے اور اس بابرکت پودے کو نہ لگائے اور اس کی پرورش نہ کرے، بلکہ اس کے بجائے کفر اور گناہ کے زہریلے بیج کو اپنے دل کی کھیتی میں چھڑک دے تو گویا اس نے خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کو ضائع کر دیا اور اس نے ایک ایسے درخت کو پروان چڑھایا جس کا پھل (زقّوم) دوزخی پھل ہوگا، ایسا شخص ہرگز ابدی سعا

دت سے ہمکنار نہیں ہوسکتا، اوراس کے نیک اعمال کا اثر اس دنیا سے آگے نہیں جا سکتا، اور اس کا راز یہ ہے کہ انسان کا ہر اختیاری فعل اس کی روح کو مقصد اور ہدف تک پہنچنے کے لئے ایک فاعل کا لحاظ کرنا ضروری ہے اور وہ شخص جو عالم ابدی اور تقرب الٰہی پر اعتقاد نہیں رکھتا، وہ کیسے اپنے لئے ہدف اور مقصد معین کرسکتا ہے اور اپنی رفتار کو یکسوئی عطا کرسکتا ہے زیادہ سے زیادہ جو چیز کافروں کے نیک اعمال کے لئے معین کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے عذاب میں کچھ کمی کردی جائے گی کیونکہ ایسے کام خود پرستی اور دشمنی کی روح کو ضعیف و کمزور بنا دیتے ہیں۔

قرآنی دلیلیں

قرآن کریم نے ایک طرف انسان کی ابدی خوشبختی کے لئے ایمان کو بنیادی حیثیت دی ہے اور دسیوں آیتوں میں عمل صالح کو ایمان کے ساتھ ذکر کرنے کے علاوہ بعض آیتوں میں ایمان کو اخروی سعادت کے سلسلہ میں، عمل خیر میں موثر ہونے کے اعتبار سے شرط کی حیثیت سے جانا ہے جیسا کہ ارشاد ہورہا ہے

(وَ مَن یعَمَل مِنَ الصّا لِحَا تِ مِن ذَ کَرٍ اَو اُنثیٰ وَھُوَ مُؤ مِن فَاُ ولِئکَ یَدخُلُون الجَنَّۃ) (۱)

مرد اور عورت میں جو بھی نیک عمل انجام دے اور ایمان بھی رکھے وہ جنت میں وارد ہوگا۔

دوسری طرف سے کافروں کے لئے دوزخ اور جہنم کے عذاب کو معین کیا ہے اور ان کے اعمال کو تباہ و برباد اور بے نتیجہ جانا ہے اور ایک مقام پر ان لوگوں کو ایسی راکھ سے تشبیہ دی ہے جس

کوتند و تیز ہوا منتشر کر دیتی ہے اور اس کا کچھ اثر باقی نہیں رہتا۔

(مَثَلُ الَّذِینَ کَفَرُوا بِرَبِّہِم اَعمَالُھُم کَرَمَادٍ اُشتَدَّت بِہِ الرِیحُ فِ یَومٍ عَاصِفٍ لَا یَقدِرُونَ مِمَّا کَسَبُوا عَلٰی شَیٍٔ ذٰلِکَ ھُوَ الضَّلاَلُ البَعِیدُ)(۲)

کافروں کے اعمال کی مثال اس راکھ کے مانند ہے کہ جس پر ایک طوفانی روز کی تند ہوا کا جھوکا پڑے اور اسے اڑا لے جائے، کہ وہ اپنے حاصل کئے ہوئے پر بھی کوئی اختیار نہ رکھیں گے اور یہ بہت دور تک پھیلی ہوئی گمراہی ہے۔

....

۱۔نساء ۱۲٤،اورنحل ۹۷،اسراء۱۹،طٰہٰ ۱۱۲،انبیاء ۹٤،غافر ٤۰ کی طرف رجوع کریں۔

۲۔ابراہیم ۱۸

اور دوسری جگہ ارشاد فرمارہا ہے کہ کافروں کے اعمال کو غبار کی طرح ہوا میں اڑا گے:

(وَ قَدِمنَا اِلٰی ما عَمِلُوا مِن عَمَلٍ فَجَعلنا ہُ ھَباءً مَنثُوراً)(۱)

(کافروں نے جو بھی عمل انجام دیا) ہم نے آکر ہر اس عمل کو فضا میں غبار کی طرح منشر کر دیا

اور ایک دوسری آیت میں کافروں کے اعمال کو اس سراب سے تشبیہ دی ہے کہ جس کو دیکھ کر پیاسا انسان اس کی طرف دوڑتا ہے لیکن جیسے ہی وہاں پہنچتا ہے وہ پانی نہیں ہوتا:

(وَالَّذِینَ کَفَرُوا أَعمَالُھُم کَسَرابٍ بِقِیعَۃٍ یَحسَبُہُ الظّمانُ ماءً حَتّٰی اِذَا جاءَہُ لَم یَجِدہُ شَیئًا وَّوَجَدَ اللّٰہَ عِندَہُ فَوَفَّاہُ حِسابَہُ وَاللّٰہُ سَرِیعُ الحِسَابِ)(۲)

اور جن لوگوں نے کفر اختیار کر لیا ان کے اعمال اس ریت کے مانند ہیں جو چٹیل میدان میں ہو اور پیاسا اسے دیکھ کر پانی تصور کرے اور جب اس کے قریب پہنچے تو کچھ نہ پائے بلکہ اس

خدا کو پائے جو اس کا پورا حساب کر دے کہ اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔

(اَو کَظُلُمَاتٍ فِی بَحرٍ لُجِّیٍّ یَغشَاہُ مَوجٌ مِن فَوقِہِ مَوجٌ مِن فَوقِہِ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعضُھَا فَوقَ بَعضٍ اِذَا أَخرَجَ یَدَہُ لَم یَکَد یَرَاھَا وَمَن لَم یَجعَلِ اللّٰہُ لَہُ نُوراً فَمَا لَہُ مِن نُورٍ)(۳)

یا ان کے اعمال کی مثال اس گہرے دریا کی تاریکیوں کی سی ہے کہ جس کو لہروں نے ڈھانپ رکھا ہو اور اس کے اُوپر تہ بہ تہ بادل بھی ہوں کہ جب وہ اپنے ہاتھ کو نکالے تو تاریکی کی بنا پر کچھ نظر نہ آئے اور جن کے لئے خدا نور نہ قرار دے اس کے لئے کوئی نور نہیں (کنایہ ہے اس بات سے کہ کافروں کی حرکت تاریکی میں ہے اور وہ کہیں نہیں پہنچ سکتے) اور دوسری آیت میں خدا کا ارشاد ہے کہ دنیا پرستوں کے عمل کے نتیجے، اسی دنیا میں ان کو دے دے جائیں گے اور آخرت میں ان کے لئے کوئی حق نہ ہوگا

....

۱۔فرقان ۲۳،

۲۔نور ۳۹، ۳۔نور ۴۰

جیسے یہ آیت شریفہ۔

(مَن کَانَ یُرِیدُ الحَیَاۃَ الدُّنیَا وَزِینَتَھَا نُوَفِّ اِلَیھِم أَعمَالَھُم فِیھَا وَھُم فِیھَا لَا یُبخَسُونَ ٭ أُولٰئِکَ الَّذِینَ لَیسَ لَھُم فِی الاٰخِرَۃِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِیھَا وَبَاطِلٌ مَا کَانُوا یَعمَلُونَ)(۱)

جو شخص زندگانی دنیا اور اس کی زینت کے طلب ہیں ہم اسکے اعمال کا پورا پورا حساب یہیں کر دیتے ہیں اور کسی طرح کی کمی نہیں کرتے اور یہی لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں جہنم کے

علاوہ کچھ نہیں ہے اور ان کے سارے کاروبار برباد ہو گئے ہیں اور سارے اعمال باطل و بے اثر ہو گئے ہیں۔

....

۱۔ھود ۱۵،۱٦،

سوالات:

۱۔ایمان اور کفر کے متعلق خوارج اور مرجئہ کا نظریہ تحریر کرتے ہوئے ان کے مقابل میں قول حق کو بیان کریں؟

۲۔ایمان اور کفر کی حقیقت اور علم وجہل سے اس کے رابطہ کو واضح کیجئے؟

۳۔ایمان اور کفر کے نصاب کو بیان کریں؟

٤۔شرک ونفاق کی کفر سے کیا وابستگی ہے؟

٥۔ابدی سعادت وشقاوت میں ایمان وکفر کی تاثیر اور اس کے راز کو بیان کریں؟

٦۔فقہی اسلام وکفر کی کلامی ایمان وکفر سے کیا نسبت ہے؟

۷۔اس تاثیر پر قرآنی دلیلیں پیش کریں؟

پچپنواں درس

ایمان اور عمل کا آپس میں رابطہ

مقدمہ:

ایمان کا عمل سے رابطہ

عمل کا ایمان سے رابطہ

نتیجہ

مقدمہ:

ہمیں یہ بات معلوم ہوچکی ہے کہ ابدی سعادت و شقاوت کا اصل سبب ایمان اور کفر ہے، اور مستحکم ایمان ہمیشہ کی خوشبختی کی ضمانت ہے ہر چند ممکن ہے کہ گناہوں کا ارتکاب محدود عذاب کا باعث بن جائے ، اور دوسری طرف مستحکم کفر ہمیشہ کی بدبختی کا سبب ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کوئی بھی نیک کام آخرت کی سعادت کا سبب نہیں ہوسکتا، اسی کے ضمن میں اشارہ کرتے چلیں ، کہ ایمان اور کفر میں شدت اور ضعف کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور ممکن ہے کہ

بڑے بڑے گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے ایمان سے ہاتھ دھونا پڑے، اور اسی طرح نیک کام انجام دینا، کفر کی بنیادوں کو کمزور کر دیتا ہے، اور ممکن ہے کہ ایمان کے لئے راہ ہموار کر دے اس مقام پر ایمان اور عمل کے درمیان رابطے کے سوال کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ہم اس درس میں اس سوال کے جواب کو بیان کریں گے۔

ایمان کا عمل سے رابطہ

گذشتہ بیانات سے واضح ہو چکا ہے کہ ایمان ایک قلبی اور نفسانی حالت کا نام ہے کہ جو علم و دانش کی وجہ سے مزید تقویت پاتے ہیں، اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ با ایمان انسان اجمالی طور سے ان چیزوں کے لوازم پر جن پر ایمان رکھتا ہے عمل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے

اس بنا پر وہ شخص جو کسی حقیقت سے آشنا ہے، لیکن اس کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ کبھی بھی اس کے لوازمات پر عمل نہیں کریگا وہ ہرگز ایمان نہیں رکھ سکتا، یہاں تک کہ اگر عمل کرنے یا نہ کرنے کے سلسلے میں شک میں مبتلا ہو جائے تب بھی جانے کہ وہ ایمان نہیں لایا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے

(قَالَتِ الَا عرَابُ آمَنَّا قُل لَم تُومِنُوا وَلَکِن قُولُوا اَسلَمنَا وَلَمَّا یَدخُلِ الاِیمَانُ فِ قُلُوبِکُم)(۱)

یہ بدو عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو (اے رسول) آپ کہد یجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ اسلام لے آئے ہیں ابھی ایمان تمھارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہو

اہے، لیکن حقیقی ایمان کے بھی کچھ مراتب ہیں اور ایسا نہیں ہے ایمان کے ہر مرتبے کا لازمہ یہ ہو کہ اس سے مربوط تمام وظائف انجام دئے جائیں اور ممکن ہے کہ شہوانی یا غضبی دباؤ کمزور ایمان رکھنے والے انسان کو گناہ کے ارتکاب پر مجبور کر دے لیکن اس طرح نہیں کہ وہ ہمیشہ گناہوں میں ملوث رہے اور تمام لوازمات کی مخالفت کرتا رہے البتہ جتنا زیادہ ایمان میں استحکام پایا جائیگا اور جتنا زیادہ کامل ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کے مناسب اعمال کو انجام دینے میں اثر رکھے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان ذاتی اور فطری طور سے اپنے لوازمات اور متعلقات پر عمل کرنے کا تقاضا کرتا ہے اور یہی تاثیر کی مقدار کا تقاضا بھی اس کی شدت وضعف سے وابستہ ہے اور بالا خر انسان کا فیصلہ اور ارادہ ہی ہے جو کسی کام کو انجام دینے یا ترک کرنے کو متعین کرتا ہے۔

....

١۔حجرات ١٤،

عمل کا ایمان سے رابطہ

انسان کا اختیاری عمل یا تو مناسب اور ایمان کے ساتھ ہوگا یا غیر مناسب اور ایمان کے خلاف ہوگا پہلی صورت میں ایمان کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور دل کی نورانیت میں اضافہ ہوتا ہے، اور دوسری صورت میں ایمان کمزور اور انسان کا قلب تاریک ہوجاتا ہے اس بنا پر وہ اعمال

صالحہ جوایک مومن کے ذریعہ انجام پاتے ہیں باوجودیکہ یہ اس کے ایمان سے کسب فیض کرتے ہیں مگراس کی قوت ایمان اور ثابت قدمی میں اضافہ کرتے ہیں اور بہت سارے نیک کام کے لئے راہ ہموار کرتے

ہیں اوراس آیہ شریفہ کے ذریعہ تکامل ایمان میں عمل صالح کی تاثیر کوظاہر کیا جاسکتا ہے۔

(اِلَيهِ يَصعَدُ الكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ العَمَلُ الصّالِحُ يَرفَعُهُ)(۱)

پاکیزہ کلمات اوراچھے اعتقادات اللہ کی طرف بلند ہوتے ہیں اورعمل صالح انھیں بلند کرتا ہے(۲)اوراسی طرح متعدد آیتوں میں نیک اعمال انجام دینے والوں کے ایمان میں زیادتی اورنور وہدایت میں اضافہ کو بیان کیا گیا ہے(۳) دوسری طرف اگر مقتضائے ایمان کے ساتھ ساتھ مخالف سبب اورمحرک وجود میں آجائے ،اورغیر مناسب عمل انجام دینے کا سبب بن جائے ،اوراس شخص کا ایمان اتنا مستحکم نہ ہو جو اسے غیر شائستہ عمل سے روک سکے،تو اس کا ایمان کمزوری کی طرف مائل ہو جائیگا،اور گناہ کے دوبارہ انجام دینے کا خدشہ پیدا ہو جائیگا اوراگر یہ حالت اسی طرح باقی رہ گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا،کہ اصل ایمان کو زوال کی طرف جانے کا خطرہ پیدا ہوجائے گا اور(معاذ اللہ)اس کو کفر اورنفاق میں تبدیل کر دیگا،قرآن مجید، ان افراد کے بارے میں جونفاق کا شکار ہو گئے ہیں فرماتا ہے

....

۱۔فاطر/۱۰

۲۔اس بنا پر کہ ضمیر فاعلی، العمل الصالح کی طرف اورضمیر مفعولی الکلم الطیب کی طرف پلٹتی

ہے۔

٣۔آل عمران ١٧٣،انفال ٢،توبہ ١٢٤،کہف ١٣،مریم ٧٦،احزاب ٢٢،محمد ١٧،مدثر ٣١،

(فَاعقَبَہُم نِفَا قًا فِ قُلُو بِہِم اِلٰی یَومِ یَلقَونَہُ بِمَا اَخلَفُوا اللّٰہَ مَا وَعَدُوہُ وَ بِمَا کَانُویَکذِبُونَ)(١)

چونکہ ان لوگوں نے خدا سے وعدہ خلافی کی اور جھوٹ بولے لہٰذا خدا نے ان کے دلوں میں نفاق کو داخل کر دیا ہے اس دن تک جس دن یہ لوگ خدا سے ملاقات کریں گے اور یہ ارشاد ہو رہا ہے

(ثُمَّ کَانَ عَاقِبَۃَ الَّذِینَ اَسَاءُ واالسُّوائٰی اَن کَذَّبُوابِاٰیٰتِ اللّٰہِ وکَانُوبِہَایَستَہزِؤُنَ)(٢)اور اس وقت ان لوگوں کا انجام جو بدترین گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے یہ ہوا کہ انھوں نے خدا کی آیات کو جھٹلایا اور اسکا مذاق اڑایا۔اوراسی طرح دوسری متعدد آیتوں میں گنہگاروں کے کفر اور تاریکی قلب اور سنگ دلی میں اضافہ کا ذکر کیا ہے(٣)

نتیجہ

ایمان اور عمل کے آپس کے رابطے کو دیکھتے ہوئے اور انسان کی سعادت میں ان دونوں کے کردار کی طرف توجہ کرتے ہوئے انسان کی سعادتمندانہ حیات کو ایک درخت سے تشبیہ دی جاسکتی ہے(٤) اس طرح کہ خداوند عالم کی وحدانیت اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں اور اسکے پیغامات اور روز قیامت پر ایمان رکھنا، گویا اس درخت کی جڑ کو تشکیل دیتا ہے اور

ایمان کے لوازمات پر عمل کرنے کا فیصلہ اس کے تنہ کی حیثیت رکھتا ہے، کہ جو بغیر کسی واسطہ کے جڑ سے اگتا ہے اور وہ شائستہ اور مناسب اعمال کہ جو ریشہ ایمان سے مترشح ہوتے ہیں اس کی شاخ و برگ کی طرح ہیں، اور ابدی سعادت اس درخت کا پھل ہے اگر جڑ کا وجود نہ ہو، تو تنہ اور شاخ و برگ وجود میں نہیں آسکتے، اور میوہ بھی نہیں

....

١۔توبہ ٧٧،

٢۔روم ١٠،

٣۔ بقرہ ١٠، آل عمران ٩٠، نساء ١٣٧، مائدہ ٦٨، توبہ ٣٧، اسراء ٦٠، ٨٢، صف ٥ نوح ٢٤،

٤۔ر۔ک: ابراہیم ٢٤۔ ٢٧،

آسکتا، لیکن ہرگز ایسا نہیں ہے جڑ کے وجود سے مناسب شاخ و برگ اور بہترین پھلوں کا ہونا لازم ہے بلکہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے، درخت فضا اور زمین کی ناسازگاری اور مختلف آفتوں کی وجہ سے مرجھا جاتے ہیں اور اس میں مناسب شاخ و برگ نہیں اُگ پاتے اسی صورت میں وہ درخت نہ صرف یہ کہ خاطر خواہ پھل نہیں دیتا بلکہ خشک ہوجاتا ہے اور بہت ممکن ہے اس درخت کی شاخ یا تنہ یا اسکی جڑوں میں قلم (پیوند) لگائی جاتی ہے ان سے دوسرے آثار ظاہر ہوں اور ممکن ہے اتفاقاً وہ پیوند (قلم) کسی دوسرے درخت میں تبدیل ہوجائے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے ایمان کفر میں تبدیل ہوجائے۔

حصل کلام یہ ہے کہ ایمان کو ایسے امور کے ذریعہ یاد کیا گیا ہے جو سعادتِ انسانی کا اصلی سبب ہے لیکن اس سبب کا اثر اعمال صالحہ کے ذریعہ لازم غذاؤں کے مکمل جذب ہوجانے پر مشروط (موقوف) ہے اور گناہوں سے پرہیز کے ذریعہ اس کے نقصان دہ امور کو دور کرنے اور آفتوں کو ختم کرنے پر موقوف ہے اور واجبات کا ترک کرنا اور محرمات کا ارتکاب کرنا ایمان کی جڑوں کو کمزور بناتا ہے اور کبھی کبھی ایمان کے درخت کو خشک کردیتا ہے جس طرح غلط عقائد کے پیوند، اس کی حقیقت میں تبدیلی کا باعث بن جاتے ہیں۔

سوالات

۱۔نیک اعمال میں ایمان کا کیا اثر ہے؟ وضاحت کیجئے؟

۲۔نیک اور برے اعمال کا ایمان کی قوت اور کمزوری میں کیا اثر ہے شرح کیجئے؟

۳۔ایمان اور عمل کے آپس کے روابط اور ان دونوں کا انسان کی سعادت سے کیا رابطہ ہے بیان کیجئے؟

چھپنواں درس

مقدمہ:

انسان کا حقیقی کمال

یہ بحث مشتمل ہے ذیل کی گفتگو پر

عقلی بیان

خواہش اور نیت کا کردار

مقدمہ:

بعض ایسے افراد جو اسلامی ثقافت سے کافی حد تک مانوس نہیں ہیں اور آ گاہی نہیں رکھتے، اور اپنے ظاہری اور سطحی معیار کی بنیاد پر انسانی رفتار و اعمال کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتے ہیں، نیز محرک و فاعل کی نیت کی اہمیت کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے اور بہ تعبیر دیگر حُسنِ فعلی کے مقا

بلہ میں حُسنِ فعلیکو اہمیت نہیں دیتے یا دوسروں کی دنیاوی زندگی میں آسائش وآرام کے حوالے سے موثر ہونے کو معیار قدر و قیمت سمجھتے ہیں ایسے لوگ بہت سارے اسلامی عقائد اور معارف کی تحقیق اوراس کو سمجھنے میں گمراہی سے دو چار ہوجاتے ہیں، یا اس حقیقت کو کو سمجھنے اور بیان کرنے سے قاصر رہتے ہیں، من جملہ ایمان کا اثر اوراس کا اعمال صالحہ سے رابطہ اور کفر وشرک کا تباہ کن کرداراور بعض چھوٹے اورکم مدت اعمال کو بڑے اورطولانی مدت اعمال پر فوقیت و برتری کے سلسلہ میں کج فکری کا شکار ہوجاتے ہیں، مثلاً ایسا تصور کرتے ہیں وہ بڑے ایجادات کے مالک افراد جنھوں نے دوسروں کے لئے آسائش وآرام کے اسباب فر اہم کئے ہیں یا وہ حریت پسند افراد جنھوں نے اپنی ملت کی آزادی کی راہ میں جنگ وجدال کا سامنا کیا ہے ان کو آخرت میں بلند و بالا مقام ملنا چاہیے ہر چند کہ وہ خدااور قیامت پر ایمان نہ رکھتے رہے ہوں ،اور کبھی کبھی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اسی دنیا میں انسانی قدر و قیمت اور زحمت کرنے والوں اورمحنت کشوں کی آخری کامیابی پر ایمان رکھنے ہی کو انسانی سعا دت کے لئے ایمان کی ضرورت بتاتے ہیں، اور حد تو یہ ہے خدا کے مفہوم کو بھی ایک قیمتی مفہوم اور اخلاقی موازین کے مطابق رقم کرتے ہیں۔

اگر چہ گذشتہ درسوں میں جو بیان ہوا اس کی روشنی میں ایسی گفتگو اور ایسے خیالات کی خطا اور کمزوری کو بھی پہنچانا جا سکتا ہے، لیکن اس موجودہ زمانہ میں ایسے افکار کی نشر واشاعت اور آئندہ کی نسل کے لئے جو خطرہ پیدا ہو گیا ہے اس کو بچانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے با رے میں تھوڑی سی وضاحت کردی جائے۔

البتہ ایسے مسائل پر ایک جامع اور مفید گفتگو کرنے کے لئے وسیع زمانہ اور سازگار حالات درکار ہیں۔

اس لئے اس مقام پر ان مسائل کے عقیدتی پہلو کو دیکھتے ہوئے اور اس کتاب کی مناسبت کا لحاظ کرتے ہوئے صرف بنیادی ترین مسائل کو بیان کرنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

انسان کا حقیقی کمال

اگر ہم سیب کے درخت کو ایک بغیر پھل کے درخت کے ساتھ تصور کریں اور دونوں کا مقابلہ کریں، تو سیب کے درخت کو بے پھل درخت سے زیادہ قیمتی شمار کریں گے، اور یہ فیصلہ صرف اس لئے نہیں ہے کہ انسان پھل دار درخت سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ اس لئے کہ پھل دار درخت کا وجود بے پھل درخت سے زیادہ کامل ہے اور اس کے آثار بھی اس سے زیادہ ہیں اس لئے اس کی قدر و منزلت بھی زیادہ ہوگی لیکن اگر یہی سیب کا درخت اگر کسی آفت کا شکار ہو جائے یا اس کو کوئی مرض لاحق ہو جائے اور اس کی نشو و نما رک جائے تو یہ اپنی قدر و قیمت کھو دے گا، اور ممکن ہے کہ اس کی گندگی اور دوسروں کے لئے نقصان کا سبب بن جائے۔

انسان کا بھی دوسرے تمام جانوروں کے مقابلے میں یہی حکم ہے اور اس صورت میں جب وہ اپنے لائق اور مناسب کمال تک پہنچ جائے اور اس کے وجود سے اسکی فطرت کے مطابق آثار ظاہر ہونے لگیں، تو گویا وہ انسان جانوروں سے زیادہ قدر و قیمت کا حامل ہے لیکن اگر آفت و گمراہی کا شکار ہو جائے تو ممکن ہے کہ دورے سارے جانوروں سے بھی پست تر اور نقصان

دہ ہو جائے جیسا کہ قرآن مجید میں ذکر ہوا ہے کہ بعض انسان سارے حیوانات (۱) سے بھی برُے ہیں اور چوپایوں (۲) سے زیادہ گمراہ ہیں دوسری طرف سے اگر کسی نے سیب کے درخت کوصرف پھول کھلنے اور غنچہ لگنے تک ہی دیکھا ہوتو وہ گمان کرے گا، کہ اس کی ترقی اور پھولنے پھلنے کی آخری حد یہی ہے اوراب اس سے زیادہ کمال اس میں نہیں پایا جا تا اسی طرح جنھوں نے صرف انسان سے متوسط کمالات کا مشاہدہ کیا ہے وہ انسان کے آخری کمال اور اس کی حقیقت کونہیں درک کر سکتے اورصرف وہ ہی لوگ انسان کی واقعی قدرو قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں، کہ جواس کے کمال کی آخری منزل کو پہچانتے ہیں لیکن انسان کا آخری کمال اس کا کمال مادی نہیں ہے اس لئے کہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ انسان کی انسانیت کا تعلق ملکوتی روح سے ہے اورانسانی تکامل بھی درحقیقت وہی روح کا تکامل ہے جواپنی اختیاری کارکردگی سے حاصل ہوتا ہے چاہے وہ قلبی اوراندرونی کارکردگی ہو یا، بیرونی اوراعضاوجوارح کی مدد سے حاصل ہونے والی کارکردگی اورایسے کمال کا اندازہ کسی حسی تجربات اور پیمانے کے ذریعہ نہیں لگایا جا سکتا لہذا اس تک پہنچنے کے لئے آزمایشی وسائل کا سہارانہیں لیا جا سکتا بس جوخود کمال تک نہیں پہنچ سکتا اوراس کوعلم حضوری اورقلبی مشاہدہ کے ذریعہ نہیں پا سکتا اس کو چاہیے کہ اس کمال تک پہنچنے کیلئے عقلی دلیل یاوحی پروردگاراورآسمانی کتابوں کا سہارا لے۔

....

۱۔انفال ۲۲،

۲۔اعراف ۱۷۹،

لیکن وحی خداوند عالم اور قرآنی ارشادات اور اہلبیت عصمت وطہارت علیہم السّلام کے نورانی بیانات کے لحاظ سے کسی بھی شک وتردید کا مقام نہیں ہے کہ انسان کا آخری کمال اسی کے وجود کا ایک مرتبہ ومقام ہے کہ جس کی طرف تقرب الٰہی کے عنوان سے اشارہ کیا گیا ہے، اور اس کمال کے آثار رضائے پروردگار اور ابدی نعمتیں ہیں جو آخرت میں ظاہر ہونگی، اور اس تک پہنچنے کا کلی راستہ خدا پرستی اور تقویٰ ہے کہ جو تمام انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام حالات میں شامل ہے، لیکن عقلی نقطہ نظر سے اس موضوع کے لئے پیچیدہ ترین دلیلوں کو پیش کیا جاسکتا ہے کہ جس کے لئے کافی حد تک فلسفی مقدمہ اور تمہید کی ضرورت ہے، لیکن ہم یہاں بہت آسان گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

عقلی بیان

انسان فطری طور سے لامحدود کمالات کا خواہاں ہے علم اور قدرت ان کمالات کو ظاہر کرنے کا بہترین وسیلہ ہیں، اور ایسے کمال تک پہنچنا ہی لامحدود لذتوں اور ہمیشہ کی سعادت کا سبب ہے اور اس وقت یہ کمال انسان کے لئے میسر ہوتا ہے کہ جب انسان علم وقدرت کے لامحدود سر چشمہ اور کمالِ مطلقِ حقیقی یعنی خداوند عالم سے وابستہ ہوجائے، اور اسی رابطہ کو قرب خداوندی کا نام دیا جاتا ہے(۱) بس انسان کا حقیقی کمال جو اس کا مقصد خلقت ہے خداوند عالم کے تقرب اور اس سے رابطہ کے زیر سایہ حاصل ہوتا ہے، اور وہ انسان جو اس کمال کے سب سے کم اور پست مرتبے کو بھی اپنے پاس نہیں رکھتا، یعنی جو شخص ضعیف ترین ایمان کا حامل بھی

نہیں ہے وہ اس درخت کے مانند ہے جو ابھی پھل دینے نہیں لگا اگر ایسا درخت کسی آفت سماوی یا روگ ومرض کی وجہ سے پھل کی صلاحیت کوکھودے تو اُس کی منزلت بے پھل درخت سے بھی زیادہ گرجائے گی ،اس بناء پر کمال اور انسانی سعادت میں ایمان کے کردار کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ انسان کے روح کی اصل خصوصیات

....

۱۔زیادہ تفصیل معلوم کرنے کے لئے مئولف کی کتاب (خود شناسی برای خودسازی) کی طرف رجوع کریں۔

خداوند عالم سے علم وآ گاہی اور اختیار کے ساتھ رابطہ قائم کرنا ہے،اور بغیر اس رابطے کے مناسب کمال اوراس کے آثار سے محروم ہوجائے گا، بلکہ یوں کہا جائے کہ انسان کی انسانیت کا وجود نہیں ہوسکتا،اور اگر انسان بُرے اختیارات کے ذریعہ ایسی بلند صلاحیتوں کو برباد کردے،تو گویا اس نے اپنے اوپر بدترین ظلم کیا ہے اور وہ ابدی سزا کا مستحق ہوگا،اورقرآن مجید ایسے لوگوں کے بارے میں فرماتا ہے،

اِنَّ شَرَّ الدَّ وَابِّ عِندَ اللَّہِ الَّذِینَ کَفَرُ وا فَہُم لَا یُؤمِنُو نَ (۱) بے شک خدا کے نزدیک جانوروں میں کفار سب سے بدتر ہیں، پس وہ ایمان نہیں لاتے۔

خلاصہ یہ کہ ایمان اور کفر میں سے ہر ایک انسان کے لئے سعادت وکمال کی طرف ترقی کی حرکت یا عذاب وبدبختی کی طرف تنزلی کی حرکت کومعین کرتا ہے،اوران میں سے جو بعد میں ہوگا وہی آخری اور عاقبت ساز اثر رکھے گا،(آخرت کی اچھائی یا بُرائی اسی کے قبضے میں

ہے)۔

خواہش (محرک) اور نیت کا کردار

مذکورہ اصل کو دیکھتے ہوئے یہ بات واضح ہوجاتی ہے، کہ انسان کے اختیاری کاموں کی حقیقی قدرو قیمت تب معلوم ہوگی، جب ہم یہ دیکھیں کہ وہ انسان کو حقیقی کمال یعنی قرب پروردگار تک پہنچانے میں کتنا اثر رکھتی ہے، اگر چہ بہت سے اعمال کسی نہ کسی طرح چاہے بعض امور کا سہارا لے کر ہی صحیح دوسروں کے تکامل اور ترقی کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں تو وہ اچھائی اور فضیلت سے متصف کئے جاتے ہیں، لیکن فاعل کی ابدی سعادت میں ان کی تاثیر اس اثر کے اوپر موقوف ہے جو روح کے تکامل اور میں اعمال نے اثر چھوڑا تھا، دوسری جانب سے اگر دیکھا جائے تو خارج افعال کا فاعل کی روح سے جو ارتباط ہے وہ ارادہ کے ذریعہ حصل ہوتا ہے کہ یہ کام اس کے بغیر واسطہ کے ہے، اور کام کا ارادہ مقصد اور نتیجہ کی محبت، اور شوق و رجحان کی بنا پر وجود میں آتا ہے اور اسی کا نام خواہش اور سبب

....

۱۔انفال ۵۵،

ہے جو روح کے اندر مقصد کی طرف بڑھنے کے لئے ایک حرکت پیدا کرتا ہے، اور کام کے

ارادہ کی شکل مجسم ہوکر ظاہر ہوتا ہے،بس ارادی کام کی قدر و قیمت خواہش (سبب) اور فاعل کی نیت کے تابع ہے،اور کام کے حسن کا بغیر فاعل کے حسن کے روح اور سعادت ابدی کے تکامل میں کوئی اثر نہیں ہے۔

اور یہی دلیل ہے کہ جو کام مادی اور دنیوی اسباب اور خواہشات کی بنا پر انجام پاتے ہیں وہ ابدی سعادت میں کوئی اثر نہیں رکھتے،اور اگر اجتماعی اور معاشرے کی سب سے بڑی خدمت بھی (ریا) دکھاوے یا خودنمائی کے لئے ہوتو فاعل کو اس کا ایک ذرہ فائدہ نہیں پہنچے گا(۱) بلکہ ممکن ہے اس کے لئے نقصان اور روحی انحطاط کا باعث بن جائے اس لئے قرآن کریم آخرت کی سعادت میں اعمال صالحہ کی تاثیر کو ایمان اور قصد قربت]اِرَادَہ وَجہُ اللہ وَابتِغَاءَ مَرضَاتِ اللہ[پر مشروط اور موقوف جانا ہے(۲)

حاصل کلام یہ ہے کہ نیک کام دوسروں کی خدمت کرنے میں منحصر نہیں ہے،دوسرا یہ کہ دوسروں کی خدمت کرنا بھی انفرادی عبادت کی طرح سعادت ابدی اور اخروی تکامل اور ترقی میں اس وقت موثر ہوگی کہ جب خدائی خواہشات اور آرزوؤں سے وابستہ ہو۔

....

۱۔بقرہ ۲۶٤،نساء ۳۸،۱٤۲،انفال ٤۷،موعون ٦،

۲۔نساء ۱۲٤،نحل ۹۷،اسراء ۱۹،طٰہ ۱۱۲،انبیاء ۹٤،غافر ٤۰،انعام ۵۲،کہف ۲۸،روم ۳۸،بقرہ ۲۰۷،۲٦۵،

سوالات

(۱) ہر شی کی حقیقی قدر و قیمت کس چیز میں ہے؟

(۲) انسان کے آخری کمال کو کیسے پہچانا جا سکتا ہے؟

(۳) ثابت کیجئے کہ انسان کا آخری کمال صرف ارتباط اور تقرب خدا کے زیر سایہ ہی حاصل ہوسکتا ہے؟

(٤) ثابت کیجئے کہ نیک کاموں کی تاثیر انسان کی ابدی سعادت میں الٰہی مقصد اور مراد پر موقوف ہے؟

ستاونواں درس

حبط وتکفیر

مقدمہ:

یہ بحث مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے

ایمان وکفر کا رابطہ

نیک وبد اعمال کا رابطہ

مقدمہ:

ایک اور مسئلہ جو ایمان وعمل صالح اور آخرت کی سعادت کے درمیان رابطے اور اس کے بر خلاف کفر وگناہ اور ابدی شقاوت کے درمیان رابطے کے سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا ایمان اور کفر کے ہر لمحات کا تعلق اس کے اخروی نتیجہ سے ہے؟ اسی طرح کیا ہر اچھے اور برے اعمال کا رابطہ اس کی جزا یا سزا سے یقینی وثابت نیز ناقابل تبدیل ہے؟ یا یہ کہ کسی نہ

کسی طرح تبدیلی ایجاد ہوسکتی ہے؟ مثلاً نیک اعمال کے ذریعہ گناہوں کی تلافی کی جاسکتی ہے یا برعکس یعنی نیک کام کے اثر کو گناہ کے ذریعہ ختم کیا جاسکتا ہے؟ کیا وہ شخص جس نے اپنی حیات کے نصف حصّے کو کفر وگناہ کی حالت میں گذارا اور باقی نصف زندگی کو ایمان اورا طاعت خدا میں بسر کیا ہے کچھ مدت تک عذاب میں گرفتار رہنے کے بعد اجر وثواب کا مستحق ہوسکتا ہے؟ یا ایسا نہیں ہے بلکہ دونوں کو جمع کر کے جبری صورت میں اس کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خوشبختی یا بدبختی کو معین کر دیا جائے گا؟ یا ایسا بھی نہیں ہے بلکہ کوئی اور راستہ نکالا جائے گا؟

یہ مسئلہ درحقیقت حبط وتکفیر(۱) کے مسئلہ کے جیسا ہے، کہ جو قدیم زمانے سے اشاعرہ اور معتزلہ فرقوں کے علماء کلام کے درمیان موضوع بحث وگفتگو رہا ہے، اور ہم اس درس میں شیعوں کے نظرئے کو خلاصہ کے طور پر بیان کریں گے۔

ایمان اور کفر کا رابطہ۔

گذشتہ درسوں میں ہم یہ جان چکے ہیں کہ بغیر اعتقادی اصولوں پر ایمان رکھے ہوئے کوئی عمل صالح ابدی خوشبختی کا ذریعہ نہیں بن سکتا، بلکہ جملہ بدل کر کہا جائے کہ کفر اچھے اور شائستہ امور کو بے اثر بنا دیتا ہے، یہاں پر اس بات کا اضافہ ضروری ہے کہ انسان کی زندگی کے آخری لمحات میں ایمان کا پایا جانا اس کے سابقہ کفر کے بُرے اثرات کو محو کر دیتا ہے، جس طرح روشن نور گذشتہ تاریکیوں کو برطرف کر دیتا ہے، اور اس کے برعکس، آخری وقت کا کفر، اس

کے گذشتہ ایمان کے اثر کوختم کر دیتا ہے،اور انسان کے نامۂ اعمال کو سیاہ اور عاقبت کو تباہ کر دیتا ہے، بالکل اُس آگ کے مانند جس کی ایک چنگاری پورے خرمن کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے، یا یہ کہ ایمان ایک روشن چراغ کی طرح ہے کہ جو دل ودماغ کے آشیانوں کو روشن اور تابناک کر دیتا ہے اور تاریکیوں و تیرگیوں کو دور کر دیتا ہے،اور کفر اُس چراغ کے بجھنے کے مانند ہے جو اپنے گل ہونے کے ساتھ ساتھ تمام اُجالوں کوختم کر کے اندھیرے کو جنم دیتا ہے اور جب تک انسان کا دل ودماغ اس مادی وتغیر نیز پیچ وخم سے بھری ہوئی دنیا سے وابستہ رہے گا، مسلسل روشنی وتاریکی ،نور وظلمت کی کمی اور زیادتی کے خطرے سے اس وقت تک دو چار رہے گا جب تک اس سرای فانی سے گذر نہ جائے ،اوراس کے اوپر ایمان اور کفر کے انتخاب کرنے کا راستہ بند نہ ہوجائے ،اور پھر چاہے جتنا آرزو کرے کہ ایک بار پھر اس دنیا میں آ کر اپنی

تاریکیوں کوختم کر لے،لیکن یہ تمنا اس کو کوئی فائدہ نہ پہچائے گی (۱)

....

۱۔حبط وتکفیر یہ قرآن مجید کی دو اصطلاحیں ہیں کہ جس میں سے پہلے کا مطلب یہ ہے کہ نیک کام کا بے اثر ہوجانا اور دوسرے کا مطلب یہ ہے کہ گناہوں کی تلافی ہوجانا۔

ایمان وکفر کے درمیان یہ اثر متقابل قرآن کی نگاہ میں ایک ثابت امر ہے جس میں کسی طرح

کے شک وتر دید کی گنجائش نہیں ہے،اور اس بیان پر قرآن کریم کی بہت سی آیتیں دلالت کرتی ہیں مثلاً سورۂ تغابن کی آیت نمبر (۹) وَمَن ےُ وِمن بِاللّٰہِ وَےَ عمَل صَالِحاً ےُ کَفِّر عَنہُ سَیِّاتِہِ ، جو بھی خدا پر ایمان لایا اور عمل صالح انجام دیا تو یہ اس کے برے کاموں کو محو کردیگا،اور سورۂ بقرہ کی آیت نمبر (۲۱۷) میں ارشاد ہورہا ہے کہ (وَمَن ےَرتَدِ دمِنکُم عَن دِینِہِ ےَمُت وَہُوَ کَافِرفَاُولٰئِکَ حَبِطَت اَعمَالُہُم فِ الدُّنےَا وَالآخِرَۃِ وَاُولٰئِکَ اَصحَابُ النَّارِ ہُم فِیہَا خَالِدُونَ) ،تم سے جو بھی اپنے دین سے پلٹ جائے (مرتد ہوجائے) اور حالت کفر میں چلا جائے ،تو اس کے اعمال دنیا و آخرت میں باطل ہوجائیں گے اور یہی لوگ دوزخی ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

نیک و بد اعمال کا رابطہ

ایمان و کفر کے مابین موجود رابطہ کی طرح نیک و بد امور کے درمیان بھی اسی طرح کا رابطہ فرض کیا جاسکتا ہے،لیکن بطور کلی اس طرح نہیں کہ ہمیشہ انسان کے نامۂ اعمال میں اس کے نیک کام ثبت ہوجائیں اور گذشتہ تمام برے اعمال اس سے مٹ جائیں (جیسا کہ بعض معتزلی متکلمین کا نظریہ ہے) یا یہ کہ ہمیشہ دونوں اعمال کو جمع کر کے جبری صورت میں گذشتہ اعمال کی مقدار و کیفیت کو دیکھتے ہوئے اسی کے مطابق ثبت کردیا جائے (جیسا کہ بعض دوسرے افراد کا نظریہ ہے) بلکہ اعمال کے متعلق تفصیل کا قائل ہونا پڑے گا یعنی اس طرح کہ بعض نیک اعمال اگر شایستہ طریقہ سے انجام دئے جائیں اور پیش خدا وہ امور قبول ہوں تو وہ برے

اعمال کے اثرات کوختم کر دیتے ہیں جیسے تو یہ اگر مطلوب اور بہتر طریقہ سے انجام پائے ،تو انسان کے گناہ بخش دئے جائیں گے(۲)

....

۱۔درس نمبر ۱٤ کی طرف رجوع کریں۔

۲۔رجوع کریں،نساء۱۱۰،آل عمران ۱۳۵،انعام ٥٤،شوریٰ ۲۵،زمر ٥۳،و........

اور یہ امر بالکل روشنی کی اس شعاع کی طرح ہے جو کسی خاص اور معین مقام پر پڑے اور اس جگہ کو روشن کر دے،لیکن ہر نیک عمل ہر گناہ کے اثر کو ختم نہیں کرتا،اور اسی لئے ممکن ہے ایک شخص مومن ایک مدت تک اپنے گناہوں کے عذاب میں مبتلا رہے اور آخر کار بہشت میں پہنچ جائے گویا کہ انسان کی روح کے مختلف ابعاد(پہلو) ہیں اور اعمالِ نیک یا بد میں سے ہر ایک صرف ایک پہلو سے مربوط ہوتا ہے مثلاً وہ نیک عمل جو،،الف،،کے جنبہ سے متعلق ہے وہ،،ب،،کے جنبہ سے متعلق گناہوں کو محو نہیں کریگا،مگر یہ عمل صالح اتنا زیادہ نورانی ہو کہ جو روح کے دوسرے جوانب سرایت کر جائے یا گناہ اتنی زیادہ آلودگی رکھتا ہو کہ تمام پہلوں و اطراف و جوانب کو آلودہ کر دے جیسا کہ روایات شریفہ میں وارد ہوا ہے کہ قبول شدہ نماز گناہوں کو دھودیتی ہے اور ان کے بخشش کا سبب بنتی ہے،اور قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ (وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرفَِ النَہَارِ وَزُلفاً مِنَ اللَّیلِ اِنَّ الحَسَنَاتِ یُذہبنَ السِّیاتِ)(۱) اے پیغمبر آپ دن کے دونوں اطراف میں اور رات گئے نماز قائم کریں اس لئے کہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دینے والی ہیں۔

اور بعض گناہ جیسے عاق والدین،شراب پینا ایسے ہیں کہ جو ایک مدت تک عبادت کو قبول ہونے میں مانع ہو جاتے ہیں، یا جیسے کسی کی مدد کرنے کے بعد احسان جتانا جو اس کام کے ثواب کو ختم کر دیتا ہے ، جیسا کہ قرآن میں موجود ہے(لاتُبطِلُوا صَدَقَاتِکُم بِالْمَنِّ وَالاَذَیٰ) (۲)اپنے احسانات اور صدقات کو احسان جتانے اور تکلیف پہچانے کے ذریعہ ضائع نہ کرو،لیکن نیک و بداعمال کے ایک دوسرے میں اثر انداز ہونا نیز اس کی نوعیت اقسام اور اس کی مقدار کو وحی خدا اور معصومین علیہم السّلام کے کلمات کے ذریعہ معین کرنا پڑے گا،اور ان سب کے لئے کسی کلی قانون کو معین نہیں کیا جاسکتا۔

....

۱۔ھود ۱۱٤،

۲۔بقرہ ٤ ۲٦٤،

اس درس کے اختتام پر مناسب ہے کہ اشارہ کیا جائے کہ نیک و بداعمال اس دنیا میں کبھی کبھی خوشحالی یا بدحالی، یا کسی نیک کام کی توفیق یا اس کے سلب ہو جانے میں اپنا اثر دکھاتے ہیں ،جیسا کہ دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا، بالخصوص والدین اور قرابت داروں کے ساتھ احسان کرنا،طول عمر اور آفات و بلاؤں کے دور ہونے کا سبب بنتا ہے،یا بزرگوں کی بے احترامی بالاخص معلم اور اساتذہ کی بے احترامی،توفیقات کے سلب ہو جانے کا باعث ہے،لیکن ان آثار کے مترتب ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے،کہ انسان کو پوری جزا یا سزا اسے مل چکی، بلکہ جزا اور سزا کی اصلی جگہ قیامت ہے۔

سوالات

۱۔حبط وتکفیر کے معنی بیان کریں؟

۲۔ایمان اور کفر کے درمیان کتنی طرح کے رابطے کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اور ان میں سے کون سا بہتر اور صحیح ہے؟

۳۔اعمال نیک اور بد کے رابطہ کو کیسے فرض کیا جا سکتا ہے؟ ان میں سے کون سیصورت صحیح ہے؟

٤۔آیا نیک و بداعمال کے دنیوی اثرات آخرت کی جزا یا سزا کا مقام لے سکتے ہیں؟ یا نہیں؟

اٹھاونواں درس

مومنین کے امتیازات

مقدمہ:

ثواب میں اضافہ

جو ذیل کی بحثوں پر مشتمل ہے

گناہان صغیرہ کی بخشش

دوسروں کے اعمال سے استفادہ

مقدمہ:

ہم خدا شناسی (۱) کے باب میں یہ جان چکے ہیں، کہ خدا کے ارادہ کا اصل تعلق نیکیوں اور کمالات سے ہوتا ہے، اور برائیوں اور نقائص کا تعلق ارادۂ الٰہی سے بالتبع ہوتا ہے اسی کو دیکھتے ہوئے انسان کے متعلق بھی خدا کا اصلی ارادہ اس کی ترقی وتکامل اور ابدی خوشبختی تک

رسائی اور وہاں کی ابدی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے سے تعلق رکھتا ہے اور تباہکاروں اور گنہگاروں کا عذاب اوراُن کی بدبختی جوان کے برے انتخاب کے نتیجہ میں انہیں حاصل ہوئی ہے بالتبع خدا کے حکیمانہ ارادے میں شامل ہے اوراگر عذاب واخروی بدبختی میں مبتلا ہونا خودانسان کے برے انتخاب کا نتیجہ نہ ہوتا،تو خدا کی بے پایان رحمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے، کہ اس کی ایک بھی مخلوق عذاب میں مبتلا نہ ہو(۲)

....

۱۔درس نمبر ۱۱ خداشناسی کی طرف رجوع کریں۔

۲۔ہم دعائے کمیل میں پڑھتے ہیں ،(فبا ليقين اقطع لولا ما حكمت به من تعذيب جاحد يك و قضيت به من اخلاد معاند يك لجعلت النار كلها برداً وسلاماً وما كانت لاحد فيها مقراً ولا مقاماً۔

لیکن یہ وہی خدا کی ہمہ گیر رحمت ہے کہ جس نے انسان کی آفرینش کا اقتضاءاس کے اختیارات وانتخاب کی خصوصیت قرار دیا،اورایمان وکفر دونوں راستوں میں سے ہرایک کے انتخاب اور اختیارات کالازمہ ایک اچھے یا برے انجام تک پہنچ جانا ہےاس فرق کے ساتھ کہ نیک انجام تک پہنچ جانا،خدا کے اصلی ارادہ سے متعلق ہےاور دردناک عاقبت تک پہنچ جانا خدا کے تبعی ارادہ سے متعلق ہے اور یہی فرق اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تکوین میں بھی اورتشریع میں بھی (یعنی خلقت میں بھی اور دستورالعمل میں بھی) نیکی کے پہلوکوترجیح دی جائے یعنی انسان فطری طور سے ایسا خلق کیا گیا ہے کہ نیک کام اس کی شخصیت کو بنانے میں گہرا اثر رکھیں اور تشریعی اعتبار سے مکلف کے لئے سہل وآسان ہوتا کہ سعادت کے راستہ کو طے کرنے اورابدی

عذاب سے نجات پانے میں سخت اور جان لیوا تکلیفوں کا سامنا نہ کرنا پڑے(۱)اور جزا وسزا کے موقع پر بھی اس کی جزا کے پلّے کو بھاری کر دیا جائے اور خدا کی رحمت اس کے غضب پر سبقت کر جائے (۲)اور خدا رحمت کا یہ تقدم و رجحان بعض امور میں مجسم ہو کر سامنے ظاہر ہو جاتا ہے کہ جس کے بعض نمونے ہمیہاں پر آپ کے سامنے ذکر کر رہے ہیں۔

ثواب میں اضافہ

خداوند عالم راہ سعادت کے طلبگاروں کے لئے مقام انعام میں سب سے پہلی جس جزا کا قائل ہوا ہے وہ یہ ہے کہ صرف عمل کے برابر ثواب اپنے بندوں کو نہیں دیتا، بلکہ اس کو بڑھا کے عطا کرتا ہے، یہ مفہوم قرآن مجید کی بعض آیتوں میں بالکل صاف بیان کیا گیا ہے، من جملہ سورہ نمل کی آیت نمبر(۸۹) میں ارشاد ہورہا ہے،(مَن جَاءَ بِالحَسَنَۃِ فَلَہُ خَیر مِنہَا) جو کوئی بھی نیکی انجام دے گا اس سے بہتر اس کی جزا پائے گا۔

....

۱۔ (یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر) بقرہ ۱۸۵، وما جعل علیکم فی الدین من حرج۔

حج ۷۸،

۲۔ سبقت رحمتہ غضبہ

اور سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر(۲۳) میں ارشاد ہے(وَمَن یَقتَرِف حَسَنَۃً نَزِدلَہُ فِیہَا حُسناً)، جو کوئی بھی نیک کام انجام دے گا ہم اس کی نیکی کو بڑھا دیں گے۔

اورسورۂ یونس کی آیت نمبر(۲۶) میں فرمارہا ہے(لِلَّذِینَ اَحسَنُو االحُسنیٰ و زِیَادۃ)، ان لوگوں کے لئے جنہوں نے نیکی کی ہے، نیکی بھی ہے اور اضافہ بھی ہے۔

اورسورۂ نساء کی آیت نمبر(٤٠) میں اس طرح آیا ہے کہ،

(اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظلِمُ مِثقَالَ ذَرَّۃٍ وَاِن تِلكَ حَسَنَۃً یُضَاعِفھَا وَیُؤتِ مِن لَدُنہُ اَجراً عظیماً)،

اللہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا انسان کے پاس نیکی ہوتی ہے تو اسے دوگنا کر دیتا ہے اور اپنے پاس سے اجر عظیم عطا کرتا ہے اورسورۂ انعام کی آیت نمبر(١٦٠) میں ارشاد الٰہی ہے:(مَن جَاءَ بِالحَسَنَۃِ فَلَہُ عَشرُ اَمثَالِہَا وَمَن جَاءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجزیٰ اِلَّا مِثلَہَا وَھُم لَا یُظلَمُونَ)، جو شخص بھی نیکی کرے گا، اسے دس گنا اجر ملے گا اور جو برائی کرے گا اسے صرف اتنی ہی سزا ملے گی اور کوئی ظلم نہ کیا جائے گا۔

گناہان صغیرہ کی بخشش

سعادت کی راہ پر چلنے والوں کیلئے ایک دوسرا امتیاز یہ ہے کہ اگر مومنین بڑے گناہوں سے پرہیز کرنے لگیں تو خدا اتنا مہربان ہے کہ وہ ان کے چھوٹے گناہ بھی معاف کر دیگا اور اس کے اثر کو محو کر دیگا، جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت نمبر(٣١) میں ارشاد ہو رہا ہے(اِن تَجتَنِبُوا کَبَائِرَ مَا تُنھَونَ عَنہُ نُکَفِّر عَنکُم سَیِّئَاتِکُم وَنُدخِلکُم مُدخَلاً کَرِیماً)، اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے کہ جن سے تمہیں روکا گیا ہے پرہیز کرلو گے تو ہم دوسرے گناہوں کی پردہ پوشی کر دیں گے اور

تمہیں باعزت منزل تک پہنچا دیں گے۔

واضح رہے کہ ایسے لوگوں کے چھوٹے گناہوں کو بخشے جانے کے لئے توبہ کی شرط نہیں ہے کیونکہ توبہ بڑے بڑے گناہوں (گناہ کبیرہ) کے بخشنے کا بھی سبب ہے۔

دوسروں کے اعمال سے استفادہ

مومنین کے لئے ایک دوسری برتری یہ ہے کہ خداوند عالم فرشتوں اور اپنے خاص چنے ہوئے بندوں کے استغفار کو ان مومنین کے حق میں قبول کرتا ہے، اور سارے مومنین کی دعاؤں اور استغفار کو ان کے حق میں قبول کرتا ہے، اور یہاں تک کہ ان اعمال کے ثواب جو دوسرے لوگ کسی مومن کے لئے ہدیہ کرتے ہیں اس کو بھی ان مومنین تک پہنچاتا ہے، یہ مطالب آیات اور روایات میں بہت کثرت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، لیکن چونکہ یہ موضوع شفاعت کے مسئلے سے بلا واسطہ رابطہ رکھتا ہے لہذا ہمیں چاہیے کہ قدر تفصیل سے اس موضوع پر روشنی ڈالیں اس لئے ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

سوالات

١۔رحمت الٰہی کے سبقت کرنے کا راز کیا ہے؟

٢۔تکوین وتشریع میں اس سبقت کے مجسم ظاہر ہونے کو بیان کریں؟

٣۔اس کے موارد کو انسان کی جزاوسزا میں وضاحت کے ساتھ بیان کریں؟

انسٹھواں درس

شفاعت

مقدمہ:

جوذیل کی بحثوں پر مشتمل ہے

شفاعت کا مفہوم

شفاعت کے اصول

مقدمہ:

من جملہ ان خصوصیات میں سے ایک ایسی خصوصیت کہ جس کو خداوند عالم نے مومنین سے مخصوص کردیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی مومن شخص مرتے دم تک اپنے ایمان کی حفاظت کرلے جائے اور ایسے گناہوں کا ارتکاب نہ کرے، جو اس کی توفیقات کے سلب ہوجانے کا باعث بنے اور اس کی عاقبت کی بدبختی شک وشبہ یا انکار جحود کی منزل تک پہنچادے، اور ایک جملہ میں یوں خلاصہ کردیا جائے کہ اگر ایمان کے ساتھ اس دنیا سے اٹھائے تو وہ ہرگز ابدی عذاب

میں مبتلا نہیں ہوگا اس لئے کہ اس کے چھوٹے گناہ، بڑے گناہوں سے پرہیز کرنے کی وجہ سے بخش دئے جائیں گے، اور اُس کے بڑے گناہ توبہ واستغفار کے وسیلہ سے معاف کر دئے جائیں گے، اور اگر اُسے ایسی توبہ کی توفیق حاصل نہ ہوسکی، تو دنیا کی مصیبتیں اور پریشانیاں اُس کے گناہوں کے بوجھ کو ہلکا کر دیں گی نیز برزخ اور قیامت کی ابتدائی سختیاں اس کے اعمال کے نقائص اور آلودگیوں کو دور کر دیں گی اور اگر اس کے باوجود اسکے گناہوں کی آلودگی پاک نہ ہوسکی تو شفاعت کے وسیلہ سے جو اولیاء خدا خصوصاً حضور سرور کائنات اور ان کے اہل بیت (ع) جو خدا کی وسیع وعظیم رحمت کی جلوہ نمائی کرتے ہیں، کے ذریعہ
جہنم کے عذاب سے نجات پا جائیں گے (۱) اور بے شمار روایات کی روشنی میں وہ مقام محمود (۲) جس کا وعدہ پیغمبر کو دیا گیا ہے وہ اسی مقام شفاعت کا نام ہے اور خود یہ آیہ شریفہ (وَ لَسَوفَ یُعطِیکَ رَبُّکَ فَتَرضَیٰ) (۳) اور تمھارا پروردگار تمھیں اتنا عطا کر دے گا کہ تم خوش ہوجاؤ گے حضور کی شفاعت کے ذریعہ الٰہی بخشش کی طرف اشارہ ہے جو مستحق افراد کے شامل حال ہوگی۔

اس بنا پر گنہگار مومنین کی سب سے بڑی اور آخری امید اور آسرا شفاعت ہے لیکن اس کے باوجود خدا کے عذاب سے امان کا یقین نہیں کر لینا چاہیے بلکہ ہمیشہ یہ خوف دل میں جاگتا رہے کہ خدانخواستہ اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوجائے جو مرتے دم تک کبھی بھی اس کی عاقبت کی بربادی یا ایمان کے سلب ہوجانے کا سبب بن جائے، اور خبردار کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کی محبت ان کے دلوں میں اس حد تک رسوخ کر جائے کہ (معاذ اللہ) وہ اللہ کی دشمنی کے ساتھ اس دنیا

سے رخصت ہو اس لئے وہ لوگ یہ دیکھ رہے ہیں کہ خدا ہے جو ان کے اور ان کی محبوب اور معشوق اشیاء کے درمیان موت کے ذریعہ جدائی ڈال دیتا ہے۔

شفاعت کا مفہوم

شفاعت، مادہ شفع سے لیا گیا ہے جو جوڑے کے معنی میں ہے اور عرف عام میں اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی باعزت انسان کسی بزرگ شخصیت سے کسی مجرم کی سزا سے چشم پوشی یا کسی خد مت گذار کی اجرت میں اضافہ کی درخواست کرے اور شاید ایسے مقامات پر لفظ شفاعت کو استعمال کرنے کا نکتہ یہ ہو کہ مجرم انسان خو بخو د بخشے جانے کا مستحق نہیں ہوتا، یا خدمت کار خود بہ خود اجرت

....

۱۔(ادّخرت شفاعتی لاھل الکبائر من امتی) میں نے اپنی شفاعت اپنے امت کے گنہگاروں کے لئے ذخیرہ کیا ہے، بحارالانوار ج ۸ ص ۳۷۔۴۰،

۲۔اسراء ۷۹،

۳۔ضحیٰ ۵

میں اضافہ کا استحقاق نہیں رکھتا لیکن سفارش کرنے والے (شفیع) کی درخواست کا منسلک ہو جانا اسے اس کا مستحق بنا دیتا ہے عام حالات میں کوئی کسی سفارش کرنے والے کی سفارش کو اس لئے قبول کرلیتا ہے وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ اگر اس کی سفارش کو قبول نہ کرے گا تو وہ

ناراض ہو جائے گا اور اس کا رنجیدہ خاطر ہونا اس کی الفت یا خدمت کی لذت سے محرومی کا سبب بنے گا، یا ممکن ہے کہ سفارش کرنے والے کی جانب سے نقصان پہنچنے کا باعث ہو وہ مشرکین جو اس دنیا کو پیدا کرنے والے خدا کے لئے انسانی اوصاف کے قائل تھے، جیسے شریک حیات، مونس و مددگار دوست ہم مشغلہ ساتھی کی محبت کی ضرورت یا اپنے رقیب اور اپنے برابر کی شخصیت سے خوف وغیرہ، وہ خدا کے لئے ان سب صفات کے اس لئے قائل تھے، کہ ان کی توبہ ان لوگوں کی طرف مبذول ہو جائے اور وہ اس کے غضب سے محفوظ رہیں، اور اسی لئے وہ لوگ بتوں اور مجسموں کے مقابلہ میں فرشتوں اور جناتوں کی پرستش کرتے تھے اور کہتے تھے۔ (ھٰؤُلاءِ شفعاؤنا عِندَ اللّہِ)(۱) یہ سب خدا کے نزدیک ہماری شفاعت کرنے والے ہیں اور کہتے تھے:

(مَا نَعبُدُھُم اِلَّا لِیُقَرِّبُونَا اِلَی اللّٰہِ زُلفَیٰ)(۲)

ہم ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں گے۔

اور قرآن مجید ان لوگوں کے جاہلانہ خیالات کو اس طرح باطل کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(لَیسَ لَہَا مِن دُونِ اللّہِ وَلِیٍّ وَلاَ شَفِیع)(۳) لیکن غور وفکر کا مقام ہے کہ ایسے شفاعت کرنے والوں اور ایسی شفاعت کی نفی کرنے کے معنی مطلقاً شفاعت کا انکار کرنا نہیں ہے، خود قرآن مجید میں آیات موجود ہیں جو شفاعت کو (خدا کی اجازت اور اس کے اذن سے ثابت کرتی ہیں)

....

۱۔ یونس ۱۸، روم ۱۳، انعام ۹٤، زمر ٤٤، وغیرہ

۲۔ زمر ۳

۳۔ انعام ۷۰، ۵۱، سجدہ ٤، زمر ٤٤،

(شفاعت باذن اللہ) اور وہ آیات شفاعت کرنے والوں اور جنکی شفاعت کی جائے گی ان کی شرائط کو بھی بیان کررہی ہیں اور خدا کی جانب سے اجازت یافتہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کا قبول ہونا، کسی خوف یا ضرورت کی وجہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا راستہ ہے جسے خداوند عالم نے ان لوگوں کے لئے کھولا ہے، جن کے اندر رحمت الٰہی، کی لیاقت کم پائی جاتی ہے اوراس کے واسطے کچھ شرطیں اور اصول قرار دیئے ہیں اور درحقیقت صحیح شفاعت پر عقیدہ، اور شرک آمیز شفاعت پر عقیدہ کے درمیان وہی فرق ہے جو فرق خدا کی جانب سے حاکمیت اور تدبیر، اور خود مختار حاکمیت وتدبیر کے درمیان میں ہے جو خدا شناسی کے باب میں بیان ہوچکی ہے(۱) کبھی کبھی شفاعت کا لفظ اس سے بھی زیادہ وسیع معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور انسان کے اندر دوسرے کے ذریعہ اچھا اثر ظاہر ہونے کو بھی شامل ہے جیسے ماں باپ اپنی اولاد کے متعلق یا اس کے برعکس اسی طرح معلم اور رہنما اپنے شاگردوں کے متعلق اور یہاں تک کہ موذن ان لوگوں کے متعلق جو اس کی آواز کو سن کر نماز کو یاد کرتے ہوئے مسجد کی طرف چل پڑتے ہیں شفاعت کریں گے اور درحقیقت ہر نیک اثر جو اس دنیا میں انجام دیا گیا ہے وہ شفاعت اور مدد کی شکل قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ گنہگاروں کی توبہ واستغفار اسی دنیا میں ان کے لئے ایک طرح کی شفاعت

ہے اور یہاں تک کہ دوسروں کے حق میں دعا کرنا اور خدا سے ان کی حاجتوں کو پورا ہونے کی درخواست کرنا درحقیقت خدا کے نزدیک شفاعت شمار کی جاتی ہے، کیونکہ یہ ساری چیزیں خدا کے نزدیک کسی انسان تک نیکی پہنچانے یا کسی سے شر کو دور کرنے لئے واستہ ہے۔

....

۳۔رجوع کریں، باب خداشناسی درس نمبر ۱٦،

شفاعت کے اصول

جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے کہ شفاعت کرنے یا شفاعت پانے کے لئے بنیادی شرط خدکی اجازت ہے، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۵، میں ارشاد ہوا ہے (مَن ذَاالَّذِی یَشفَعُ عِندَہُ اِلَّابِاِذنِہِ) کون ہے جو اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے، اور سورہ یونس کی آیت نمبر ۳ میں یوں ارشاد ہے (مَا مِن شَفِیعٍ اِلَّا مِن بَعدِ اِذنِہِ) کوئی سفارش نہیں کرسکتا مگر اس کی

اجازت کے بعد اور سورہ طٰہ کی آیت نمبر ۱۰۹ میں بھی ارشاد ہو رہا ہے:

(یَومَئِذٍلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا لِمَن اَذِنَ لَہُ الرَّحمٰنُ وَرَضِیَ لَہُ قَولاً)

اس دن کسی کی سفارش کام نہ آئے گی، سوائے ان کے جنھیں خدا نے اجازت دیدی ہو اور وہ ان کی بات سے راضی ہو اور سورہ سباء کی آیت نمبر ۲۳ میں فرماتا ہے:

(وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُ إِلَّا لِمَن أَذِنَ لَهُ)

اس کے نزدیک کسی کی سفارش کام نہ آئے گی مگر اس کی جس کو اجازت دی گئی ہو ان آیات سے اجمالی طور سے خدا کی اجازت ثابت ہوتی

ہے لیکن اجازت یافتہ افراد کی خصوصیت کا اندازہ نہیں ہوتا، لیکن دوسری آیات کے ذریعہ طرفین (شفاعت کرنے والے اور شفاعت پانے والے) کی شرطوں کو واضح کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سورہ زخرف کی آیت نمبر ۸۶ میں ہے:

(وَلا يَملِكُ الَّذِينَ يَدعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالحَقِّ وَ هُم يَعلَمُونَ)

اور وہ لوگ جو خدا کے علاوہ کسی اور کو آواز دیتے ہیں شفاعت کا حق نہیں رکھتے (اور کسی کو بھی شفاعت کا حق نہیں) مگر وہ جو حق کی گواہی دے اور علم بھی رکھتا ہو، شاید (مَن شَهِدَ بِالحَق) سے مراد اعمال کے اوپر گواہ فرشتے ہوں جو خدا کی تعلیم کے ذریعہ بندوں کے اعمال اور نیتوں سے واقف رہتے ہیں اور ان کی رفتار و کردار کی قدر و قیمت اور کیفیت پر شہادت دے سکتے ہیں، جیسا کہ حکم اور موضوع کے تناسب سے استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ سفارش کرنے والوں کے پاس اتنا علم ہونا چاہیے کہ جو شفاعت پانے والوں کی صلاحیت کی تشخیص دے سکیں۔

اور یقینی طور سے ان دونوں شرائط کے حامل وہ معصومین (ع) ہیں، دوسری طرف سے بعض آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ شفاعت پانے والے مرضی خدا کے حق دار ہوں جیسا کہ سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۲۸ میں ارشاد ہے:

(وَ لَا يَشفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارتَضىٰ)

سفارش نہیں کر سکتے مگر یہ کہ خدا اس کو پسند کرے اور سورہ نجم کی آیت نمبر ۲۶ میں ارشاد ہے:

(وَ کَم مِن مَلَكٍ فِي السَّموات لَا تُغنِ شَفَاعتُهُم شَيئًا اِلَّا مِن بَعدِ اَن يَأذَنَ اللهُ لِمَن يَشَاء وَيَرضیٰ)

اورآسمانوں میں کتنے ہی ایسے فرشتے ہیں جن کی سفارش کسی کے کام نہیں آسکتی، جب تک خدا جس کے بارے میں چاہےاور پسند نہ کرے اجازت نہ دیدے۔

صاف ظاہر ہے کہ رضائے پروردگار کی منزل میں ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس کے سارے اعمال پسندیدہ ہوں ورنہ شفاعت کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ خود شخص دین و ایمان کے لحاظ سے مرضی خدا کے مطابق ہو جیسا کہ روایات میں اسی عنوان سے تفسیر ہوئی ہے۔

دوسری طرف چند آیتوں میں ان لوگوں کی خصلت جن کی سفارش نہیں ہوسکتی بیان کی گئی ہے، جیسے سورہ شعراء کی آیت نمبر ۱۰۰ میں مشرکین کے قول کو نقل کر رہا ہے (فَمَا لَنَا مِن شَافِعِين) اورسورہ مدثر کی آیت نمبر ٤٠ سے ٤٨ تک آیا ہے کہ مجرموں کے دوزخ میں جانے کے سبب کے بارے میں سوال کیا جائے گا تو وہ لوگ جواب میں ترکِ نماز (۱) بیکسوں کی مدد نہ کرنے روز قیامت کے جھٹلانے کی خصلت کو گنوائیں گے اس کے بعد ارشاد ہے (فَمَا تَنفَعُهُم شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ) اس آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ وہ مشرکین اور قیامت کا انکار کرنے والے جو خدا کی عبادت نہیں کرتے اوراس کے محتاج بندوں کی مدد نہیں کرتے، اور صحیح اصول وقوانین کے پابند نہیں ہیں۔

....

۱۔امام صادق اپنی زندگی کے آخری لمحات میں فرمایا: (انّ شفاعتنا لاتنال مستخفا بالصلوٰۃ) ہماری شفاعت اس انسان تک نہیں پہنچ سکتی جو نماز کو ہلکا سمجھے۔بحارالانوار ج ٤ ص ۲

شفاعت ہرگز ان کے شامل حال نہیں ہوگی اور اس بات پر غور کرتے ہوئے کہ پیغمبر کا استغفار بھی اس دنیا میں ایک طرح کی شفاعت ہے اور ان کا استغفار ان لوگوں کے حق میں جو اس بات کے لئے حاضر نہیں ہیں، آپ سے استغفار و شفاعت کی درخواست کریں شامل نہیں ہو گا(۱) اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شفاعت کا انکار کرنے والا بھی شفاعت کا حق دار نہیں ہے جیسا کہ یہی مضمون احادیث میں ذکر ہوا ہے(۲)

حاصل کلام یہ ہے کہ مطلقاً اور اصلی سفارش کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی اجازت کے علاوہ خود بھی معصیت کار نہ ہو اور دوسروں کے گناہ اور اطاعت کے مراتب کو سمجھنے کی قدرت رکھتا ہو نیز سچے پیرو کار بھی ان کے زیر سایہ شفاعت کے کمترین مرتبہ کے مالک ہوتے ہیں، جیسا کہ ایسے افراد شہداء اور صدیقین کے زمرہ میں محشور کئے جائیں گے (۳) اور دوسری طرف صرف وہ لوگ شفاعت پانے کا حق رکھتے ہیں جو خدا کی اجازت کے علاوہ خدا و رسول اور قیامت اور وہ چیزیں جو خدا نے نبی پر نازل کی ہیں جیسے شفاعت کی حقانیت پر ایمان رکھنا، نیز اس اعتقاد پر آخر دم تک باقی رہنا ہے۔

....

۱۔منافقون ۵۔۶

۲۔ (عن النبیؐ مَن لم یؤمن بشفاعت فلا اناله الله شفاعت)

جو میری شفاعت پر ایمان نہیں رکھتا خدا میری شفاعت کو اس کے شامل حال نہیں کرے گا، بحارالانوار ج ۸ ص ۵۸،

۳ (والذین آمنوا باﷲ ورسولہ اولٰئک ھم الصدقون والشہد اءعندربھم)
جوخدااور رسول پر ایمان لائے خدا کے نزدیک وہی لوگ صدیقین اورشہداء ہیں،

سوالات:

۱۔شفاعت کے معنی اوراس کے استعمال کے موارد کو تفصیل سے بیان کریں؟
۲۔صحیح شفاعت اورشرک آمیز شفاعت کے درمیان فرق بیان کیجئے؟
۳ شفاعت کرنے ولے کے شرائط کی وضاحت کیجئے؟
٤۔شفاعت پانے والے کے شرائط کی وضاحت کیجئے؟

ساٹھواں درس

چند شبھات کا حل

شفاعت کا انکار کرنے والی آیتوں کا جائزہ۔

خدا پر شفاعت کرنے والوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

شفاعت کرنے والے خدا سے زیادہ مہربان نہیں ہیں۔

شفاعت خدا کی عدالت کے منافی نہیں ہے۔

شفاعت خدا کی سنت کی تبدیلی کا سبب نہیں۔

شفاعت کا وعدہ لوگوں کی گستاخی اور جسارت کا باعث نہیں۔

شفاعت کے استحقاق کے شرائط کا حاصل کرنا سعادت تک پہنچنے کی کوشش۔

شفاعت کے متعلق بہت سے اعتراضات اور شبہات ذکر کئے گئے ہیں کہ جن میں سے بعض اہم شبہات کا ذکر ہم اس درس میں کرنا چاہتے ہیں

شبہ (۱)

سب سے پہلا شبہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی متعدد آیتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں، کہ قیامت کے روز کسی کی شفاعت کو قبول نہ کیا جائے گا، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ٤٨ میں ارشاد ہورہا ہے

(وَاتَّقُوا يَوماً لَا تَجزِى نَفسٌ عَن نَفسٍ شيئاً وَ لَا يُقبَلُ مِنهَا شَفَاعَة وَ لَا يُؤخَذُ مِنهَا عَدلٌ وَلَا هُم يُنصَرُونَ)

اس دن سے ڈرو کہ جب کوئی کسی کے کام نہیں آئیگا اور نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ ہی کسی سے عوض اور بدلہ لیا جائے گا، اور نہ اس کی کوئی مدد کی جائے گی۔

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی آیات بے اصول اور استقلالی (خود مختار) شفاعتوں کی نفی میں ہے کہ بعض لوگ جس کا اعتقاد رکھتے ہیں، اس کے علاوہ مذکورہ آیات عام ہیں اور یہ ان آیات کے ذریعہ جو شفاعت کے قبول کئے جانے پر دلالت کرتی ہیں تخصیص پا گئی ہے جیسا کہ گذشتہ درس میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شبہ (٢)

شفاعت کے صحیح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم شفاعت کرنے والوں کے زیر اثر آ گیا ہے یعنی ان لوگوں کی شفاعت خدا کے بخش دیئے جانے کا سبب بن گئی جبکہ وہ خدا فعل

ہے

جواب:

شفاعت کے قبول ہونے کا معنی زیر اثر آنا نہیں (متاثر) ہے جیسا کہ دعا اور توبہ کا قبول ہونا ایسا غلط معنی نہیں رکھتا کیونکہ ان سارے مقامات پر بندوں کے کام رحمت الٰہی کے قبول کر نے کی آمادگی کا سبب اور ذریعہ ہیں اور اس اصطلاح (مقولے) کے لحاظ سے کہ قبول کرنے والے کی قابلیت شرط ہے نہ کہ انجام دینے والے کی فاعلیت۔

شبہ(۳)

شفاعت کالازمہ یہ ہے کہ شفاعت کرنے والے خدا سے بھی زیادہ مہربان ہو گئے ہیں، کیونکہ ہمارا فرض یہ ہے کہ اگر ان کی شفاعت نہ ہوئی تو گنہگار عذاب میں مبتلا ہوجاتا یا اس کا عذاب دائمی ہوجاتا۔

جواب:

شفاعت کرنے والوں کی ہمدردی یا مہربانی خدا کی بے پایاں رحمت کی ایک جھلک ہے یا یوں کہا جائے کہ شفاعت ایک ایسا راستہ ہے، جسے خود پروردگار عالم نے اپنے گنہگار بندوں کے لئے قرار دیا ہے اور حقیقت میں اس کی رحمت کے مجسم اور ظاہر ہونے کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے جو اس کے نیک اور منتخب بندوں کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے، اور اسی طرح توبہ اور دعا بھی دوسرے

وسیلے ہیں، کہ جنھیں خدا نے مرادوں کے پوری ہونے اور گناہوں کے بخشے جانے کے لئے قرا ردیا ہے۔

شبہ (٤)

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ اگر گنہگاروں کے عذاب کے متعلق خدا کا حکم اس کی عدالت کا تقاضا ہوتا تو ان لوگوں کے لئے شفاعت کا قبول کر لینا اس کی عدالت کے خلاف ہوگا۔

جواب:

جتنے بھی احکام الٰہی ہیں چاہے شفاعت سے پہلے عذاب کا حکم یا شفاعت کے بعد عذاب سے نجات کا حکم، اس کی عدل وحکمت کے مطابق ہے اور دونوں حکموں کے عادلانہ اور حکیمانہ ہونے میں دوضدوں کے جمع ہونے والی نسبت بھی نہیں ہے اس لئے کہ اس کا موضوع الگ ہے اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ عذاب کا حکم ارتکاب گناہ کا تقاضا ہے ان اسباب سے قطع نظر کہ جو گنہگار کے حق شفاعت کے قبول کا موجب ہے اور عذاب سے نجات کا مذکورہ حکم اسباب کے ظہور کا سبب ہے اور حکم کا بدلنا موضوع کی قید کے بدلنے کے تابع ہے، بہت فراوانی کے ساتھ جس کی مثال احکام اور تکوینی مقدرات اور تشریعی احکام وقوانین کے اندر مل جائیں گی اور اسی طرح اپنے اپنے زمانے کے اعتبار سے حکم منسوخ اور حکم ناسخ کے عادلانہ ہونے میں کوئی منافات نہیں ہے، نیز دعا اور صدقہ دینے سے مصیبتوں کے برطرف ہونے کے

حکیمانہ ہونے میں کوئی منافات نہیں ہے اور شفاعت کے بعد گناہوں کے بخشے جانے کا حکم، شفاعت کے تحقق سے پہلے عذاب کے حکم کے منافی نہیں ہے۔

شبہ(٥):

ایک اور اشکال یہ ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے شیطان کی پیروی کو دوزخ کے عذاب میں مبتلا ہونے کا سبب جانا ہے: جیسا کہ سورہ حجر کی آیت نمبر ٤٢، ٤٣ میں ارشاد فرماتا ہے

(اِنَّ عِبَا دِ لَیسَ لَکَ عَلَیہِم سُلطَان اِلَّا مَنِاتَّبَعَکَ مِنَ الغَاوِین۔ وَ اِنَّ جَھَنَّمَ لَمَوعِدُھُم اَجمَعِینَ)

بیشک تو (اے ابلیس!) میرے بندوں پر مسلط نہیں ہوسکتا، مگر وہ گمراہ لوگ جو تیری پیروی کریں اور ان کی ہمیشہ کی جگہ جہنم ہے۔

اور حقیقت میں گنہگاروں کو قیامت میں عذاب میں گرفتار کرنا، خدا کی سنت ہے اور ہم یہ بھی جا نتے ہیں سنت خدا، تغیر و تبدیلی نہیں ہوسکتی، جیسا کہ سورہ فاطر کی آیت نمبر ٤٣ میں فرماتا ہے

(فَلَن تَجِدَ لِسَنَّتِ اللہِ تَبدِیلًا وَلَن تَجِدَ لِسُنَّۃُ اللہِ تَحوِیلاً)

تم ہرگز سنت الٰہی میں تبدیلی نہیں پاؤ گے اور ہرگز سنت پروردگار میں تغیر نہیں پا سکتے لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ یہ سنت شفاعت کے ذریعہ ٹوٹ جائے؟

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ واجد الشرائط گنہگاروں کے بارے میں شفاعت کا قبول کرنا، خدا کی نا

قابل تبدیل سنتوں میں سے ایک ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ خداوند عالم کی سنت، حقیقی معیا راور ملاک کے تابع ہے اور کوئی بھی سنت جس کے سارے تقاضے، اور وجودی وعدمی شرائط پا ئے جائیں گے وہ تبدیلی کو قبول نہیں کرسکتی، لیکن وہ عبارتیں جو اس سنت پر دلالت کرتی ہیں وہ پوری طرح سے موضوع اور اس کے تمام شرائط و قیود کو بیان نہیں کر رہی ہیں، اس رو سے ایسے موراد پائے جاتے ہیں کہ جہاں ظاہری طور سے آیات چند مختلف سنتوں کو شامل ہے جب کہ حقیقت میں آیت کا مصداق

اخص اور اقوی ملاک کا تابع ہے لہٰذا ہر سنت اپنے موضوع کی واقعی قیود و شرائط کو دیکھتے ہو ئے (نہ صرف وہ قیدیں اور شرطیں جو عبارت میں ائیں ہیں) ثابت اور غیر قابل تغیر ہے انھیں میں سے ایک سنت کا نام شفاعت ہے جو خاص گنہگاروں کے لئے جن کے اندر معین شرائط پائے جاتے ہوں اور معین اصول وقوانین ان کے شامل حال ہے ثابت اور نا قابل تبدیل ہے۔

شبہ(٦)

شفاعت کا وعدہ، لوگوں کو گناہ کے مرتکب ہونے اور بے راہ روی میں گستاخ اور جری بنا دیتا ہے۔

جواب:

اس اعتراض کا جواب توبہ قبول ہونے اور گناہوں کے ختم ہوجانے کے سلسلے میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ شفاعت اور مغفرت کا شامل حال ہونا، کچھ شرائط کے اوپر موقوف ہے کہ

گنہگار انسان ان شرائط کے حصول کا یقین نہیں حاصل کر سکتا اور شفاعت پانے کے من جملہ شرائط یہ ہیں کہ انسان اپنے ایمان کو تا دم مرگ بچا لے جائے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ کوئی بھی انسان ایسی شرط کے پورے ہونے کا یقین نہیں کر سکتا دوسری طرف سے اگر کوئی انسان کسی گناہ کا مرتکب ہو گیا اور اسے اپنے اس گناہ کی بخشش کی کوئی امید ہو تو وہ مایوسی اور ناامیدی میں گرفتار ہو جائیگا اور مایوسی اس کے اندر گناہ کو ترک کرنے کے حوصلہ کو ضعیف کر دے گی نیز اسے آئندہ اسی غلط راستے پر چلنے کی ترغیب دلا دے گی اسی لئے الٰہی مربی کی روشن تربیت یہ ہے کہ ہمیشہ لوگوں کو خوف اور امید کے درمیان ور کے رکھے یعنی رحمت الٰہی اتنا امیدوار نہ بناد ے کہ خدا کے یہاں سے اطمینان حاصل کر لیں، اور عذاب الٰہی سے بھی اتنا نہ ڈرا دے کہ رحمت خدا سے مایوس ہو جائیں اور ہم یہ جانتے ہیں یہ دونوں چیزیں گناہان کبیرہ ہیں۔

شبہ(۷):

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ عذاب سے نجات پانے میں شفاعت کی تاثیر کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کا کام (شفاعت کرنے والے) سعادت تک پہچانے اور بدبختی سے نجات پانے میں اثر رکھتا ہے درآں حالیکہ اس آیہ شریفہ کے لحاظ سے (وَاَن لَیس لِلِا نسَانِ اِلَّا مَا سَعیٰ) صرف شخص کی اپنی کوشش ہے جو اسے سعادت تک پہنچاتی ہے۔

جواب:

انسان کی سعی اور کوشش منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کبھی تو بطور مستقیم ہوئی ہے، اور یہ کوشش

راستہ کے آخری حصہ تک جاری رہتی ہے اور کبھی غیر مستقیم ہے جو مقدمات اور واسطوں کو فراہم کر نے کے ذریعہ ہوتی ہے، شفاعت پانے والا شخص بھی سعادت تک پہنچنے کے مقدمات اور واسطوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے کہ ایمان لانا اور شفاعت کے استحقاق کے شرائط کا حاصل کرنا، سعادت تک پہنچنے کی راہ میں سعی وکوشش شمار کی جاتی ہے، چاہے یہ کوشش نا قص ہی کیوں نہ ہو، اسی لئے کچھ مدت تک برزخ کی مصیبتوں اور پریشانیوں اور عرصہ قیامت کی ابتدائی سختیوں میں گرفتار ہونا پڑتا ہے لیکن بہرحال خود اس نے سعادت کی جڑ یعنی ایمان کو اپنے دل کے اندر مضبوط کرتے ہوئے اس کو نیک اعمال کے ذریعہ اس طرح آبیاری کرتا رہتا ہے کہ زندگی کے آخری لمحات تک خشک نہ ہونے پائے لہٰذا اس کی آخری سعادت خود اسی کی سعی وکوشش کا نتیجہ ہے اگرچہ شفاعت کرنے والے بھی اس درخت کے بار آور ہونے میں اثر رکھتے ہیں، جس طرح دنیا میں بھی بعض دوسرے افراد انسانوں کی ہدایت اور ان کی تربیت میں موثر ہیں، اور ان کی تاثیر خود شخص کی سعی وکوشش کی نفی کے معنی میں نہیں ہے۔

سوالات:

١۔شفاعت کی نفی کے اوپر دلالت کرنے والی آیتوں کے ہوتے ہوئے،شفاعت کے متحقق ہونے کا کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے؟

٢۔آیا شفاعت کالازمہ امور خداوند عالم میں دوسروں کا اثر انداز ہونا نہیں ہے؟

٣۔کیا شفاعت کالازمہ یہ نہیں ہے کہ دایہ، ماں سے زیادہ مہربان ہو؟

٤۔شفاعت کا عدالت خدا سے کیا رابطہ ہے وضاحت کیجئے؟

٥۔کیا شفاعت خدا کی سنت کی تبدیلی کا باعث نہیں ہے؟

٦ کیا شفاعت کا وعدہ گنہگاروں کی گستاخی اور جسور ہونے کا سبب نہیں ہے؟

٧۔وضاحت کیجئے کہ شفاعت،انسان سعادت کے لئے خود انسان کی سعی وکوشش کے منافی نہیں ہے؟

☆☆☆☆☆